حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ
مترجمین
محمد اشفاق خان، سید فضیل ہاشمی

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ

جلد دویم

المیہ مشرقی پاکستان کے سیاسی اور فوجی اسباب

ترجمہ، ترتیب و تہذیب

سید فضیل ہاشمی، محمد اشفاق خان

دارالشعور

37۔ مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور

فہرست مضامین

اسلامی تاریخ کا بدترین المیہ

شاعر مشرق نے کہا ہے:

قدرت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

ہماری بدقسمتی کہ ہم بحیثیت قوم اس عمل سے کبھی نہ گزرے۔ نہ ہم نے کبھی نجات کی ضرورت سمجھی اور نہ ان لوگوں کو عبرتناک سزائیں دیں جن کی مہربانی سے ملک بحرانوں کی زد میں رہا اور آخر کار دو ٹکڑے ہو گیا۔ لوگوں کو عام طور پر نہ تو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے اور نہ ہی اپنے حقوق سے آگاہ ہیں جو بطور شہری ان کے ہیں۔ سیاسی لوگوں کا وطیرہ یہ رہا اور بدقسمتی سے ابھی تک ہے کہ بلا مقصد بیان بازی کرتے ہیں برسر اقتدار گروہ پر الزام لگاتے ہیں اور جب خود برسر اقتدار آتے ہیں تو وہی حرکتیں کرتے ہیں جن کا الزام دوسروں پر لگاتے رہے۔ ہر بار جب وہ برسر اقتدار آتے ہیں تو اپنے وعدے پورے کرنے کے بجائے بہانے تراشنے' لوگوں کو جھوٹی تسلیوں سے بہلانے اور اپنے پیشرو گروہ کو غلط کاموں کا مجرم قرار دینے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ ایک لطیفہ پیش خدمت ہے۔ ایک بزرگ عرصے تک وزیر مہاجرین رہے۔ کسی محلاتی سازش میں ان کی وزارت چلی گئی تو دو تین دن بعد ہی جلسہ کیا اور کہا یہ کیسی حکومت ہے جو اب تک مہاجرین کو آباد نہیں کر سکی۔

خلاصہ یہ کہ اس سیاسی یا غیر سیاسی گروہ سے توقع رکھنا کہ حقائق کا سامنا کرے گا' اپنی غلطیوں کا اعتراف کرے گا اور اصلاح کا عزم کرے گا اور اپنے عمل سے اپنے قول کو ثابت کرے گا خواب و خیال کی دنیا میں رہنا ہے۔ بھٹو صاحب اور ان کی حکومت اور حکومت سے بڑھ کر طرز حکومت اور ان کی پارٹی پر جتنی چاہے تنقید کی جائے درست ہو گی لیکن ان کے اچھے کاموں کی بھی تعریف کرنی چاہئے۔ ان میں سے ایک اچھا کام حمود الرحمٰن کمیشن کی تشکیل تھا۔ اس کا مقصد سقوط ڈھاکہ کے اسباب کا پتہ چلانا اس کے ذمے دار اصحاب کی نشان دہی اور سفارشات پیش کرنا تھا تاکہ آئندہ ایسی غلطیاں نہ ہوں کمیشن کی رپورٹ میں برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر قیام

پاکستان تک کے حالات کا مختصر جائزہ موجود ہے۔ اس کے بعد کمیشن نے قدرے تفصیل سے اگست 1947ء (یوم آزادی) سے لے کر مارچ 1969ء تک کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس عرصے میں جو اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی اس کا بلا کم وکاست تذکرہ کیا ہے' حکومتوں کا آنا اور چلا جانا' سیاسی لوگوں کی قلابازیاں اور خودغرضیاں اور بیوروکریسی کی عیاریاں بیان کی ہیں۔ یہاں تک کہ پورے ملک کو اکتوبر 1958ء میں ایک طاقتور جھٹکا لگتا ہے اور مارشل لاء کے سیلاب میں ساری سیاست بہہ جاتی ہے۔ اس کے بعد 1962ء میں نیا آئین نافذ ہوا۔ جمہوریت کی جگہ بنیادی جمہوریت آ گئی اور کہا گیا کہ ''یہ گھاس کی جڑوں والی'' جمہوریت ہے مگر بدقسمتی کہ وہ جمہوریت بھی ملک کو راس نہ آئی اور ایک زوردار تحریک نے ایوب خان کے اقتدار اور ان کی بنیادی جمہوریت کا صفایا کر دیا۔ اس کے بجائے کہ ایوب خاں اپنے بنائے ہوئے آئین پر عمل کرتے انہوں نے اقتدار کمانڈر انچیف کے حوالے کر دیا...... لیکن اس بار صورت حال 1958ء سے مختلف تھی۔ وہ سیاسی عناصر جنہیں اب تک مشرقی پاکستان میں دبا کر رکھا گیا تھا علاقائی نعروں کے سہارے ذہنوں پر چھا چکے تھے۔ انہوں نے اصلی اور فرضی زیادتیوں کا شور مچا کر لوگوں کی قوت فکر کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس وقت پاکستان کا اقتدار جاگیرداروں (فیوڈلز) بیوروکریسی اور بڑے تاجروں (بگ بزنس) کے ہاتھ میں تھا۔ 1969ء کا مارشل لاء اس کی سب سے بڑی آزمائش ثابت ہوا اور اس میں یہ گروہ بری طرح ناکام اور رسوا ہوا اگر اسے ملک کا مفاد ہی عزیز ہوتا تو وہ کبھی اس قسم کی احمقانہ حرکتیں نہ کرتا جن سے آج ہماری قومی تاریخ کے صفحات داغ دار ہیں یہ ہوش وخرد سے بے گانہ لوگ اقتدار اور مالی مفادات پر حسب سابق مکمل اجارے داری چاہتے تھے اور کسی کو اس میں شریک کرنے پر تیار نہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے ملک کے دو ٹکڑے ہونا گوارہ کیا مگر مجیب' اس کی جماعت عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے دیگر بااثر سیاسی عناصر سے سمجھوتہ پسند نہ کیا۔ یہ دونوں باتیں کمیشن کی رپورٹ میں موجود ہیں یعنی اکثریتی پارٹی کو اقتدار سونپنے سے گریز اور دوسرے عوامی لیگ کے چھ نکات میں سے چھٹے پر شدید اختلاف۔ چھٹا نکتہ یہ تھا کہ صرف صوبوں کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہوگا اور وہی مرکز کو مقررہ رقم دیں گے۔ حکمران گروہ کا غیر مصالحانہ رویہ ظاہر ہونے تک عوامی لیگ چھ نکات پر سودے بازی کے لئے تیار تھی۔ اس حکمران گروہ نے اسلحہ کے زور پر اپنا تسلط مشرقی پاکستان پر قائم رکھنا چاہا مگر منہ کی کھائی۔ بنگالی نیشنلزم کا پودا جس کی طویل عرصے سے آبیاری کی جا رہی تھی اس وقت تک بڑھ کر تناور درخت بن چکا تھا دوسری طرف بھارت جیسا عیار

دشمن تاک میں تھا۔ کمیشن کی رپورٹ میں مستند سرکاری ریکارڈ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ مارچ 1969ء سے لے کر مارچ 1971ء اور اس کے بعد دسمبر 1971ء تک جب اقتدار بھٹو صاحب کے حوالے کیا گیا واقعات پیش آئے۔ کس سیاست دان کا کیا کردار تھا اور جن حضرات کے پاس اقتدار تھا ان کا طرز عمل کیا رہا؟

بہرحال اس بحران کا سب سے زیادہ فائدہ بھارت نے اٹھایا اور حسب توقع مشرقی پاکستان پر پوری قوت سے حملہ آور ہوا۔ پاکستان کا حکمران گروہ فوری جوابی کارروائی کے بجائے اسے دھمکیاں ہی دیتا رہا آخرکار جب بڑی بے دلی سے مغربی پاکستان سے بھارت کے خلاف کئی دن کی تاخیر کے بعد محاذ کھولا گیا تو دو تین محاذوں کو چھوڑ کر پاک فوج کو ہر محاذ پر ناکامی ہوئی اور بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اور سب سے حیران کن اور افسوسناک بات یہ ہے کہ سلامتی کونسل میں جنگ بندی' مشرقی پاکستان سے بھارتی فوج کے انخلاء اور سیاسی تصفیے کے لیے جتنی بھی قراردادیں آئیں حکومت پاکستان انہیں مسترد کرتی رہی صرف اس لئے کہ ان میں ''سیاسی تصفیے'' کی شق شامل تھی۔ انتہا یہ کہ اسی ''سیاسی تصفیے'' کی دہشت کے باعث بھارتی جارحیت کے باوجود پاکستان نے سلامتی کونسل سے رجوع نہ کیا محض اس لئے کہ وہ سیاسی تصفیے کا مطالبہ کرے گی کمیشن نے بجا طور پر سوال کیا ہے کہ اگر سیاسی تصفیہ مقصود نہ تھا تو (مارچ میں) فوجی کارروائی کی کیا ضرورت تھی اور یحییٰ خاں اور ان کے مشیر اس طرح اسلحہ کے بل پر کب تک مشرقی پاکستان کو کنٹرول کر سکتے تھے؟ اگر واقعات سے قاری یہ نتیجہ نکالتا ہے تو کیا وہ غلط ہوگا کہ اس وقت کا حکمران گروہ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس مقصد کے لئے اس نے نہایت بھونڈا اور وحشیانہ طریقہ اختیار کیا۔ پہلے اس نے اپنے ہم وطنوں کو اسلحہ کی طاقت سے کچلنا چاہا جو صرف اپنا حق مانگتے تھے اور اس کے بعد اس نے جنگ کا ڈرامہ رچایا' ''ادھر ہم ادھر تم'' کا نعرہ آخرکار حقیقت بن گیا مگر اس کی بڑی بھاری قیمت دینی پڑی اور شائد مستقبل کا مورخ ہی اس کا ادراک کر سکے گا۔

حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ پر کارروائی نہیں ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ رپورٹ ہمارے قومی کردار پر بے لاگ تبصرہ اور آنے والی نسلوں کے لئے سبق ہے بشرطیکہ قاری سیکھے۔ حکومتوں نے اسے شائع تک نہ کیا شاید اس لیے کہ ان میں حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ موجودہ حکومت لائق تعریف ہے کہ اس نے یہ رپورٹ شائع کرا دی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تنقید اور نکتہ چینی برداشت کر سکتی ہے۔ دوم یہ کہ 1971ء کے بحران میں مغربی پاکستان کے بعض

سیاست دانوں نے جن میں اصغر خاں، مولانا نورانی اور خان عبدالولی خاں نمایاں ہیں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی کھل کر مخالفت کی اور اقتدار اکثریتی جماعت عوامی لیگ کے حوالے کرنے کا پرزور مطالبہ بار بار کیا۔ جنرل یعقوب جو مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور ایڈمرل احسن جو وہاں مارچ 1971ء میں گورنر تھے بھی یہی مطالبہ کرتے رہے اور اپنے عہدوں سے اسی کی پاداش میں معزول کئے گئے سیاسی اختلافات سے قطع نظران سب اصحاب کی دیانت داری، جمہوریت اور حقیقت پسندی کی تعریف ہونی چاہئے۔

ہماری دعا ہے کہ اب ہمارا ملک اس قسم کے بحران سے دوچار نہ ہو اور موجودہ حکمران طبقہ اس قسم کی کوتاہ اندیشی سے کام نہ لے اور اس قسم کے احمقانہ تصورات میں نہ کھو یا رہے جن کا ذکر تفصیل سے رپورٹ میں موجود ہے۔ نشیب و فراز ہر قوم کی راہ میں آتے ہیں مگر کامیاب وہی قومیں ہوتی ہیں جو ان کو خاطر میں لائے بغیر منزل مقصود کی طرف گامزن رہتی ہیں۔

فضیل ہاشمی

ماڈل ٹاؤن۔ 2 اپریل 2002ء

”یہ لوگ ہمارے نہ تھے“

ہمارے ہاں اقتدار میں رہنے والے لوگوں کی خوش قسمتی کہ پاکستان بننے کے بعد انہیں ہزاروں لاکھوں اقتدار کی خالی کرسیاں حاصل ہوگئیں۔ لیکن ہماری اور ملک کی بدقسمتی یہ کہ ہمیں آزاد و خود مختار ملک نہیں ملا۔

جب آزادی اختیار کے بغیر کسی ملک کا اقتدار کسی گروہ یا قوم کو ملتا ہے تو وہ ہو بہو ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ہمارے ملک کا ہے۔

آج صدی کا نصف سے زائد بیت گیا ہمارے ہاں حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں لوگ آتے جاتے رہے کبھی سیاستدان اور کبھی فوجی جنرل اور ان کی حکومتیں، کبھی فوج اور سیاسی جماعتوں یا غیر جماعتی کے نام پر سیاستدانوں کی مخلوط اور کبھی متحدہ محاذوں کی حکومتیں بنائی اور گرائی جاتی رہیں، حکومتوں کے ادلنے بدلنے کا ایک ہی ”جان شکن“ کام ہے جو دن رات نہایت ”جانفروشی، بردباری اور تسلسل“ کے ساتھ ملک میں ہوتا رہا۔ اس سارے عمل میں کبھی ”عوامی نما تحریکوں“ کو دبانے اور ان کی طرف سے ”قتل و غارت گری“ اور ملک میں ”وسیع بدامنی کے خدشے“ کے پیش نظر، فوج بار بار اقتدار کی کرسی پر آتی رہی اور ملک کو ”شرپسندی“ سے بچاتی رہی، یہ الگ بات ہے کہ ملک اس ساری کوشش کے باوجود ٹوٹ گیا، یعنی محبت گولیوں سے بوئی جاتی رہی، بنگال یا ملک کے دوسرے صوبوں کے بڑے بڑے شہر کراچی، ملتان، لاہور اور پشاور، ان میں فوج اور پولیس شرپسندوں کو مارتی دھاڑتی رہی اور ہر قیمت پر امن بحال کراتی رہی۔

ایسا ہی ایک المناک وقت ملک پر آیا جب جنرل یحیٰی نے ملک میں 1970ء کے عام انتخابات کرانے کے بعد ”ناپسندیدہ اور غیر متوقع نتائج“ کے پیش نظر اس وقت کی منتخب اسمبلی کا اجلاس بلانے اور اقتدار منتخب نمائندوں کو سپرد کرنے کی بجائے ڈھاکہ میں فوج بھیج دی، اور ”شرپسندوں اور ملک دشمنوں“ کا صفایا کرنے کی ٹھانی، تو عوامی شاعر مرحوم حبیب جالب نے

ایک نظم کہی ''عوامی فکری محاذ'' اس وقت کی ایک فکری تنظیم کے ہفتہ وار اجلاس میں یہ نظم پڑھی گئی جو ان دنوں ایک طلبا تنظیم جمعیۃ طلبائے اسلام (JTI) جس کی تربیت و تعلیم حضرت رائے پوریؒ سلسلے کے سرخیل مولانا سعید احمد رائے پوری کرتے تھے اور جس کا اجلاس اس دن جب جنرل یحیٰ نے مارشل لا کا اعلان کیا۔ طلبا تنظیم کے دفتر واقعہ میکلوڈ روڈ میں منعقد ہوا تھا۔

نظم یوں ہے:

''محبت گولیوں سے بو رہے ہو   وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو''

غرض ہر بار فوج نے جب بھی ملک کی عنان اقتدار سنبھالی تو اس کا یہی کہنا تھا کہ فوج امن و امان قائم کر کے ملک میں جمہوریت بحال کر دے گی اور ملک کو ترقی و خوشحالی کے راستے پر گامزن کر کے واپس بیرکوں میں چلی جائے گی' یہ دعوے اور وعدے بار بار کئے جاتے رہے لیکن دس دس سال یا اس سے بھی زائد اقتدار میں گزر جاتے رہے اس طرح فوج اور سیاستدانوں کو نظام بدلنے' نئے طور طریق اپنانے اور نئے زمانے کے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کی فرصت ہی نہ مل سکی' چنانچہ ہمارے ہاں سیاسی' معاشی اور اقتصادی نظام بدلا نہ معاشرہ بدلا اور نہ سماج میں آزادی کے خوشبودار پھول کھلے بلکہ پچاس سال کے دن رات اور صبح شام کے اس کھڑے پانی میں ایک صدی کی غلامی کا تعفن پھوٹ پڑا اور چاروں طرف سے صدائیں آنے لگیں ''ہم غلام ہیں' ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' ہم امریکہ کے غلام ہیں' ہم مقروض ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔

ایسا اس لئے ہوا کہ جب برطانوی استبداد و سامراج نے تاریخی حالات کے پیش نظر برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی تحریک کے سامنے گھٹنے ٹیکے اور مجبوراً برصغیر سے جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے بڑی چابکدستی سے اقتدار کی کرسی خالی کر دی ہندو اور سکھ بھی ملک سے چلے گئے اور اس پر ہمارے لوگوں کو بٹھلا دیا گیا ''گورے'' کی جگہ یہ ''کالے'' صاحب آئے تو بظاہر ہمارے تھے یا ہم میں سے تھے مگر'' یہ لوگ ہمارے نہ تھے'' آزادی کا ایک منظر سامنے آ گیا یہ آزادی نہ تھی مگر یہ لوگ اوپر سے کالے تھے اور اندر سے گورے تھے' انہیں اسی لئے کرسی اقتدار پر ''بلا کھٹکے'' بٹھلا دیا گیا۔

معا بانی پاکستان حضرت محمد علی جناح کو ادراک ہوا لیکن یہ بعد از وقت ہی تھا وہ بے ساختہ چونک پڑے اور بول اٹھے ''میری جیب کے سارے سکے کھوٹے تھے'' مگر اب کیا! تاریخ کی گاڑی اگلے پلیٹ فارم پر پہنچ چکی تھی سارے کھوٹے سکے گاڑی میں چڑھ گئے تھے اور اقتدار کی خالی کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اقتدار اول دن سے بیوروکریسی یعنی افسر شاہی کے ہاتھ میں رہا ہے۔ یہ جاگیرداروں اور نو دولتیوں کو ایک جونیئر پارٹنر کی حیثیت سے اقتدار میں ساتھ ملاتی رہی ہے یہ بیوروکریٹس وہ ہیں جو اگرچہ ہیں تو ہم میں سے' مگر اندر سے یہ انگریز یا گورے ہیں ان کا طرز فکر اور طرز عمل وہی پرانا انگریز کا سا ہے۔

ایسے اقتدار کو نو آبادیاتی یا کالونیل اقتدار کہتے ہیں' ہم سرمایہ دار دنیا اور عالمی مالیاتی اداروں کے مقروض ہیں' ہمارے اقتدار کی اصل باگ ڈور امریکی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اب تو یہ بات کوئی راز نہیں رہی کہ ہمارے چھوٹے اور بڑے فسروں کے تقرر اور تبادلے تک امریکی افسروں کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ پچاس پچپن برس سے آپ ایک ہی منظر دیکھتے آ رہے ہیں' وہی جو ہمارے ہاں اقتدار میں آتا ہے' پچھلے برسر اقتدار لوگوں میں کیڑے نکالتا ہے پھر سال دو سال اقتدار میں رہنے کے بعد انہی ''کیڑے پڑے' گلے' سڑے' گندے اور بدعنوان'' لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیتا اور راہ و رسم بڑھاتا ہے اور یہ سب کچھ وہ کرتا ہے جو فوجی جنرل بھی ہوتا ہے۔ آپ فیلڈ مارشل جنرل ایوب سے موجودہ جنرل پرویز مشرف تک آ جایئے یہی کہانی بار بار دہرائی جاتی نظر آئے گی۔

سیاستدانوں اور مقتدر رہنے والے لوگوں میں سب ''قرضے لینے اور قرضے اتارنے'' کے چکر اور گورکھ دھندے کے ماہر ہیں ایک سے بڑھ کر ایک آ رہا ہے میں ملک کا قرضہ اتاروں گا اور کشکول توڑ ڈالوں گا مگر وہ قرضہ بڑھتا چلا جاتا ہے قوم کا عام آدمی سود کی ادائیگی کرتے کرتے زبوں حالی کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے کوئی نہیں آیا کہ یہ قرضہ ہم اب ادا نہیں کریں گے۔ اس قرضے

کی حقیقت انہیں سب کو پتہ ہے کہ یہ قرضہ جو قوم اور ملک کے سر پر چڑھا اور دھرا ہے عوام اور ملک کے تو 5 فیصد بھی پلے نہ پڑا مگر کسی سیاستدان یا فوجی جنرل میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ اس قرضے کے ناروا بوجھ کو اتارنے سے انکار کردے۔ اب تک ہمارا ملک امریکی مفادات اور سیاست پر قربان ہوتا چلا آرہا ہے۔ مگر کسی میں ہمت نہیں کہ اس قوم فروشی کے خلاف کھڑا ہو جائے اور اپنی ان ''عظیم خدمات اور قربانیوں'' کا صلہ مانگ لے۔

بڑے بڑے اچھے لوگ اقتدار میں آتے ہیں بڑے اچھے اچھے نعرے اور وعدے کرتے ہیں مگر 'ڈھاک کے وہی تین پات' آخر میں وہ اس 'نمک کی کان میں نمک' بن جاتے ہیں ملک میں اقتدار میں آنے والے خواہ الیکشن کے ذریعے یا سلیکشن کے ذریعے فوجی حکومت میں اقتدار میں آگئے ہیں سال دو سال یا دس گیارہ سال بھی اقتدار میں گذارنے کے بعد ذلیل و رسوا ہو کر اپنا پورا خاندان تباہ کرا لیتے ہیں کوئی نیک نامی نہیں پاتے' جو اقتدار میں آتا ہے اترنے یا استعفیٰ دینے کا نام نہیں لیتا۔ اقتدار میں آکر اپنی ذات اپنے گروہ یا اپنی برادری کا پیٹ بھرتا ہے۔ ذاتی ترقی کرتا ہے' کیونکہ یہ ذاتی ترقی کا نظام ہے قومی ترقی کا نظام نہیں ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی تحقیقات اور اس کی رپورٹ میں جسے ایک ممتاز طباعتی ادارہ ''دارالشعور'' شائع کر رہا ہے اور جس کی تلخیص اور تدوین و ترتیب سے ہم قارئین کے لئے تاریخ کا ''منہ بولتا مواد'' پیش کر رہے ہیں'' جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کے مصداق 'یہ اعتراف گناہ' اور 'اقبال جرم' کی المناک داستان عبرت ہے۔ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اسے پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ ہم پر مقتدر رہنے والے لوگ اگر ہمارے ہوتے تو وہ کچھ نہ کرتے جو انہوں نے بنگال یعنی اس وقت کے مشرقی پاکستان میں کیا اور بعد ازاں اور قبل ازیں پاکستان میں کرتے چلے آرہے ہیں۔ عوام دوستی' عوام کا احترام اور مقام انسانیت ان کی سرشت میں سرے سے ہے ہی نہیں یہ گماشتہ کردار اور 'کٹھ پتلی تماشا' ہے دل و دماغ درد و سوز سے خالی اور یہ تو آلۂ قتل ہے جس کا کام کاٹنا اور مارنا ہے۔ بہر حال بڑے بڑے جرنیلوں نے اپنی 'بہادری' اور 'بے دردی' اپنی 'حماقت'

اور 'شوریدہ سری' کا خود اعتراف کیا ہے اور خوب کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک دن خود ان کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے کہ یہ کیا کرتے رہے''۔

پھر الم در الم! قوم اور ملک کے قاتل 'اعتراف و اقبال' کے باوجود بغیر کسی سزا و زجر کے آج بھی ہماری بستیوں میں ایسے بس اور پل بڑھ رہے ہیں جیسے قبرستان میں جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر پھلتے پھولتے ہیں۔ بہر حال یہ ہمارا 'داخلی' معاملہ ہمارے عوام اور ہم فریب کھا کے دعا دیتے ہیں اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے' ہمیں تو ایک صنم چاہئے عاشقی کے لئے اور ہمارا ہر صنم جس کے ہم عشق میں مبتلا ہوتے ہیں ہمارا قاتل ہوتا ہے ابھی ہم میں کشاں کشاں مقتل کو جانے اور قتل ہونے کا شوق اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور ابھی اس میں کوئی قابل ذکر کمی نہیں آئی۔ ہم شخصیت پرستی اور شخصی غلامی کی سٹیج پر ابھی بڑے حوصلے سے براجمان ہیں' اور خوش ہیں کہ ہم بھی خدار کھتے ہیں۔

کج شہر دے لوگ بھی ظالم سن　　　کج سانوں مرن دا شوق وی سی

منیر نیازی اور مصطفیٰ زیدی نے ایک شعر میں یوں صورت حال بیان کی ہے:

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں　　　تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

اور جناب احسان دانش مرحوم نے کہا:

کس کس کی زباں روکنے جاؤں تیری خاطر　　　کس کس کی تباہی میں تیرا ہاتھ نہیں ہے

حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ اور اس کی تحقیقات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہمارے حکمران رہے' انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کے گھاٹ اتارا' ملک توڑا' اور اپنے حریف ملک ہندوستان کے فوجی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لیکن اقتدار اپنے ملک کے الیکشن جیتے ہوئے لوگوں کے سپرد نہ کیا۔ اپنی فوج کے جوانوں کو بے سروسامانی کی حالت میں بغیر کسی ٹھوس منصوبہ بندی کے ملک کے ایسے حصے میں اتارا' جو حصہ سیاسی طور پر محرومی کا شکار تھا' اور کسی طرح بھی اس فوجی جوان سے خوش نہیں رہ سکتا تھا جو ڈیڑھ ہزار میل

سے اسے مارنے آیا تھا' گولی کے سوا اور کوئی دوسری بات اس کے پاس نہ تھی چنانچہ یہ فوجی جوان
بھی بڑی بے بسی کی حالت میں وہاں مارا گیا۔ کتنے فوجی جوان اس طرح مارے گئے رپورٹ اس
پر خاموش ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور دوسرے سیاستدانوں کے بارے میں بھی رپورٹ کچھ
زیادہ روشنی نہیں ڈالتی' یقیناً فوج کو اس 'نا قابل واپسی گھاٹ' اتارنے میں اس وقت کے پیپلز پارٹی
کے مغربی پاکستان سے جیتے ہوئے لیڈر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا بھی کوئی کردار ضرور تھا پیپلز پارٹی
نے اس وقت ایک تاثر عام آدمی کو دینا شروع کیا تھا کہ بنگالی ہم پر بوجھ ہیں اگر یہ الگ ہوتے ہیں
تو ہمارا بوجھ اتر جائے گا۔ اور ہم مغربی پاکستان والے بڑی ترقی کریں گے۔

اس وقت 1970ء میں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی مشہور اور
تاریخی کسان کانفرنس میں بتا دیا تھا کہ کیا 'انہونی' ہونے جا رہی ہے انہوں نے کہا کہ بالآخر آپ
مغربی پاکستان سے فوج ہم پر چڑھا دیں گے لیکن یہاں بے شمار دریا ہیں جو بہا لے جائیں گے۔
اس طرح جب فوج کشی ہوئی تو نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما خان عبدالولی خان نے کہا کہ ملک ٹوٹ
گیا۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ ملک بچ گیا۔ بہر حال رپورٹ خود بول رہی ہے' اور سوچنے
سمجھنے والوں کے لئے بہت کچھ سبق اور عبرت اس میں موجود ہے۔

رپورٹ کے آخر میں آپ پڑھیں گے اور یہ اقتباس ہماری تیار کردہ تیسری جلد میں
آئے گا۔ جو یوں ہے۔

''ایسا لگتا ہے کہ جیسور میں مشرقی پاکستان فوجی اپنے ہتھیار پھینکنے کے بعد ای پی آر کی
سرحدوں چوکیوں پر تعینات باغی اہلکاروں کی شہ پا کر بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے چنانچہ انہوں
نے کوٹ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی جہاں بڑی مقدار میں ہتھیار جمع تھے جس پر وہاں لڑائی
شروع ہوگئی۔ اور فریقین کے جانی نقصان کے بعد صورت حال خود بخود قابو میں آ گئی۔

ان شواہد سے ایک نیا نکتہ ابھر کر سامنے آیا ہے کہ فوجی ایکشن اس لئے شروع نہیں کیا
گیا تھا (جیسا کہ اس سے قبل 1972ء میں ہمیں یقین دلایا گیا تھا) کہ عوامی لیگ بھی 26 مارچ

1971ء کو فوجی ایکشن کا منصوبہ بنا چکی تھی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عوامی لیگ کے پاس
ایسا کوئی ہنگامی منصوبہ سرے موجود نہیں تھا بہر حال ہم جنرل فرمان علی کی اس رائے سے اتفاق کئے
بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ ملٹری ایکشن عوامی لیگ کی جانب سے کسی فوری ایکشن کی منصوبہ بندی کو
ناکام بنانے کی غرض سے شروع نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ جنرل فرمان علی نے اپنے بیان میں کہا ہے
''میرے خیال میں یہ دونوں موقف بالکل غلط ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم تیار نہیں تھے غلط ہے اسی طرح یہ
کہنا بھی غلط ہے کہ وہ لوگ بغاوت پر کمر بستہ تھے'' بہر کیف جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ آخر
ملٹری ایکشن کی کیا ضرورت تھی؟ تو جنرل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ''صدر یحیٰی خان پر
فوج کے جنگجو عناصر کا غلبہ تھا جو ایک سیاسی سیٹ اپ میں مشرقی پاکستان کی بالادست حیثیت کو تسلیم
کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جن میں جنرل عمر جنرل مٹھا' جنرل حمید اور جنرل اکبر کے نام شامل
ہیں۔

(45) اس بات سے ہمارے ان نتائج کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنرل یحیٰی خان اور ان
کی ملٹری جنتا بدستور اقتدار سے چمٹی رہنا چاہتی تھی' چنانچہ جمہوری نظام کی بحالی کا یہ نام نہاد منصوبہ
دھوکے اور فریب کے سوا کچھ بھی نہ تھا شیخ مجیب الرحمٰن کو دبانے کا فیصلہ فروری کے مہینے میں ہی کیا
جا چکا تھا' جس کے بارے میں اب جنرل فرمان علی نے انکشاف کیا ہے۔ چنانچہ ان مذاکرات کی
حیثیت محض کیموفلاج کی سی تھی تا کہ یحیٰی خان کی جنتا کو ملٹری ایکشن کے لئے جواز فراہم ہو سکے۔
جنرل فرمان علی کی جانب سے پیش کیا گیا خلاصہ اس قابل ہے کہ یہاں اس کا اعادہ کیا جائے'
انہوں نے اس دور کی مروجہ سوچ اور خیالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر آپ جمہوری طرز عمل اختیار کرتے ہیں تو تمام تر سیاسی
قوت اور اقتدار مشرقی پاکستان کو منتقل کرنا پڑے گا جب کہ مغربی پاکستان کا تمام تر انحصار صرف فوج
پر تھا اس سلسلے میں' میں سب ہی کو مورد الزام سمجھتا ہوں۔ صرف فوج ہی کو نہیں پورے مغربی
پاکستان کا رویہ یہی تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کے سیاسی تسلط کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا رپورٹ میں

مزید کہا گیا ہے کہ:

''جیسا کہ ہم اپنی اصل رپورٹ میں نشاندہی کر چکے ہیں فوجی ایکشن شروع ہو جانے کے بعد فضائی راستے سے فوجی دستوں کو مشرقی پاکستان لانے کا کام شروع ہوا۔ چنانچہ جوں جوں یہ فوجی دستے اپنے چھوٹے ہتھیاروں کے ساتھ وہاں پہنچے انہیں صفایا کرنے والے آپریشنز کے لئے ڈھاکہ شہر سے مختلف علاقوں کو روانہ کر دیا جاتا تھا' کہ وہ اندرونی علاقوں کا سرحدوں تک صفایا کر سکیں۔ تاہم کمیشن کے روبرو پیش کئے گئے تازہ ترین شواہد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان آپریشنز کی بھی مناسب منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اور انہیں یقینی طور پر رسد و حمل کے مطلوبہ ذرائع بھی میسر نہیں تھے' جس کا ایک بنیادی سبب زمین کو اجنبی سمجھنا تھا''۔

اللہ کے آخری نبی محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دو لفظی جامع حدیث ''اعمالکم عمالکم'' تمہارے اعمال ہی تمہارے حکمران ہیں' ہمارے لئے بہترین سبق ہے۔

محمد اشفاق خان

۱۴۔اپریل 2002ء

لاہور

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ایک نظر میں

☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی جلد The Report of the Commission of inquiry 1971 War کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس رپورٹ کو جس انداز میں شائع کیا گیا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔

(صفحات کے نمبر اصل رپورٹ کے مطابق درج کئے گئے ہیں)

پہلا حصہ: دائرہ کار اور طریقہ کار

1- تعارف رپورٹ صفحہ 1

2- عام امور (صفحہ 10)

دوسرا حصہ: سیاسی پس منظر

1- پاکستان کا ارتقا صفحہ 15

2- پاکستان کی سیاسی تاریخ اگست 1947 سے 7۔اکتوبر 1958 تک (صفحہ 21)

3- پاکستان کی سیاسی تاریخ 7۔اکتوبر 1958 تا 6 جون 1962 (صفحہ 36)

4- پاکستان کی سیاسی تاریخ 6 جون 1962 تا 24 مارچ 1969 (صفحہ 43)

5- ایوب خان حکومت کی آخری دنوں میں حالت زار (صفحہ 49)

6- یحییٰ خان حکومت کا دوسرا جنگی قانون (صفحہ 67)

7- یحییٰ خان کے مقاصد اور اداروں کا تجزیہ (صفحہ 123)

تیسرا حصہ: بین الاقوامی تعلقات

چوتھا حصہ: فوج کی حالت زار

پانچواں حصہ: متفرقات

☆☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی دوسری جلد جو انتہائی خفیہ تھی شائع کی گئی اور اس کو 1971ء کی جنگ کا انکوائری کمیشن رپورٹ کا اضافی ایڈیشن قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے سرورق پر قرآنی آیت

ایک اخبار کے مطابق حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ 8 جولائی 1972ء کو کمیشن نے پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کو پیش کی جس کی کاپیاں 19 اگست 1972ء کو پی سی پی پی آئی ایس 168 ڈی ای ایف نمبر شمار کے ذریعے کی گئیں۔ اس رپورٹ کے اصل مسودے کے آغاز پر قرآن پاک کی سورۃ المائدہ کی ایک آیت سبز حروف میں درج ہے یہ سورہ المائدہ کی نویں آیت ہے اس کا انگریزی ترجمہ بھی گولڈن حروف میں ہے آیت اور اس کا اردو میں ترجمہ یہ ہے۔

یٰٓا یھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط ولا یجرمنکم شنأن قوم علیٰ الا تعدلوا ؕ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ ؗ واتقوا اللہ ؕ ان اللہ خبیر بما تعملون O

''اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں شہادت دینے کے لئے مضبوطی اختیار کرو۔ لوگوں سے نفرت تمہیں عوام الناس سے انصاف کرنے سے محروم نہ رکھے۔ تم برائی اختیار نہ کرو اور انصاف کی راہ سے نہ ہٹو۔ کیونکہ یہ تقویٰ کے قریب ہے اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو تم کرتے ہو''۔

اصل رپورٹ کے صفحات 145 سے 212 نکال لئے گئے ہیں جو امور خارجہ سے متعلق تھے اس کے علاوہ متعدد پیراگراف حذف کر کے ان کی جگہ تسلسل برقرار رکھنے کے لئے نئے صفحات ٹائپ کر کے ڈالے گئے ہیں۔ اصل رپورٹ کا مسودہ 452 صفحات کا تھا سپلیمنٹری رپورٹ کے ہر صفحے پر ٹاپ سیکرٹ درج ہے اس کے کل صفحات 223 ہیں۔

رپورٹ۔ قومی اخبارات کی نظر میں

اخبارات نے یہ تفصیلات بھی بیان کی تھیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان 1971ء کی جنگ کے نتیجہ میں ''سقوط ڈھاکہ'' کی وجوہات کے بارے میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ قریباً 28 سال کے بعد موجودہ فوجی حکومت نے عوام الناس کے لئے شائع کی ہے۔ یہ دو جلدوں میں قریباً 675 صفات پر مشتمل اور انگریزی زبان میں ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس کو مکمل کرنے کے لئے کمیشن کے 57 اجلاس منعقد ہوئے تھے جس میں کمیشن کے روبرو 213 افراد نے بیانات دیئے اور 72 افراد کی شہادتیں ریکارڈ کی گئیں۔ انکوائری کمیشن 26 دسمبر 1971ء کو سقوط ڈھاکہ کا جائزہ لینے کے لئے قائم ہوا تھا اور اس نے 17 جنوری 1972 سے راولپنڈی میں اپنی کارروائی کا باضابطہ آغاز کیا۔ تمام کارروائی بند کمرے میں ہوئی۔ اس کمیشن کی مرتب کی ہوئی اصل رپورٹ 448 صفحات پر مشتمل ہے جو دو جلدوں میں عوام الناس کے لئے کیبنٹ بلاک اسلام آباد کے نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر میں رکھی ہوئی ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے آرمی کے 88 افراد کو جن میں سے 27 ریٹائرڈ' فضائیہ کے 45 جن میں سے 6 ریٹائرڈ اور نیوی کے 21 افراد جن میں 7 ریٹائرڈ افراد تھے بیانات اور شہادتوں کے لئے طلب کیا تھا' ان کے علاوہ 2 سیاسی راہنما' تین صحافی' 10 عام شہری اور 23 سرکاری اہلکار بھی بلائے گئے۔ ان افراد کی شہادتیں قریباً 4 ہزار صفحات پر لکھی گئیں اور ان کے ساتھ 374 دستاویزی ثبوت لگائے گئے۔ عوام کے مطالعے کے لئے رکھی جانے والی دو جلدوں کے علاوہ باقی چھ جلدیں ایسی ہیں جو غیر ممالک کے ساتھ تعلقات' حساس اور خفیہ دستاویزات اور بیانات پر مبنی ہیں۔ جن کو اب بھی خفیہ (Classified) دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

30 دسمبر 2000ء سے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ دفتری اوقات کار میں وہاں جا کر پڑھی جاسکتی ہے۔ اب تک اس کی چار مختلف جلدوں سے بہت سے افراد استفادہ کر چکے ہیں'

جن میں دو سیاست دان بھی شامل ہیں جنہوں نے وہاں جا کر اس کا مطالعہ کیا۔ اس رپورٹ کا مطالعہ کرنے والوں کی لسٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک اس رپورٹ کا مطالعہ صرف میڈیا سے وابستہ لوگوں نے ہی کیا ہے جن میں زیادہ تر تعداد اخبارات سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کی ہے۔ عرصے تک پورے پاکستان سے کسی عام آدمی یا شہری نے اس رپورٹ کو پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ حالانکہ نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر میں مطالعہ کرنے والوں کی راہنمائی اور معاونت کے لئے چھ سے سات افراد پر مشتمل عملہ موجود ہوتا ہے اگر کسی فرد کو دوران مطالعہ نوٹس لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ عملہ ان کو کاغذ اور پنسل کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں عام آدمی کی دلچسپی نہ لینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ یہ انگریزی زبان میں ہے اور اس میں شامل فوجی اور عدالتی اصطلاحات کی وجہ سے اس کو پڑھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ اس رپورٹ کی فوٹو کاپی کرنا ممنوع ہے اور نہ ہی اس کو عمارت سے باہر لانے یا لے جانے کی اجازت ہے۔ این ڈی سی کے ذرائع کے مطابق مستقبل قریب میں اس کو عام آدمی یا شہری کے مطالعہ کی خاطر اردو میں ترجمہ کرنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ یہ رپورٹ عوام الناس کے مطالعہ کے لئے محدود مدت تک نہیں رکھی گئی بلکہ اس کو مستقبل میں کسی بھی دن دفتری اوقات کار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اہم انکشافات

قومی پریس نے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں ایک جائزہ شائع کیا تھا جس میں بعض اہم انکشافات بھی کئے گئے تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ جو کیبنٹ ڈویژن نے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے فیصلے کے تحت 30 دسمبر 2000ء کو ڈی کلاسی فائی (شائع) کی ہے اس پر کمیشن کے سربراہ چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن، کمیشن کے ممبر لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق اور کمیشن کے ممبر سندھ بلوچستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس طفیل علی اے رحمان کے دستخط نہیں ہیں۔ کیبنٹ ڈویژن کے مطابق کمیشن کی اصل رپورٹ پر فاضل ممبروں کے دستخط موجود ہیں جو ان کے پاس محفوظ ہے جس کی کاپیاں محدود تعداد میں چھاپی گئی تھیں۔ کابینہ ڈویژن نے کہا ہے کہ دستخط والی کاپی بھی کابینہ ڈویژن میں محفوظ ہے لیکن صحافیوں کے سامنے محدود تعداد میں طبع کرائی گئی رپورٹ کی نقول رکھی گئی ہیں۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے متعدد حصے 30 دسمبر 2000ء کو بھی شائع نہیں کئے گئے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق ان حصوں کو شائع کرنا قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔ رپورٹ کا پیراگراف نمبر 96 کا کچھ حصہ جو دوسرے ممالک سے متعلق تھا وہ بھی شائع نہیں ہوا۔ تیسرے حصے کے سروے کے صفحات 138 سے 212 بھی شائع نہیں کئے گئے۔ یہ ابواب امور خارجہ سے متعلق ہیں جن کو حساس قرار دیا گیا ہے۔ نیز صفحہ 236 اور صفحہ 237 پر پیراگراف نمبر 9 سے نمبر 11 تک بھی خفیہ رکھے گئے ہیں جبکہ سپلیمنٹری رپورٹ جو 1974ء میں بھٹو دور میں تیار کرائی گئی سے کچھ حذف نہیں کیا گیا۔ وہ سو فیصد اصل حالت میں شائع کی گئی ہے۔ دوران ہفتہ وفاقی دارالحکومت کے کسی اخبار یا ٹی وی رپورٹر کو حمود الرحمٰن کمیشن کی وہ اصل کاپی نہیں دکھائی گئی جس کے ہر صفحے پر کمیشن کے تینوں جسٹس صاحبان کے دستخط تھے۔

☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں 1971ء کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے کردار کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اس کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی

کے اجلاس کو ملتوی کرنے کے بارے میں جو بیان دیا تھا وہ ان کی سیاسی بصیرت میں کمی کی بنا پر تھا اور وہ اس کے امکانی ردعمل کی شدت کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ رپورٹ میں واضح کیا گیا کہ اس بارے میں مسٹر بھٹو نے کمیشن کے روبرو بلا جھجک اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ انہیں اس بات کی بالکل توقع نہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں اس بارے میں اتنا پر تشدد ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔

☆ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اس وقت کے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے 15 دسمبر 1971ء کو بڑے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ دشمن اس کی لاش پر سے گزر کر ہی ڈھاکہ میں داخل ہوگا لیکن اس بیان کے اگلے ہی روز 16 دسمبر 1971ء کو غیر ملکی میڈیا کی نشریات کے ذریعے پاکستانی قوم کو یہ دلخراش خبر سننے کو ملی کہ جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے ریس کورس پارک میں اپنے ہتھیاروں کو دشمن کے حوالے کر دیا ہے جس کے نتیجے میں ان کی کمانڈ میں 73 سے 93 ہزار تک فوج کے افسران اور جوانوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس وقت کے خودساختہ صدر اور پاک فوج کے کمانڈر انچیف یحییٰ خان نے اس سانحہ کے بارے میں قوم کے نام ایک نشریاتی پیغام میں کہا کہ ہم مغربی محاذ پر جنگ جاری رکھیں گے اور اس جنگ میں ناکامی کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے اس نشریاتی پیغام کے اگلے روز ہی اپنے پہلے بیان سے انحراف کرتے ہوئے قوم کو ایک نئے دھچکے سے دوچار کر دیا جب انہوں نے بھارتی وزیراعظم کو ایسے مرحلے پر یکطرفہ طور پر جنگ بندی کی پیشکش کر کے مکمل طور پر شکست کو تسلیم کر لیا جبکہ سرکاری اطلاعات میں کہا گیا تھا کہ پاکستانی مسلح افواج دشمن کے علاقے میں ہر سمت پیش قدمی کر رہی ہیں اور اس کو دشمن کے خلاف کسی بڑی ہزیمت کا سامنا نہیں ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ قوم یہ سمجھنے میں یکسر طور پر ناکام رہی تھی۔

☆ موجودہ حکومت کی طرف سے شائع کی جانے والی رپورٹ کے مطابق 20 جنوری 1972ء کو کمیشن نے ملک کی 17 سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں سے الگ الگ خطوط کے ذریعے درخواست کی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے والے زیر تحقیق معاملات کے بارے میں اپنی آرا اور جائزوں کا خلاصہ کمیشن کو ارسال کریں۔ خط میں استفسار کیا گیا کہ آیا وہ ذاتی طور پر ثبوت پیش کرنے کے لئے تیار ہوں گے یا اپنے نمائندے کمیشن کے روبرو پیش کریں گے۔ اس خط کے حوالے سے سیاسی پارٹیوں کی طرف سے ردعمل خاصا اطمینان بخش رہا۔ اگرچہ بعض سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں نے پہلے کمیشن کو آگاہ کیا کہ چونکہ انکوائری کی شرائط (ٹرمز

آف ریفرنس) صرف فوجی پہلوؤں تک محدود ہیں اور کارروائی بند کمرے میں ہوگی لہٰذا وہ اس حوالے سے کمیشن کی معاونت کے لیے معذور ہیں۔ تاہم ان رہنماؤں کو جب یہ بتایا گیا کہ کمیشن کا ان شرائط کے حوالے سے اتنا بھی محدود دائرہ کار نہیں کہ وہ اس بارے میں دیگر پہلوؤں کو یکسر فراموش کر دے جو انکوائری سے موضوع کے متعلق ہیں۔ جب ان سیاسی رہنماؤں کو اس بارے میں تسلی ہوئی تو انہوں نے معاملہ کے سیاسی پہلوؤں پر اپنی معاونت کے لئے آمادگی کا اظہار کیا جس کے جواب میں 23 سیاسی رہنماؤں نے حمود الرحمٰن کمیشن کو اپنی قیمتی آرا سے آگاہ کیا۔

آرمی میس میں شراب پر پابندی

حمود الرحمٰن کمیشن کی اصل رپورٹ کے صفحہ نمبر 452 پر مسلح افواج کے لئے درج ذیل پانچ سفارشات کی گئی ہیں۔ رپورٹ کے آخری صفحے پر سترہویں سفارشات میں (ا) سے (ر) تک پانچ جز ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(ا) ہم سفارش کرتے ہیں کہ مسلح افواج ایسے اقدامات اور ذرائع بروئے کار لائیں کہ مسلح افواج میں بالعموم اور مسلح افواج کے اعلیٰ افسران بالخصوص اخلاقی اقدار پر سمجھوتہ نہ کریں اور ان کو پس پشت نہ ڈالیں۔

(ب) اگلے رینک میں ترقی کے وقت پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ کسی افسر کی اخلاقی حالت کو پوری اہمیت دی جائے۔

(ج) ملٹری اکیڈمیوں اور تربیت کے دوسرے فوجی اداروں کے نصابوں کے ذریعے نوجوان افسروں اور دوسرے فوجیوں کے ذہن میں مذہبی، جمہوری اور سیاسی اداروں کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

(د) فوج کے میس وغیرہ میں شراب پر پابندی لگادی جائے۔

(ر) فوجیوں کی بدکرداری اور دوسری بدعنوانیوں کا سختی سے نوٹس لیا جائے۔

یحییٰ خاں کا خفیہ سیاسی مشیر

قومی اخبارات میں چھپا کہ پاکستان کے شہرہ آفاق جنرل یعقوب خان نے مارچ 1971ء میں اس وقت فوج سے استعفیٰ دے دیا جب صدر جنرل محمد یحییٰ خان نے اپنے عسکری اور سیاسی مشیروں کے کہنے پر 3 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں طلب کئے گئے قومی اسمبلی کے اجلاس کو اچانک ملتوی کر دیا۔ جنرل یعقوب خان نے قومی اسمبلی کے اجلاس کو انتہائی نازک وقت میں ملتوی کئے جانے کو قومی سانحے سے تعبیر کیا۔ جنرل یعقوب خان اس وقت مشرقی پاکستان میں فوج کے سربراہ تھے انہوں نے صدر یحییٰ خان کے فیصلے پر احتجاج کیا اور کہا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس فی الفور دوبارہ بلا کر ملک کو تباہی کی طرف جانے سے بچایا جائے مگر جنرل یحییٰ خان نے جب اپنے ایک خفیہ سیاسی مشیر کی بات مانتے ہوئے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا تو جنرل یعقوب خان نے استعفیٰ دے کر مشرقی کمان چھوڑ دی ان کے بعد لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان نے ہنگامی طور پر ڈھاکہ میں مشرقی کمان سنبھالی اس طرح 25 مارچ کا ملٹری ایکشن جنرل ٹکا خان کے زیر کمان شروع ہوا جو مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کا موجب بنا۔

شکست کے ذمہ دار کون؟

حمود الرحمٰن کمیشن نے تیرہ اعلیٰ فوجی افسروں کو سقوط مشرقی پاکستان کا براہ راست ذمہ دار قرار دے کر ان کا کورٹ مارشل کرنے کی دوٹوک سفارش کی ہے۔ کمیشن کی رپورٹ کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"یہ لازمی ہے کہ پاکستان کے آئین کو سبوتاژ کرنے اور اتنی بڑی شکست کے ذمہ دار افراد جو کہ مجرمانہ سازش، پیشہ ورانہ بد دیانتی، منصبی فرائض کی انجام دہی میں غفلت، بزدلی، اخلاقی بے راہروی اور جنگ سے فرار جیسے جرائم کے مرتکب پائے گئے ہیں ان کو عبرتناک سزائیں دی جائیں"۔

حمود الرحمٰن کمیشن نے اپنی تحقیقات کے بعد مشرقی پاکستان میں فوجی شکست کا ذمہ دار جن تیرہ سینئر آرمی افسروں کو ٹھہرایا ان میں سے بارہ افسروں کو پوری فوجی مراعات اور پنشن کے ساتھ بھٹو حکومت نے ریٹائر کر دیا اور آج بھی ان کو پاکستان کے قومی خزانے سے پنشن اور مراعات دی جا رہی ہیں۔ کمیشن نے 72 شہادتیں ریکارڈ کرنے کے بعد لکھا۔

"سقوط ڈھاکہ کی مکمل اور حتمی ذمہ داری اس وقت کے صدر جنرل یحییٰ خاں، لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ، میجر جنرل عمر، لیفٹیننٹ جنرل مٹھا پر عائد ہوتی ہے۔ اس بات کی بھی شہادت ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں، میجر جنرل راؤ فرمان علی خاں، میجر جنرل خادم حسین بھی فوجی منصوبہ بندی اور ملٹری ایکشن میں شریک رہے ہیں"۔

حمود الرحمٰن کمیشن آگے چل کر کہتا ہے کہ:

"ان تمام افراد کے خلاف سخت ایکشن نہ صرف قوم کو مطمئن کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ آئندہ اس قسم کے سانحے کے اعادے سے بچنے کے لئے بھی ضروری ہے"۔

جنرل گل حسن کی دوسری شادی

اخبارات کا بیان ہے کہ ان میں سے کسی بھی ذمہ دار فوجی افسر کا کورٹ مارشل نہیں ہوا۔ صرف جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی کو 1975ء میں فوج سے برطرف کر کے ان کی پنشن اور ریٹائرمنٹ کی دیگر ساری مراعات ضبط کی گئیں۔ بھٹو کے خلاف 1977ء میں پی این اے کی تحریک کے دوران ریٹائرڈ جنرل نیازی کو گرفتار کیا گیا اور ضیا حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ سانحے کے بڑے کردار یحییٰ خاں کو صدر اور چیف آف آرمی سٹاف کی دو پنشنیں دی جاتی رہیں۔ بھٹو نے یحییٰ خاں کو جیل تک میں نہ ڈالا بلکہ ان کو ان کی ہارلے سٹریٹ والی رہائش گاہ میں نظر بند کیا گیا جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ایام اپنی فیملی کے ہمراہ بسر کئے اور وہ اکثر شام کو اپنے لان اور برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دیکھے جاتے تھے۔ اتنے بڑے سانحے کے باوجود ان کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ یحییٰ خاں 9۔ اگست 1980ء کو انتقال کر گئے مشرقی پاکستان میں اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی شکست کے ذمہ دار اس عیاش جرنیل کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

اقتدار حاصل کرنے کے صلے میں اپنی مدد کرنے پر بھٹو نے بطور انعام لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا۔ گل حسن نے جب حسب روایت صدر بھٹو کو آنکھیں دکھانے کی کوشش کی تو بھٹو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے غلام مصطفیٰ کھر کے ذریعے ان سے استعفیٰ پر دستخط کرا لئے۔ اسے بعد ازاں آسٹریا میں سفیر مقرر کیا گیا جہاں گل حسن نے اپنی پہلی بیوی ہونے کے باوجود ایک آسٹروی دوشیزہ سے شادی کی۔ گل حسن 9۔ اکتوبر 1989ء کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے اس دوسرے کردار کو بھی راولپنڈی میں فوجی اعزازات کے ساتھ دفن کیا گیا۔ میجر جنرل رحیم خاں بدستور نہ صرف فوجی ملازمت میں رہے بلکہ ان کو ترقی دے کر چیف آف جنرل سٹاف مقرر کر دیا گیا۔ بعد ازاں وہ اعلیٰ سول عہدوں پر بھی فائز رہے۔ وفاقی سیکرٹری بھی رہے۔ جنرل ضیاالحق نے ان کو پی آئی اے کا چیئرمین بھی بنایا۔

واضح سفارشات! کوئی ایکشن نہیں

قومی اخبارات یہ خبر شائع کی تھی کہ سانحے کے ایک اور بڑے کردار میجر جنرل جمشید آج کل لاہور میں آرام وسکون کی زندگی تمام فوجی مراعات کے ساتھ گزار رہے ہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان کی بنا پر حمود الرحمن کمیشن کی طرف سے قصوروار ٹھہرائے جانے والے ایک اور جرنیل میجر جنرل عابد جو صدر یحییٰ کے عم زاد تھے ان کو بھی پوری فوجی پنشن اور مراعات کے ساتھ بھٹو حکومت نے ریٹائر کیا۔ جنرل ضیاالحق نے ان کو بعد ازاں مشرقی جرمنی میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا۔ 1980ء کے وسط میں ان کا پشاور میں انتقال ہوا۔ وہ بھی فوجی اعزازات کے ساتھ سپرد خاک کیے گئے۔ جنرل نیازی کے علاوہ صرف ایک فوجی افسر (بریگیڈئر باقر صدیقی) جو کمیشن کی رپورٹ کے مطابق متعدد بدعنوانیوں میں ملوث تھے ان کو 1975ء میں فوج سے برطرف کر کے پنشن سے محروم کیا گیا۔ بریگیڈیر حیات کو بھی پوری فوجی پنشن سے بھٹو حکومت نے نوازا۔ رپورٹ کی اشاعت تک پشاور میں تھے اور پاکستان کی عسکری تاریخ پر لکھتے تھے حالانکہ حمودالرحمن کمیشن نے ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی سفارش کی تھی۔

اس سانحے کا ایک اور عبرتناک پہلو یہ ہے کہ سانحے کے ذمہ دار افراد کے خلاف انکوائری کمیشن کی واضح سفارشات کے باوجود کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ چنانچہ ان افسروں نے اپنی لکھی گئی کتابوں میں یا کسی سے کتابیں لکھوا کر خود کو "فرشتہ" ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان فوجی افسروں نے سارا الزام ملک کے سیاستدانوں پر عائد کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ جنرل گل حسن، جنرل نیازی، جنرل راؤ فرمان علی نے خود کتابیں لکھی ہیں جس میں خود کو معصوم ثابت کیا اور حالات کا شکار قرار دیا ہے۔ اب تک تحریر کی صورت میں ٹکا خان، صاحبزادہ یعقوب خان، رحیم خان، غلام عمر کی طرف سے کوئی کتاب سامنے نہیں آئی۔ سقوط مشرقی پاکستان کے ایک کردار جنرل ابوبکر عثمان مٹھا جن کا حمودالرحمن کمیشن نے کورٹ مارشل کرنے کی سفارش کی تھی ان دنوں اسلام آباد میں پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ارباب جہانزیب جن کا کورٹ مارشل کرنے کو کہا گیا ان کو ترقی دے کر لیفٹیننٹ جنرل بنایا گیا۔ ایک بار ان کو سندھ کا گورنر بنایا گیا اور کابینہ میں

بھی شامل کیا گیا۔ ان پر نیشنل بنک سراج گنج کو لوٹنے کا الزام حمودالرحمن کمیشن رپورٹ میں لگایا گیا۔ "بنگال کا قصاب" کے نام سے یاد رکھے جانے والے لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خاں کو بھٹو حکومت نے نہ صرف چیف آف آرمی سٹاف بنایا بلکہ بعدازاں ان کو پاکستان کا وزیر دفاع بھی بنا دیا گیا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے ذمہ دار کئی سینئر فوجی افسروں کو بیرون ملک پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔

رپورٹ تیاری کے بعد خفیہ ہوگئی

قومی اخبارات کے مطابق تحقیقاتی کمیشن نے 196 یوم میں تحقیقات مکمل کر لی۔ 72 جنگی قیدیوں کے بیانات ریکارڈ کیے گئے۔ سترہ سیاسی جماعتوں، حکومت اور مسلح افواج کے نمائندوں کو مؤقف بیان کرنے کا پورا موقع دیا گیا۔ حمودالرحمن کمیشن کی تشکیل صدر یحییٰ خاں سے اقتدار حاصل کر کے پاکستان کے پہلے سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر ذوالفقار علی بھٹو نے کی۔ اس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس حمود الرحمن جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا کو پاکستان کے دولخت ہونے کے وجوہ کا سراغ لگانے والے تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ کمیشن کی تشکیل مشرقی پاکستان میں اسلامی تاریخ کی مسلم فوج کی سب سے بڑی شکست کے دس یوم بعد 26 دسمبر 1971ء کو کی گئی۔ اس کمیشن نے اپنی تشکیل کے سات ماہ کے اندر اندر 216 سے زائد گواہوں کی شہادتیں قلمبند کیں۔ پاکستان کے متعدد فوجی مراکز میں جا کر ریکارڈ کا جائزہ لیا۔ کمیشن میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوارالحق، سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس طفیل علی اے رحمن ممبر کی حیثیت سے شبانہ روز کام کرتے رہے، حمودالرحمن کمیشن نے دن رات سخت محنت اور قومی خدمت کے جذبے کے تحت 452 صفحات پر مشتمل رپورٹ صرف 196 یوم میں مکمل کر لی۔ اصل رپورٹ پر دستخطوں کی تاریخ 8 جولائی 1972ء ہے اس وقت کے پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اس رپورٹ کا مکمل مطالعہ کر کے اسے خفیہ (ٹاپ سیکرٹ) دستاویز قرار دے دیا اور اسے سخت حفاظت میں رکھ دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر 19۔ اگست 1972ء کو کمیشن کے ارکان کے دستخطوں والی رپورٹ کی محدود تعداد میں کاپیاں 19۔ اگست 1972ء کو مراسلہ نمبر پی سی پی پی آئی۔ ایس۔ 168۔ ڈی ای ایف کے تحت چھپوادی گئیں۔ کمیشن کے چیئرمین چیف جسٹس آف پاکستان کی خواہش پر لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر کو ایڈوائزر اور سپریم کورٹ کے اسسٹنٹ

رجسٹرار ایم اے لطیف کمیشن کے سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ کمیشن کا پہلا اجلاس سقوط مشرقی پاکستان کے پندرھویں روز ہی لاہور میں منعقد کیا گیا جس میں یہ بات طے کی گئی کہ آئندہ تحقیقاتی کمیشن کے سارے عمومی اجلاس راولپنڈی کے جنرل ہیڈ کوارٹرز میں ہوں گے لیکن کمیشن ان مقامات پر بھی جائے گا جہاں سقوط مشرقی پاکستان کی معلومات رکھنے والے افسران اور شخصیات موجود ہوں گی۔ بری، بحری اور فضائی افواج کے نمائندوں کو 12 جنوری 1972ء کو کمیشن کی معاونت کے لئے شامل کیا گیا۔ آرمی کے کرنل محمد حسین قریشی، نیوی کے کیپٹن اے ولی اللہ اور ائیر فورس کے ائیر کموڈور ظفر محمود نے 13 جنوری 1972 سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ کمیشن نے 216 گواہوں کے بیانات ریکارڈ کئے۔ ان سے ضروری استفسارات کئے جرح بھی کی گئی۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے تحقیقات کا دائرہ مسلح افواج کے افسروں کے لکھے لکھائے بیانات تک محدود رکھنے کے بجائے اپنی تقرری کے ساتویں روز یعنی یکم جنوری 1972ء کو پاکستان کے عوام اور مسلح افواج کے ارکان کی شہادتیں قلمبند کرنے کی پیش کش کی اور شہادتیں ریکارڈ کرانے کے لئے رضا کارانہ طور پر آنے والوں کو تحفظ فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ عامۃ الناس اور افواج کے ملازمین کو دس جنوری 1972ء کو کمیشن کے روبرو آنے کی ہدایت کی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی' پاکستان مسلم لیگ' نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی سمیت ملک کی سترہ سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو 20 جنوری 1972 کو خصوصی مراسلے بھیجے گئے جن میں سیاسی لیڈروں کو کمیشن کے روبرو بیانات ریکارڈ کرانے کے لئے کہا گیا۔ 21 جنوری کو کمیشن نے صدارتی امور کے انچارج وزیر کو خط لکھا کہ وہ حکومت کا کمیشن میں نمائندہ مقرر کرنا چاہیں تو کر دیں۔ جس پر حکومت نے پی پی پی کے سرکردہ قانون دان مسٹر یحیٰی بختیار کو سانحہ مشرقی پاکستان کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کے سامنے بھٹو حکومت کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے مقرر کیا۔ 15 جنوری 1972ء کو آرمی' نیوی' ائیر فورس کے جنگی قیدیوں کے بیانات قلمبند کرنے شروع کئے۔ کمیشن نے قصور سیکٹر اور دوسرے علاقوں میں جنگی مشقوں کا جائزہ لے کر عملی جنگ میں کوتاہیوں کو نوٹ کیا۔ بھارت سے 90 ہزار سول و فوجی جنگی قیدیوں کی واپسی ہوئی۔ عالم اسلام کی تاریخ میں کسی بھی جنگ میں 90 ہزار مسلمان جنگی قیدی نہیں بنے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ کی اس سب سے بڑی شکست میں جنگی قیدی بننے والوں کو اپریل 1974ء تک بھارت نے خصوصی ٹرینوں کے ذریعے پاکستان بھیج دیا جس کے بعد بھٹو حکومت نے مئی 1974ء میں

حمود الرحمٰن کمیشن کو دوبارہ فعال کر دیا۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی ہیئت ترکیبی وہی رکھی گئی۔ مئی 1974ء سے دوبارہ تحقیقات شروع کر دی گئی۔ تحقیقاتی کمیشن نے دوسرے مرحلے کی انکوائری کے دوران پاکستان کے ان 72 جنگی قیدیوں کے بیانات ریکارڈ کئے جو 16 دسمبر 1971ء کو جنگی قیدی بنے اور دو سال سے زائد عرصہ بھارت کے مختلف مقامات پر پاکستانی جنگی قیدیوں کے کیمپ میں مصائب و آلام برداشت کرتے رہے۔ بہت سے جنگی قیدیوں کی بھارتی حکام نے برین واشنگ کر دی تھی۔ حمود الرحمٰن کمیشن نے ان 72 جنگی قیدیوں سے مشرقی پاکستان میں پاکستان کی مسلح افواج کے کردار' ہنگاموں میں ان کے رول' مکتی باہنی اور بھارت کی حملہ آور فوجوں کے ساتھ مقابلے میں پاکستان آرمی افسروں کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ کمیشن کے ارکان نے بہت سے سینئر افسروں کے بیانات کے دوران تفصیل سے جرح کی۔ اس کی روشنی میں حمود الرحمٰن کمیشن نے 223 صفحات پر مشتمل ضمنی رپورٹ (سپلیمنٹری) اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پیش کی۔ کمیشن نے کارروائی بند کمرے میں کی۔ 26 دسمبر 1971ء سے 26 اپریل 1972 تک کمیشن نے 213 افراد کی شہادتیں ریکارڈ کیں ان میں آرمی کے حاضر سروس 61 افسر 27 ریٹائرڈ افسر' فضائیہ کے 39 حاضر سروس' چھ ریٹائرڈ افسر' تین صحافی' 10 عام شخصیات شامل ہیں ان کی شہادتیں 4 ہزار صفحات پر لکھی گئیں 374 دستاویزات ان کے ساتھ منسلک تھیں۔ صدر بھٹو کے خصوصی معاون رفیع رضا نے بھٹو کا موقف کمیشن کو لکھوایا۔ کمیشن کی رپورٹ کے علاوہ اس کا متعلقہ ریکارڈ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں 456 صفحات کی رپورٹ ہے۔ دوسری جلد اسٹاف اسٹڈیز کی ہے۔ تیسری جلد تحریری بیانات پر محیط ہے۔ چوتھی جلد میں شہادتوں کا متن ہے۔ کمیشن کی رپورٹ شائع کی گئی ہے مگر باقی جلدیں ابھی تک "ٹاپ سیکرٹ" ہیں۔

چھ نکات تخلیق کنندہ کون تھا؟

حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ میں عوامی لیگ کے چھ نکات کی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے۔ رپورٹ کے صفحہ 427 میں کمیشن نے لکھا ہے کہ بعض افراد کی رائے کے مطابق شیخ مجیب اس قدر ذہنی صلاحیت کے مالک نہ تھے کہ وہ تن تنہا ان نکات کا مسودہ تیار کر لیتے۔ بعض کی رائے میں چھ نکات کی تیاری میں غیر ملکی ہاتھ تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ یہ چھ نکات مشرقی پاکستان

سے تعلق رکھنے والے بعض نوجوان سی ایس پی افسروں کی کارستانی تھے۔ ایک رائے یہ بھی ظاہر کی گئی کہ اصل میں صدر ایوب خان کے معتمد سی ایس پی افسروں نے خود صدر کے اشارے پر سیاسی جماعتوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے یہ نکات تیار کئے تھے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چھ نکات جن کا باقاعدہ اعلان ایک اخباری کانفرنس میں کیا گیا اور اس کے نتیجے میں تحریک بحالی جمہوریت کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ چھ نکات کا اعلان سب سے پہلے 5 جنوری 1966ء کو شیخ مجیب نے لاہور کی پریس کانفرنس میں کیا تھا۔

عوامی لیگ کو اقتدار ملتا تو ملک بچ جاتا

کمیشن رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 17 جنوری 1971ء کو جنگ بندی کی بھارتی پیش کش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا' اس وقت نہ صرف مشرقی پاکستان پر بھارتی فوج نے قبضہ کرلیا تھا بلکہ مغربی پاکستان کے اس محاذ پر بھی بھارتی فوج نے جنگی اہمیت کی کامیابیاں حاصل کرلی تھیں جسے ہم نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق کھولا تھا۔ ان حالات میں 17 دسمبر 1971ء کو جنگ بندی قبول کرنے کا فیصلہ درست طور پر کیا گیا۔ مغربی محاذ کھولے جانے سے پاکستان کو قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اس کا الٹا نقصان مشرقی پاکستان پر بھارتی حملوں کی شدت میں اضافے کی شکل میں پہنچا۔ رپورٹ کے مطابق جنرل یحییٰ خان نے کمیشن کے روبرو کہا کہ مغربی محاذ سے بھارت پر حملہ اس لئے کامیاب نہیں ہوا کیونکہ پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خان نے پاکستان آرمی کو ضروری سپورٹ مہیا نہیں کی' اس کے برعکس ایئر مارشل رحیم خان نے کمیشن کو آکر بتایا کہ انہوں نے پاکستان آرمی کو ''بھٹنڈا'' تک پیش قدمی کرنے کے لئے فضائیہ کی سپورٹ دینے کا کہا تھا اور یہ سپورٹ مہیا کی گئی۔ اس سے آگے پاکستان آرمی کو سپورٹ کی فراہمی اس امر سے مشروط تھی کہ اس وقت تک پاکستان آرمی مشرقی پنجاب میں ''سرسہ'' کو فتح کرلے گی مگر پاکستان آرمی ''سرسہ'' کو فتح کرنے میں ناکام رہی۔

کمیشن رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو عام انتخابات میں سامنے آنے والی دو سب سے بڑی سیاسی جماعتوں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہوں شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو میں ربط ضبط ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے ان دونوں اکثریتی جماعتوں کے لیڈروں کی مشترکہ ملاقات کو ہمیشہ

ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ جنرل یحییٰ خان سب سے بڑی سیاسی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار دے دیتے تو شاید پاکستان نہ ٹوٹتا۔ اس صورت میں بھٹو کو اپوزیشن میں بیٹھنا پڑتا۔ مگر یحییٰ خان نے اکٹھے مجیب اور بھٹو سے ملاقات نہیں کی۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ایک موقع پر جب صدر یحییٰ خان نے پہلے شیخ مجیب سے ملاقات کی اس کے فوراً بعد بھٹو سے ملاقات کی۔ مجیب ملاقات کے بعد باہر نکلے اور ابھی بھٹو کو اندر نہیں بلایا گیا تھا تو بھٹو اور مجیب چند منٹوں کے لئے برآمدے میں اکٹھے ہوئے وہ ایک دوسرے کا صرف حال احوال ہی پوچھ پائے تھے کہ جنرل یحییٰ خان نے کمرے کے اندر سے کہا ''یہ کو برڈز کیا چونچیں ملا رہے ہیں''۔

یحییٰ خان کو متوقع وزیراعظم شیخ مجیب اور متوقع اپوزیشن لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان غیر رسمی گفتگو بھی ایک آنکھ نہ بھائی۔

لاکھوں اپنے ہی وطن میں مہاجر

رپورٹ میں دسمبر 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران کور ون کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان، 18 ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ، 15 ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل عابد زاہد سمیت متعدد جرنیلوں پر غفلت اور دوسرے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ پر جو اٹھارہویں ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں الزام لگایا گیا کہ وہ راجستھان سیکٹر میں بھارتی شہر رام گڑھ اور اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی غفلت نااہلی اور ناقص منصوبہ بندی سے پاکستان کو موٹر گاڑیوں اور سامان حرب کا بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔ کور ون کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان پر انکوائری کمیشن نے الزام لگایا کہ انہوں نے وطن عزیز کے دفاع میں دانستہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی غفلت کا ہی نتیجہ تھا کہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل شکر گڑھ کے پانچ سو سے زائد دیہات پر بغیر کسی لڑائی کے بھارتی فوج نے قبضہ کر لیا۔ لاکھوں پاکستانی اپنے ہی وطن میں مہاجر بنا دیئے گئے۔ ان کی غفلت سے پاکستان کے جوابی حملے کی صلاحیت متاثر ہوئی کیونکہ تقریباً 144 مربع میل علاقے پر دشمن کے قبضے کی وجہ سے پاکستان آرمی اپنے ہی علاقے پر گولہ باری نہیں کر سکتی تھی۔ پندرہویں ڈویژن کے جی او سی میجر جنرل عابد زاہد کو تحقیقات کرنے والے کمیشن نے پاکستان کے 96 دیہات دشمن کے لئے تر نوالہ بنائے جانے کا ذمہ دار قرار دیا۔

ستم کی بات یہ تھی کہ جنرل عابد زاہد نے مغربی پاکستان کے 96 دیہات پر بھارت کے قبضے کو جی ایچ کیو سے چھپائے رکھا۔ رپورٹ میں میجر جنرل رحیم خان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کے علاقے چاند پور میں 8 دسمبر کو ہی اپنے زیر کمان 39 ویں ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر خالی کر دیا۔

☆☆☆

ایوان صدر چکلہ بن گیا تھا

رپورٹ میں پاکستان آرمی کی فوجی ناکامیوں' درجنوں جرنیلوں' لیفٹیننٹ جنرلوں' میجر بریگیڈئروں کی عیاشیوں' غفلت مجرمانہ کرپشن کی تحقیقات کی روداد بیان کی گئی ہے۔ بزدلی دکھانے پیشہ ورانہ نااہلی اور اخلاقی بدکرداری سے ملک کو شکست سے دوچار کرانے اور شرمناک انداز میں بھارتی ایسٹ کمان کے کمانڈر لیفٹیننٹ اروڑہ کے سامنے ڈھاکہ اسٹیڈیم میں ہتھیار ڈالنے پر سابق صدر جنرل محمد یحییٰ خان' ایسٹرن کور کے کمانڈر جنرل لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی' چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید' جی ایچ کیو فارمیشن کے کور کمانڈروں لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ' لیفٹیننٹ جنرل گل حسن' میجر جنرل عمر' میجر جنرل مٹھا' لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان' میجر جنرل عابد زاہد' میجر جنرل بی ایم مصطفیٰ' میجر جنرل اے کے جمشید' میجر جنرل ابراہیم خان' وغیرہ کورٹ مارشل کرنے کی سفارشات کیں۔ رپورٹ میں پاکستان کی شکست میں بعض اخلاق سوز واقعات کو بھی ذمہ دار قرار دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان اور ان کے ہم نوالہ ہم پیالہ جرنیلوں کے ساتھ فلمی گلوکاراؤں' فلم ایکٹرسوں دوسرے فوجی افسروں جوانوں' سیاستدانوں کی بیگمات' بیٹیوں' بہنوں کے جائز ناجائز مراسم کا بھی رپورٹ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا کہ مذکورہ جرنیل نہ صرف اپنے ماتحت سینئر فوجی افسروں بلکہ جونیئر فوجی افسروں کی بیگمات سے بھی راہ و رسم رکھتے تھے۔ ملکہ ترنم نور جہاں' شیخ حسینہ' اقلیم اختر رانی' شبنم' شگفتہ' ترانہ' نغمہ' سردار خضر حیات ٹوانہ کی اہلیہ' کراچی راولپنڈی ڈھاکہ لاہور وغیرہ کی بڑی بڑی شخصیات کی بیگمات کہ جن کی تعداد چار سو سے زائد ہے کے نام رپورٹ میں شائع کیے گئے ہیں۔ بعض جرنیل اور فوجی افسر اپنی بیگمات اور عزیز خواتین کو اپنے ساتھ ایوان صدر لے جایا کرتے تھے اور اپنی خواتین کو چھوڑ کر اکیلے ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ رپورٹ میں ایوان صدر راولپنڈی

اور ایوان صدر کراچی میں اکثر آنے جانے والی خواتین کے نام درج ہیں جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ رپورٹ کے صفحہ 387 سے صفحہ 399 تک یحییٰ خان کے ساتھ وقت گزارنے والی پانچ سو سے زائد خواتین کی فہرست دی گئی ہے۔ شراب اور عورتوں کے کلب ایوان صدر کراچی اور ایوان صدر راولپنڈی کے اندر قائم تھے۔ جنگ کے دنوں میں زیادہ تر وقت عورتوں کے ساتھ گزارا جاتا۔ جنرل یحییٰ نے دفتر جانا بند کر دیا تھا۔ 28 نومبر کو شراب میں مخمور جنرل یحییٰ کو کھینچ کر ان کے ساتھی جی ایچ کیو کے سنٹر کنٹرول روم میں لائے۔ یحییٰ کے علاوہ جنرل حمید، جنرل نیازی، جنرل خداداد کی بھی عورتوں سے دوستی تھی۔ رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی بیگم شمیم کے این حسین سے لے کر ایک جونیئر پولیس آفیسر کی بیوی نازلی بیگم، کراچی کے بزنس مین کی بیوی منصور پرچی، مسماۃ زینب، میجر جنرل (ر) لطیف خان کی بیوی، سر خضر حیات ٹوانہ کی بیوی، زینب ملک ڈھاکہ کی فنکارہ خورشیدہ بیگم، ڈھاکہ کی لیلیٰ خان، لیلیٰ مزل سمیت درجنوں خواتین کی یحییٰ خان اور ان کے رفقا سے دوستی تھی۔ صدر یحییٰ کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل عاشق اے ڈی سی سکواڈرن لیڈر ارشد اور اے ڈی سی لیفٹیننٹ کمانڈر خالد شیخ نے انکوائری کمیشن کو بتایا کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی یلغار کے بعد نومبر 1971 میں مشرقی پاکستان کے حالات دگرگوں ہونے لگے اس کے باوجود بری شہرت رکھنے والی خواتین کی ایوان صدر یاترا بند نہ کی گئی یہ خواتین سر شام ایوان صدر آتیں اور صبح سویرے کہیں واپس جاتیں۔ جنرل یحییٰ خان نے اس دوران تین دن تین راتیں گورنر ہاؤس میں ہی گزاریں وہاں دو راتیں مادام نور جہاں دو تین بار روز آتیں رات کو آ کر صبح واپس جاتیں نہا دھو کر کپڑے بدل کر پھر واپس آ جاتیں۔ بیگم شمیم کے این حسین کے ساتھ جنرل یحییٰ ایک خصوصی جگہ ملا کرتے تھے۔ یحییٰ خان بیگم شمیم کے پروانے تھے ڈنر کے لئے اس کے ساتھ باہر نکل جاتے یحییٰ خان نے بیگم شمیم کے خاوند کو سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا میں سفیر مقرر کیا۔ شمیم کے والد کی عمر 70 سال ہونے کے باوجود اسے نیشنل شپنگ کارپوریشن کا چیئرمین بنا دیا۔ یحییٰ خان کی محبوبہ نازلی بیگم کو حکم کے باوجود ٹیکسٹائل مل لگانے کا قرضہ نہ دینے پر بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر کو برطرف کر دیا گیا۔ بعض ادھیڑ عمر کی خواتین اپنی مارکیٹ قائم رکھنے کے لئے اپنے ساتھ نصف نصف درجن جواں سال لڑکیاں لایا کرتی تھیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید زمین، زن اور زر میں یحییٰ خان کے پارٹنر تھے۔ دونوں اکثر اکٹھے ایوان صدر سے غائب ہو جاتے ہار لے سٹریٹ میں یحییٰ

خان کے گھر عورتوں سے ملا کرتے تھے۔ رپورٹ کے مطابق لاہور میں سی نور بنا ہوم کی آڑ میں عورتوں کا دھندہ کرنے والی سعیدہ بخاری جنرل اے اے کے نیازی کے ٹاؤٹ کے طور پر یہ کام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ شمیم فردوس بھی جنرل نیازی کی ٹاؤٹ تھی۔ عبدالحفیظ کاردار نے کمیشن کو بتایا کہ جنرل نیازی دھان منڈی ڈھاکہ کے بنگلوں میں عورتوں سے ملنے جایا کرتے تھے۔ جنرل نیازی اور کور کمانڈر کے لئے پیشہ ور رقاصائیں لائی جاتی تھیں۔ جنرل نیازی اپنی سٹاف فلیگ کار میں بھی عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کو تحقیقات کے دوران بتایا گیا کہ بریگیڈئر حیات اللہ مقبول پور سیکٹر میں تعینات تھا۔ بارہ دسمبر کی رات کو بریگیڈئر حیات اللہ اپنے بنکر میں اس وقت عورت کے ساتھ مصروف تھا کہ اس سیکٹر میں گولہ باری شروع ہو گئی اس پر فوجیوں نے احتجاج کیا۔ واقعہ کی اطلاع جی ایچ کیو تک گئی۔ انکوائری کے نتائج صیغہ راز میں رکھے گئے کمیشن کو بھی نہیں بتائے گئے۔ جنرل یحییٰ کے ساتھ ایوان صدر کراچی اور ایوان صدر راولپنڈی میں وقت گزارنے والی خواتین میں بازار حسن اور فلمی دنیا کی خواتین سے لے کر جرنیلوں اور سینئر سرکاری عہدیداروں کی بیگمات بہنیں بیٹیاں بھی شامل بتائی گئی ہیں۔ جنرل یحییٰ خان کو متعدد جرنیلوں اور بریگیڈئروں کی بیگمات بے حد پسند تھیں۔

رپورٹ کے صفحہ 400 سے لے کر صفحہ 406 تک ان نامی گرامی بیگمات کے نام شائع کئے گئے ہیں جو پریذیڈنٹ ہاؤس کراچی میں آتی جاتی تھیں۔

بیگمات کے نام یہ ہیں۔ مسز حمید، مسز شیرازی، مسز بلگرامی مع دو خواتین، بیگم حامد، مسز احمد حسین، یونیفارم میں لیڈی کیپٹن، بیگم ایم ایم آغا، بلگرامی مع دو خواتین، یوسف جھاوا مع خاتون، سعید زمان بمعہ بیگم سعید، عثمان امین الدین مع بیگم اور چند بیگمات، لیفٹیننٹ نعیم مع بیگم، سجاد عباس مع بیگم، عائشہ، بیگم احسن، بیگم حمید، عمر مع بیگمات، جاوید مرزا مع بیگم، بسم اللہ بیگم، زہریٰ شیرازی، مسز تصور، رضیہ نظام، بیگم شفیق عثمان، بیگم احمد شیرازی، مسز لیفٹیننٹ نعیم احمد، بیگم روشن آرا، بیگم کرنل سہگل، بیگم روشن حمید، بیگم شیر علی، بیگم مجید اللہ، بیگم یوسف، صدر الدین مع بہن و بیگم، بیگم مقصود، بیگم شاہ جی، یو ایس اے سعید کموڈور مع بیگم، بیگم عبدالقادر، بیگم کرنل شیخ، بیگم کموڈور سعید اللہ، بیگم امین اللہ، بیگم مراد، بیگم سلیمان قریشی، بیگم ڈاکٹر غلام حیدر، بیگم حسن محمود، ڈاکٹر عالیہ امام، بیگم حسنین، بیگم انعام الرحمٰن، بیگم نفیسہ قریشی، زہرہ بیگم، حمزہ بیگم، جان بیگم، بیگم خانم، بیگم انور، بیگم رضیہ حسن، (اکٹھی جانے والی بیگم شیرازی بیگم انور) بیگم حمید، بیگم زہرہ، بیگم قریشی، بیگم کمال حیدر، نواب بیگم جو تا گرہ

لیفٹیننٹ کرنل سبائین کی صاحبزادی' مسماۃ حبیب' ذکیہ' ہاجرہ' عابدہ سلطانہ' منی باجی' منیر حسین مع دو خواتین' بیگم لیفٹیننٹ اے اے شیخ' بیگم انور عیسیٰ' بیگم چوہدری سجاد' مسز لیلیٰ مزمل' نامعلوم بیگم' بیگم شمیم' بیگم کے این حسین' لیڈی ڈاکٹر مسز میسی' بیگم اے آر خاں' بیگم خضر حیات' انوری بیگم' بیگم جنرل ریاض' ملکہ ترنم نور جہاں اینڈ پارٹی' نوابزادہ حامد علی مع بیگم' مسماۃ اختری آفتاب' مسز نیلوفر' بیگم حبیب' بیگم ایڈمرل یو اے سعید' بیگم اسلام نبی' بیگم سمیع بیگم ڈھاکا' مسز زری' ملکہ ترنم نور جہاں کی دو بیٹیاں' بیگم ونگ کمانڈر سعید۔

سفارتی محاذ پر ناکامی

رپورٹ کے باب گیارہ صفحہ 225 کے پیراگراف نمبر 63 میں کہا گیا ہے کہ جب کمیشن نے سابق صدر یحییٰ خان سے استفسار کیا کہ انہوں نے 21 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر بھارت کی طرف سے حملہ ہونے کے باوجود مشرقی پاکستان میں پیدا شدہ مسئلے کو سیکورٹی کونسل میں کیوں پیش نہیں کیا تو جنرل یحییٰ خان نے جواب دیا کہ ان کے پیش نظر اکتوبر 1971ء میں امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کا دیا گیا وہ جواب تھا جو انہوں نے پاکستان کے صدر کے پیغام پر پاکستان کے امریکہ کے دورے پر گئے ہوئے ایڈیشنل فارن سیکرٹری کو دیا تھا اس جواب میں امریکی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ موجودہ وقت مشرقی پاکستان کا مسئلہ سیکورٹی کونسل میں اٹھانے کے لئے سازگار نہیں ہے۔ کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ صدر یحییٰ خان کا یہ جواب 21 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ ہونے سے پیدا شدہ صورت حال کے عین مطابق نہیں تھا۔ اس وقت روسی ویٹو کے پیشگی خوف کی بنا پر مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کی طرف سیکورٹی کونسل کی توجہ مبذول نہ کرانا غیر دانشمندانہ تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سلامتی کونسل کے باقی ممبر مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے سے پیدا شدہ صورت حال پر غور و خوض کے لئے تیار نہیں تھے یا وہ پاکستان کے کاز کی حمایت کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے کیونکہ جنرل یحییٰ خان نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے جو بار بار پیغامات بھجوائے اس کا سیکرٹری جنرل نے جواب تو دیا لیکن یہ بات واضح ہوگئی کہ یو این سیکرٹری جنرل او تھان اپنے طور پر کوئی ایکشن لینے سے قاصر تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے پیراگراف 64 صفحہ 225 پر یہ رائے دی ہے کہ حقائق اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ جنرل یحییٰ خان 21 نومبر 1971ء کو بھارت کی طرف سے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملے کے فوری بعد اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا

اجلاس بلانے میں ناکام رہے۔ پاکستان کے اقوام متحدہ میں تعینات سفیر آغا شاہی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ جارحیت کا شکار بننے والے (ملک) نے سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ نہ کیا ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل یحییٰ کو سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کرنے سے ہچکچاہٹ دو وجوہ کی بنا پر تھی:

(1) ان کو خدشہ تھا کہ بین الاقوامی برادری اس مسئلے کے سیاسی حل کے لئے زور ڈالے گی۔ عالمی برادری شیخ مجیب سمیت صوبے کے منتخب نمائندوں کے ساتھ سیاسی تصفیے کے لئے کہے گی۔

(2) دوسرے یحییٰ خان اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ پاک آرمی مغربی محاذ پر مختصر مدت میں کامیابیاں حاصل کر لے گی۔ اس طرح دونوں محاذوں پر سیز فائر کی صورت میں پاکستان کو سودے بازی کی مضبوط پوزیشن حاصل ہو جائے گی۔

مشرقی پاکستان میں اقوام متحدہ کے رول کے بارے میں حمودالرحمٰن کمیشن نے نیویارک میں پاکستان کے سفیر آغا شاہی سے استدعا کی کہ وہ مشرقی پاکستان کے بحران سے اس کے سقوط تک کی یو این او کی مختلف کارروائیوں اور واقعات کی مصدقہ رپورٹ تیار کر کے بھجوائیں۔

آغا شاہی نے کمال مہربانی سے **مفصل** رپورٹ بھجوادی جو واضح طور پر امریکہ، سوویت یونین، چین، برطانیہ، فرانس اور افروایشیائی ممالک کے کردار کو اجاگر کرتی ہے۔ جنرل اسمبلی میں اگرچہ 104 ممالک نے پاکستان کی اقوام متحدہ میں مشرقی پاکستان کے معاملے پر حمایت کی لیکن روس کی طرف سے بار بار ویٹو کئے جانے سے سیکورٹی کونسل پاکستان کو دولخت ہونے سے نہ بچا سکی۔ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ کا یو این او کے بارے میں پیراگراف نمبر 2 حذف کیا گیا ہے۔

جب مارچ 1971ء میں مشرقی پاکستان کا بحران شروع ہوا تو حکومت پاکستان نے اسے اپنا اندرونی معاملہ قرار دیا اور اسے اقوام متحدہ کی سیاسی حتیٰ کہ انسانی مداخلت سے ماورئی قرار دیا۔ اس مؤقف میں پاکستان نے بعد میں تبدیلی کر لی اور اقوام متحدہ سے انسانی بنیادوں پر امداد قبول کر لی۔

اس مؤقف کے مطابق اقوام متحدہ میں پاکستانی مشن مارچ 1971ء سے جولائی

1971ء تک اقوام متحدہ کی سیاسی مداخلت روکنے میں کامیاب رہا کیونکہ بھارت نے شروع میں سیکورٹی کونسل میں مداخلت کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد بھارت نے یہ مسئلہ اکنامک اینڈ سوشل کونسل میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے اٹھایا لیکن کچھ ممبران کی حمایت کے باوجود بھارت پاکستان کے خلاف قرارداد پاس کرانے میں ناکام رہا۔

لیکن بحران کی نوعیت خاص طور پر وسیع پیمانے پر ہلاکتوں اور مہاجرین کی آمد کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی صورت حال بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے مؤقف کی مقبولیت کم ہوتی گئی اور رائے عامہ ہمارے خلاف ہوتی چلی گئی۔ 30 جون 1971ء کو پرنس صدرالدین آغا خان، جو کہ یو این او کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین تھے، نے برسرعام مشرقی پاکستان کے بحران کا سیاسی حل تلاش کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ 20 جولائی 1971ء کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے جو پہلے ہی سے ایسٹ پاکستان میں انسانی مسئلے کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کر چکے تھے ایک خفیہ میمورنڈم سلامتی کونسل کے صدر کو بھیجا۔ اس میمورنڈم میں مشرقی پاکستان کے بحران کے سیاسی اثرات ونفوذ اور عالمی امن کو لاحق خطرات کو اجاگر کیا گیا۔

اس مرحلے پر شروع میں حکومت پاکستان سیکورٹی کونسل کی مداخلت کی مخالفت کرتی رہی لیکن کچھ ہی دنوں میں حکومت نے اپنا مؤقف تبدیل کر ڈالا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سیکورٹی کونسل کی میٹنگ لڑائی روکنے کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن سیکورٹی کونسل کے ممبران اپنے طور پر اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ حکومت پاکستان نے اس موقع پر غور کے لئے سلامتی کونسل سے کوئی باضابطہ درخواست نہیں کی تھی۔ سلامتی کونسل کے ارکان بھارت اور پاکستان کے شدید اختلافات کے پیش نظر اپنے اجلاس کو ثمر آور نہیں سمجھتے تھے۔

اس صورت حال میں حکومت پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ سیکورٹی کونسل کی کمیٹی بھارت اور پاکستان کا دورہ کرے لیکن یہ تجویز کچھ غیر مستقل ممبران کی حمایت کے باوجود مستقل ممبران نے قبول نہ کی اور روس نے اسے کھلے عام مسترد کر دیا۔

بیس اکتوبر کو یو این او کے سیکرٹری جنرل نے بھارت اور پاکستان پر اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کی پیش کش کر دی۔ سابق صدر یحییٰ خان نے 23 اکتوبر 1971ء کے اپنے جواب میں اس پیش کش کا خیر مقدم کیا اور تجویز دی کہ دونوں ملکوں کی افواج باہمی اتفاق کے

ساتھ ایک دوسرے کے سامنے رہنے کی بجائے طے شدہ فاصلے پر واپس چلی جائیں۔ بھارت نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اس طرح کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

اس کے بعد فریقین کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک حکومت پاکستان سیکرٹری جنرل سے ضروری اقدامات کرنے کی بار بار استدعا کرتی رہی لیکن سیکریٹری جنرل سلامتی کونسل کی ہدایت کے بغیر کچھ نہ کر سکے۔

پاکستان کیس ہار چکا تھا

جنگ کے متعلق اقوام متحدہ کی کارروائی چار مراحل میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا مرحلہ 21 نومبر سے 3 دسمبر 1971ء تک ہے۔ دوسرا مرحلہ 3 دسمبر سے 10 دسمبر کا ہے جب میجر جنرل راؤ فرمان کا پیغام اقوام متحدہ میں ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا گیا۔ تیسرا مرحلہ 10 دسمبر سے 17 دسمبر اور چوتھا مرحلہ 17 دسمبر کو لڑائی کے خاتمہ سے 21 دسمبر تک ہے جب سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر 307 پاس کی۔

حکومت نے سلامتی کونسل کے اجلاس کے لئے کوئی استدعا نہیں کی اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ کونسل کوئی ناقابل قبول سیاسی حل حکومت پاکستان کے سر پر نہ تھوپ دے۔

بھارت نے مشرقی پاکستان میں مداخلت شروع کر دی۔ بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان پر جھڑپیں تیز کر دیں حتیٰ کے بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارت کا مؤقف تھا کہ پاکستان کی فوجیں مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نسل کشی کر رہی ہیں اور سیاسی حل کے بغیر بھارت میں موجود مشرقی پاکستان کے مہاجرین واپس نہیں جاسکتے۔ تیسرا الزام یہ تھا کہ پاکستان نے مغربی محاذ پر کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔

سوویت یونین کے ویٹو کا مسلسل استعمال بحران کے سیاسی حل کو مؤخر کرتا رہا۔

7۔ دسمبر کو جنرل اسمبلی نے 104 ووٹوں کی حمایت سے قرارداد نمبر 2793 پاس کی۔

(16) دوسرے مرحلے کے دوران پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں جنرل اسمبلی میں بھاری حمایت حاصل ہوئی۔

لیکن یہ حمایت اس وقت بے سود ثابت ہوئی جب 10 دسمبر کو گورنر مشرقی پاکستان کے مشیر میجر جنرل راؤ فرمان علی نے ڈھاکہ میں یو این او کے سیکرٹری جنرل کے نمائندے مسٹر

پال مرے ہنری کے حوالے سے ایک پیغام دیا۔ اس پیغام کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمالک نے ایک نیا پیغام دے دیا جس میں جنرل فرمان علی کے پیغام پر غور نہ کرنے کا کہا گیا۔ ان دونوں پیغامات سے یہ واضح ہو گیا کہ پاکستان بھارتی جارحیت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس وقت پاکستان نے اپنا کیس ہار دیا۔

گورنر عبدالمالک اور ان کے مشیر راؤ فرمان علی کی تجاویز 10 دسمبر 1971ء کو اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو نیویارک میں آمد پر پہنچا دی گئیں۔ اس پر صدر یحییٰ خان کو نیویارک سے یہ ٹیلی گرام دیا گیا "فرمان علی کی پیشکش کا مطلب پورے پاکستان کا خاتمہ ہوگا" اور وہ اس قدر ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے کی تجویز پر عملدرآمد میں شریک نہیں ہوں گے۔ وزیر خارجہ بھٹو نے اس مرحلے پر صدر یحییٰ خان سے کہا "یحییٰ خان صاحب! پاکستان سے میری روانگی سے قبل ہم نے جو صلاح مشورے کئے اس لائن آف ایکشن کے مطابق آپ دلجمعی سے کام کریں" بعد کے پیغامات میں یحییٰ خان نے تجویز کیا کہ چینی اور امریکی وفود کو اس امر پر راضی کریں کہ وہ رکیں اور اگر ممکن ہو تو ایک ہفتے کے لئے گراؤنڈ پر ہماری ملٹری پوزیشن کو بہتر کر دیں۔

12۔ دسمبر 1971ء کو وزیر خارجہ بھٹو نے امریکی اور چینی وفود کے سینئر افراد سے صلاح مشورے کئے۔ یہ طے پایا کہ سلامتی کونسل کا اجلاس فوراً بلا لیا جائے اور جنرل اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد جیسی قرارداد منظور کرالی جائے جب روس اسے ویٹو کر دے تو جنگ بندی کی سادہ قرارداد پیش کر دی جائے۔

وزیر خارجہ بھٹو کے پیغامات پر صدر یحییٰ خان نے کہا کہ راؤ فرمان علی کی غلطی کو ابتداء سے ختم کر دیا گیا ہے اور صدر کی اپنی پیشکش صرف جنگ بندی تک محدود رکھی گئی ہے بعد ازاں جنگ بندی کی صدارتی تجویز بھی واپس لے لی گئی کمیشن کے روبرو یحییٰ نے کہا۔ "ایک ہفتے تک ملٹری کو کارروائی سے روکنا ہماری پوزیشن کے لئے مہلک ہوتا۔ یحییٰ خان کے ٹیلی گرام "تیز ترین ایکشن"، یعنی جنگ بندی کے لئے آ رہے تھے ایک دوسرے ٹیلی گرام میں صدر یحییٰ خان نے کہا کہ وہ امریکہ اور چین کے وفود کے ساتھ طے کئے گئے اقدامات (TACTICS) سے متفق ہیں۔

12۔ دسمبر کو مایوس کن صورت حال میں وزیر خارجہ بھٹو نے صدر یحییٰ کو آخری کوشش کے طور پر چین جانے کے لئے کہا تا کہ ملک بچانے کے لئے چین کی مؤثر مداخلت کرائی جائے۔

سلامتی کونسل کے 12 دسمبر کے اجلاس میں بھارتی وزیر خارجہ نے ''بنگلہ دیش'' کے نمائندے کو مدعو کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ بھٹو نے کہا'' ریاستوں کو ان کی غلطیوں کی سزا نہیں ملنی چاہئے۔'' بھٹو نے یاد دلایا کہ سوویت نمائندے نے وعدہ کیا تھا کہ سوویت یونین پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا لیکن روس کے بھارت کے ساتھ معاہدے نے اس وعدے کو جھٹلا دیا۔

12 دسمبر کے اجلاس کے بعد سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی کارروائیوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ کسی ایسی قرارداد کو سوویت یونین پاس نہیں ہونے دے گا جس میں جنگ بندی کو مشرقی پاکستان سے سیاسی سمجھوتے سے مشروط نہ کیا گیا ہو۔ پاکستان حکومت کی یہ خواہش کہ صرف سادہ جنگ بندی ہو جائے اس مرحلے پر غیر حقیقت پسندانہ تھی۔ اسی پس منظر میں امریکہ کی قرارداد جو کہ جنرل اسمبلی کی قرارداد 2793 کی نقل تھی کو روس نے ویٹو کر دیا۔ جب تیسری قرارداد بھی روس نے ویٹو کر دی تو برطانوی اور فرانسیسی وفود نے امریکہ پر تنقید شروع کر دی کہ امریکہ ایسی قرارداد پیش کرنے پر کیوں مصر ہے جسے روس ویٹو کر دیتا ہے۔

برطانیہ اور فرانس کے مندوبین نے اعلان کیا کہ وہ ایک ایسا فارمولا وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی بنیاد درج ذیل امور پر ہو۔

(1) جنگی کارروائیوں کا خاتمہ۔

(2) فوجوں کی علیحدگی۔

(3) انصاف جس کا مطلب سیاسی سمجھوتہ تھا۔

یہ بھی ظاہر ہونے لگا کہ اصل میں برطانیہ' فرانس اور ان کے ساتھی ممالک سقوط ڈھاکہ کے منتظر تھے تاکہ پاکستان کو سیاسی سمجھوتے والی قرارداد تسلیم کرنے پر مجبور کر کے سوویت یونین اور بھارت سے بھی اسے منوایا جائے جب بھارت کی طرف سے پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے کے لئے پیغامات کی اطلاعات پہنچیں تو فرانسیسی اور برطانوی مندوبین نے ایک ایسی قرارداد کا مسودہ پیش کرنے پر غور شروع کیا جو درج ذیل امور پر مشتمل تھا:

(1) مغربی محاذ پر مکمل فائر بندی اور 1965ء کی کشمیر کی جنگ بندی لائن کی بحالی۔

(2) مشرقی سیکٹر میں کمانڈروں کی باہمی مشاورت کے ساتھ مکمل فائر بندی۔

(3) مشرقی پاکستان کے مسئلے کا وہاں کے منتخب نمائندوں کی مدد سے عوامی خواہشات کے

مطابق حل۔

(4) یو این سیکرٹری جنرل کی طرف سے اس سلسلے میں کردار ادا کئے جانے کی دونوں حکومتوں کی طرف سے توثیق۔

ہم جب مذکورہ قرارداد کے مسودے میں ترامیم کے لئے کوشش کر رہے تھے کہ نیویارک میں ہمیں اطلاعات ملیں کہ لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی نے مشرقی پاکستان میں جنگ بندی کے لئے بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل مانک شا سے رابطہ کیا ہے اس طرح مشرق میں پاکستان کی ملٹری پوزیشن کے مکمل خاتمے (COLLAPSE) کی وجہ سے سلامتی کونسل کے ممبروں کے درمیان جاری صلاح مشورے متاثر ہو گئے۔

اس مرحلے پر امریکی وفد نے ہمیں بتایا کہ امریکہ روس کو جنگ بندی کی سادہ قرارداد قبول کرنے پر رضامند نہیں کر سکا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ سلامتی کونسل سے ہم کوئی ایسی قرارداد تسلیم نہیں کرا سکے جس سے پاکستان کی علاقائی یکجہتی محفوظ بنائی جا سکے۔ چیئرمین بھٹو نے کہا کہ ڈھاکہ میں پاکستانی قوم کی تضحیک اقوام متحدہ میں قومی تضحیک نہ بن سکے۔ بھٹو نے کہا کہ وہ بھارتی جارحیت کو قانون قرار دینے میں فریق نہیں بنیں گے اور وہ سلامتی کونسل میں اپنی تقریر مکمل کر کے سلامتی کونسل کے چیمبر سے واک آؤٹ کر گئے۔

بھٹو کے واک آؤٹ کا اثر اس وقت ظاہر ہوا جب سیکورٹی کونسل کے اگلے اجلاس میں کہا گیا کہ چیئرمین بھٹو سلامتی کونسل کی ناکامی کی شکایت کا حق رکھتے تھے۔ اس کے بعد معاملہ جنرل اسمبلی واپس لے جانے کے مشورے ہوئے۔ اس پس منظر میں متعدد قراردادوں کے مسودے تیار کئے گئے ایک قرارداد کا مسودہ پولینڈ نے تیار کیا دوسرا مسودہ فرانس اور برطانیہ نے تیار کیا تیسرا مسودہ شام نے چوتھا روس نے تیار کیا ان تمام میں تنازعے کے سیاسی حل پر زور دیا گیا۔

قراردادیں صرف کاغذوں تک

ان مسودوں میں برطانیہ فرانس کی قرارداد نمبر ایس 10455 سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے جس میں مشرقی اور مغربی محاذ پر فوری جنگ بندی اور جھڑپوں کے خاتمے کا کہا گیا۔ جس وقت ان قراردادوں میں پاکستان کے حق میں ترمیم کی ہم کوشش کر رہے تھے مشرقی پاکستان کے آرمی کمانڈر کی طرف سے جنگ بندی کی درخواست کرنے کی خبریں آ گئیں۔ اس پر برطانوی وفد نے کہا کہ وہ برطانیہ اور فرانس کی قرارداد میں فوجوں کی واپسی کی شق شامل کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

16۔ دسمبر 1971ء کو سابق صدر یحییٰ خان کا ایک ٹیلی گرام چیئرمین بھٹو کو ملا جس میں کہا گیا کہ ہم اینگلو فرنچ قرارداد کو قبول کرلیں صدر یحییٰ کے اس پیغام پر عملدرآمد بھی ہم نہیں کر سکے تھے کہ ہمیں ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط ہو جانے کی رپورٹیں مل گئیں۔ اس بنا پر برطانیہ اور فرانس کے وفود نے اپنی قرارداد پر زور نہیں دیا۔ سلامتی کونسل کے اگلے اجلاس میں بھارتی وزیر خارجہ نے اپنی وزیراعظم اندرا گاندھی کا یک طرفہ جنگ بندی کا بیان پڑھ کر سنایا۔

سوویت یونین نے بھارتی اعلان سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی قرارداد نمبر ایس 10458 کا مسودہ پیش کیا جس میں کہا گیا کہ مشرقی پاکستان کے اندر دسمبر 1970ء کے عام انتخابات میں منتخب ہونے والے قانونی نمائندوں کو بلا رکاوٹ اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

ہماری استدعا پر امریکہ نے جاپان کی مدد سے قرارداد نمبر ایس 10459 ڈویژن-1 پیش کی جس میں کہا گیا کہ:

(1) فریقین مشرقی اور مغربی محاذ پر لڑائی فوراً روک دیں۔ تمام مقبوضہ علاقوں سے اپنی اپنی فوج ہٹالیں۔

(2) فریقین 1949ء کے جنیوا کنونشن پر عملدرآمد کرتے ہوئے جان و مال کا تحفظ کریں زخمی، بیمار اور فوجیوں اور شہری آبادی کا تحفظ کریں۔

(3) سیکرٹری جنرل انسانی مسائل طے کرنے کے لئے خصوصی نمائندے مقرر کریں۔

یہ قرارداد جنگ بندی کے حق میں تھی مگر اس میں تمام محاذوں سے مقبوضہ علاقوں کو خالی کرنے کا کہا گیا تھا۔ روس نے اس کی مخالفت کردی۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا کہ مشرقی پاکستان وہ علاقہ ہے جس پر بھارت نے قبضہ کیا ہے۔

سابق صدر یحییٰ خان نے بھارت کی یک طرفہ جنگ بندی پر پاکستان کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان جمعہ کے روز اڑھائی بجے دوپہر 14-30 جی ایم ٹی کردیا جنرل یحییٰ نے کہا کہ اگر بھارت جنگ بندی میں مخلص ہے تو وہ اقوام متحدہ کی وساطت سے اپنے اعلان کو عملی جامہ پہنائے تاہم بھارت جنگ بندی کے اپنے یک طرفہ اعلان کو عملی جامہ پہنانے میں مخلص نہ رہا۔

سابق صدر یحییٰ خان کے فوری پیغامات ملنے پر چیئرمین بھٹو نیویارک سے واشنگٹن صدر نکسن سے ملنے چلے گئے۔ امریکی صدر سے ملتے ہی چیئرمین بھٹو بذریعہ طیارہ پاکستان واپس پہنچ گئے۔

جنرل مٹھا، جنرل حمید اور بہتی گنگا

رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل یحییٰ، حمید، خداداد، کیانی اور گلزار لاہور کے قریب 1630 ایکڑ اراضی لینے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے صفحہ 377 پر بتایا گیا ہے کہ جنرل یحییٰ خان اور اس کے رفقا نے قومی دولت پر غیر قانونی طریقے سے قبضہ کیا۔ جنرل یحییٰ خان نے 369۔ ایکڑ اراضی لی اس میں سے 133۔ ایکڑ قصور، 186۔ ایکڑ شریف پور اور طوطی اور 150۔ ایکڑ دیہہ بابلو میں بتائی گئی۔

جنرل حمید اینڈ فیملی کی 1361 ایکڑ اراضی میں سے 105 ایکڑ چک نمبر 99 فیروز والا، 60۔ ایکڑ لاہور کے موضع ہارے، 150 ایکڑ زمین لاہور کے موضع اروڑا نیپال میں اور 1046 ایکڑ زمین ہائے میم فارم (حمید مٹھا فارم) تلکونڈی شیر خان، ہربنس پورہ اور عامرہ (فیروز والا) میں ہے اس طرح جنرل مٹھا اور جنرل حمید اکٹھے مل کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے۔

پرانے زخم ہرے ہو گئے

پاکستان کی فوجی حکومت کے ذریعے مسلمان فوج کی سب سے بڑی شکست سے متعلق تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت پر حیرانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ بھٹو حکومت، ضیاالحق حکومت، جونیجو حکومت، بے نظیر حکومت، نواز شریف حکومت اس کے بعد بے نظیر حکومت اور آخری نواز شریف حکومت اور اس دوران بننے والی نگران حکومتوں کے ادوار میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع نہیں کی گئی جبکہ اسے موجودہ جنرل مشرف حکومت سے شائع کرایا گیا ہے۔ رپورٹ کی اشاعت پاکستان کے قومی اداروں کی رہی سہی ساکھ کو بدنام کرنے کے انٹرنیشنل گیم پلان کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ 1999ء کے معرکہ کارگل کی وجہ سے پاکستان آرمی کو جو وقار حاصل ہوا اس رپورٹ کی اشاعت سے اس وقار اور پاکستان آرمی کے مورال کو گزند پہنچنے کا احتمال ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت کے لئے سابق حکومتوں پر عوام اور سیاست دانوں کی طرف سے جتنا دباؤ رہا اس کا عشر عشیر بھی مشرف حکومت پر نہیں پڑا اس کے باوجود رپورٹ ڈی کلاسیفائی کی گئی ہے جس سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان کشیدگی اور تلخی میں اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔ اس سے 28 سال پرانے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے حقیقت پسندی اور حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے رپورٹ تو شائع کر دی لیکن جرأت مندی کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ وہ سانحہ کے ذمہ داروں کے خلاف ایکشن لیں جن میں سے اکثر زندہ ہیں یا سانحہ سے کمائی گئی دولت ان کی اولاد استعمال کر رہی ہے اور سانحہ کے ذمہ دار جن فوجی افسروں نے زمینیں اور پلاٹ حاصل کئے ان کو ضبط کرنا چاہیے تاکہ آئندہ قوم کے وقار کو مجروح کرنے والے اور ان کے خاندان عیش و عشرت کی زندگیاں بسر نہ کر سکیں انہیں نشان عبرت بنانا از حد ضروری ہے۔

حمودالرحمٰن کمیشن کیوں قائم کیا گیا

حکومت پاکستان نے وزارت صدارتی امور کے نوٹیفکیشن نمبر ایس آر او (1) 71 مورخہ 26 دسمبر 1971ء کے ذریعے اس انکوائری کمیشن کو قائم کرتے ہوئے اس کے ذمہ یہ فرائض سونپے تھے کہ وہ ان حالات کی تحقیقات کرے جن کے تحت کمانڈر ایسٹرن کمانڈ اور ان کے زیر کمان پاکستان کی مسلح افواج نے دشمن کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالے بھارت اور مغربی پاکستان کی سرحدوں پر جنگ بندی کے احکامات صادر کئے گئے نیز جموں اور کشمیر کی سیز فائر لائن پر بھی جنگ بندی کا حکم دیا گیا۔

پاکستان کمیشن آف انکوائری ایکٹ مجریہ 1956ء کے تحت قائم ہونے والا یہ کمیشن درج ذیل افراد پر مشتمل تھا:۔

1- مسٹر جسٹس حمودالرحمٰن (ہلال پاکستان)
چیف جسٹس، سپریم کورٹ آف پاکستان بحیثیت صدر۔

2- مسٹر جسٹس انوارالحق، چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ، بحیثیت رکن۔

3- مسٹر جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن، چیف جسٹس سندھ بلوچستان ہائیکورٹ، بحیثیت رکن۔

کمیشن کی سفارشات پر لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر (ریٹائرڈ) کو بحیثیت ملٹری ایڈوائزر اور اسسٹنٹ رجسٹرار سپریم کورٹ آف پاکستان، مسٹر ایم اے لطیف کو بحیثیت سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

کمیشن کے اختیارات

صدارتی امور کی وزارت کی طرف سے مندرجہ ذیل ہدایات دی گئیں جو اس کمیشن کی حیثیت اور اختیارات کی وضاحت کرتی ہیں۔

کمیشن اپنے طریقہ کار کے مطابق کام کرے گا اور اس کی تمام کارروائی خفیہ رکھی جائے گی۔

کمیشن کو اپنی کارروائی کے دوران تینوں مسلح افواج کے نمائندوں کی مدد حاصل رہے گی۔ حکومت پاکستان کے ہر فرد کا یہ فرض ہوگا کہ وہ کمیشن کو جب بھی ضرورت پڑے مطلوبہ تعاون فراہم کرے۔

یہ کمیشن اپنی طے کردہ تاریخ اور مقام پر تحقیقات کا آغاز کرے گا اور تین ماہ کی مدت کے اندر تحقیقات مکمل کرنے کے بعد اپنی مکمل رپورٹ صدر پاکستان کو پیش کر دے گا۔

اس کمیشن کا ایک غیر رسمی اجلاس 31 دسمبر 1971ء کو لاہور میں منعقد ہوا تا کہ تحقیقات کے دائرہ کار اور دیگر ضروری امور و معاملات کا تعین کیا جا سکے۔ اس اجلاس میں کمیشن کا طریقہ کار اور رہنما خطوط بھی طے کئے گئے۔ انتظامی اور مالیاتی امور و مسائل پر بھی غور کیا گیا اور ایک تفصیلی خط وزارت انتظامی امور کو ارسال کیا گیا تا کہ ضروری ساز و سامان، مطلوبہ اسٹاف اور رقم کمیشن کو کام شروع کرنے سے قبل فراہم کی جا سکے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ راولپنڈی میں یہ تحقیقات کی جائیں تا کہ کمیشن کو جنرل ہیڈ کوارٹرز اور دیگر وزارتوں سے مطلوبہ ریکارڈ بآسانی دستیاب ہو سکے۔

چونکہ اس انکوائری کمیشن کی تمام تر کارروائی خفیہ رکھی جانی تھی جس کا کوئی سابقہ تجربہ موجود نہ تھا، چنانچہ سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے کس طرح شروع کیا جائے؟ فیصلہ یہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں پہلے عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ یکم جنوری 1972ء کو ایک پریس ریلیز کے ذریعے عوام اور مسلح افواج سے درخواست کی گئی کہ وہ 10 جنوری 1972ء تک کمیشن کے موضوع کے حوالے سے وہ تمام تر متعلقہ معلومات اور اطلاعات فراہم کریں جو ان کے علم میں ہیں۔

اس کے علاوہ کمیشن نے ان تمام افراد کو جو اس واقعے کے رونما ہونے تک اہم ذمے داریوں پر فائز تھے خطوط اور سوال نامے ارسال کئے تاکہ وہ اس سلسلے میں پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔ مطلوبہ کاغذات معلومات اور دستاویزات کی ایک فہرست بھی مرکزی حکومت کی متعدد وزارتوں کے سیکرٹریوں کو روانہ کی گئی۔ ان اقدامات کا بڑا مثبت اور حوصلہ افزا جواب موصول ہوا اور جلد ہی بہت بڑے پیمانے پر کمیشن سے مختلف رابطوں کا آغاز ہوگیا۔

20 جنوری 1972ء کو کمیشن نے ملک کی 17۔ سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو خطوط ارسال کئے جن میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ تحقیقاتی کمیشن کو زیرِ غور معاملات کے حوالے سے اپنے خیالات' نظریات اور رائے سے آگاہ کریں۔ ان سے یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ کیا وہ ذاتی طور پر یا کسی نمائندے کے ذریعے اس کمیشن کے روبرو پیش ہوکر شہادت دے سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں کافی حد تک تسلی بخش اور مثبت جواب حاصل ہوئے۔ چند سیاسی رہنماؤں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ چونکہ اس انکوائری کا دائرہ کار محض فوجی پہلوؤں تک ہی محدود رہے گا اور تمام تر کارروائی خفیہ طور پر مکمل کی جائے گی لہٰذا وہ کمیشن کی مدد سے معذور ہیں؛ تاہم انہیں بتایا گیا کہ کمیشن کے دائرہ کار کو اس قدر محدود بھی نہیں رکھا جائے گا کہ ان دیگر تمام پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز اور خارج کردیا جائے جو کسی نہ کسی طرح اس انکوائری کمیشن پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ یہ وضاحت سننے کے بعد وہ معاملے کے سیاسی پہلوؤں پر اس کمیشن سے ضروری تعاون پر رضامند ہوگئے جس کے نتیجے میں 23 سیاسی رہنماؤں نے اپنی قیمتی آرا سے کمیشن کو آگاہ کیا۔

دفاعی اور فوجی اہلکاروں کی گواہی

اسی اثنا میں کمیشن کے علم میں یہ بات آئی کہ دفاعی افواج سے تعلق رکھنے والے بیشتر افسران کمیشن کے روبرو پیش ہوکر شہادتیں فراہم کرنا چاہتے ہیں لیکن انہیں خدشہ ہے کہ ایسا کرنے پر انہیں انتقام کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چنانچہ کمیشن نے صدر پاکستان سے رجوع کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ اس امر کی عوامی سطح پر ضمانت دیں کہ کمیشن کے روبرو شہادت دینے والے کسی بھی فرد کو اس سلسلے میں انتقام کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ 11 جنوری 1972ء کے اخبارات میں یہ سرکاری اعلان شائع کردیا گیا کہ کمیشن کی تمام تر کارروائی مکمل طور پر خفیہ رکھی جائے گی اور اس کے روبرو پیش کئے جانے والے تمام بیانات اور گواہوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا جائیگا کہ ایسے افراد کو کسی قسم کے دیوانی یا فوجداری مقدمات کا سامنا نہ کرنا پڑے' تاوقتیکہ ایسے بیانات یا شہادتیں' جھوٹی اور غلط ثابت نہ ہوں۔

کمیشن کی سفارش پر جنرل ہیڈ کوارٹرز نے بھی ایک سرکلر کے ذریعے تمام فوجی اہلکاروں کو مطلع کردیا کہ وہ رضاکارانہ طور پر تحریری بیانات کے ذریعے یا ذاتی طور پر پیش ہوکر کمیشن کے روبرو شہادت دے سکتے ہیں؛ تاہم بعد میں کمیشن نے اس سرکلر کو ناکافی سمجھتے ہوئے مسلح افواج کے سربراہان سے درخواست کی کہ وہ ایسے خطوط جاری کردیں جن میں اس بات کی مکمل ضمانت فراہم کی گئی ہو کہ دفاعی اہلکاروں کو کمیشن کے روبرو پیش ہوکر بیان یا شہادت دینے کے عوض کسی صورت بھی انتقام کا نشانہ بنائے جانے کا خدشہ محسوس نہ ہو چنانچہ مسلح افواج کے سربراہوں کی جانب سے باقاعدہ یقین دہانی کے بعد دفاعی اور فوجی اہلکاروں نے پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ آزادی کے ساتھ کمیشن کو اپنی معلومات سے آگاہ کرنا شروع کردیا۔ بعد ازاں' گواہوں پر جرح کے دوران یا اس کے بعد ایسی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی کہ کسی بھی اہلکار کو انتقام کا نشانہ بنایا گیا ہو ماسوائے ایک نیول آفیسر کی مبینہ شکایت کے جس کی تحقیق نیوی کے حکام کررہے ہیں۔ کمیشن نے بالخصوص اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس سے تعاون کرنے والے کسی بھی فرد کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

15 جنوری 1972ء کو کمیشن نے اپنے ملٹری ایڈوائزر کے ہمراہ قصور کے حسینی

والا سیکٹر کا دورہ کیا اور کور اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز سے بات چیت کی۔ اس کے علاوہ محاذ جنگ پر موجود جوانوں سے بھی ملاقات کی جو اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جنگ کے دوران فوجی آپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟ کمیشن دیگر سیکٹرز کا دورہ بھی کرنا چاہتا تھا، تاہم وقت کی کمی کے باعث ایسا ممکن نہ ہوسکا۔

وزارت صدارتی امور نے اپنے 12 جنوری 1972ء کے خط میں راولپنڈی میں کئے گئے کمیشن کے بیٹھنے کے انتظامات سے مطلع کیا۔ دفتری جگہ اور دیگر ساز و سامان نیشنل ڈیفنس کالج میں فراہم کیا گیا تھا جہاں اسٹاف اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ وزارت خزانہ اب تک بجٹ تجاویز پر غور کرنے میں مشغول تھی؛ تاہم امید تھی کہ کچھ رقم بہت جلد فراہم کردی جائے گی۔

12 جنوری 1972ء کو کمیشن کی معاونت کرنے والے مسلح افواج کے تینوں نمائندوں کے ناموں سے مطلع کیا گیا جو یہ تھے:۔

(i) ائر کموڈور ظفر محمود (پاکستان ائر فورس)

(ii) کرنل صابر حسین قریشی (آرمی)

(iii) کیپٹن اے ولی اللہ (نیوی)

کمیشن نے دیگر رسمی کارروائیوں کی تکمیل سے قبل ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ 17 جنوری 1972ء کو راولپنڈی پہنچ کر بلا کسی مزید تاخیر کے اپنے دفاتر کی تنظیم کا عمل شروع کردیا جائے۔

کمیشن کا پہلا اجلاس

17 جنوری 1972ء کو کمیشن کا پہلا اجلاس راولپنڈی میں ہوا۔ اس وقت تین سو پچاس سے زائد افراد سے جن کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے تھا اس کمیشن کو مختلف نوعیت کی معلومات اور اطلاعات فراہم ہوچکی تھیں۔ ان تمام کی ضروری جانچ پڑتال کی گئی تاکہ ان گواہوں کا ابتدائی انتخاب کیا جاسکے جنہیں اس کمیشن کے روبرو طلب کیا جائے گا۔ وہ افراد جن کے بیانات محض افواہوں پر مبنی تھے یا جن کا ذریعہ اخباری رپورٹیں تھیں انہیں طلب نہیں کیا گیا' تاہم اس نوعیت کی اطلاعات مزید تحقیق اور جانچ پڑتال کی غرض سے متعلقہ وزارت کو ارسال کردی گئیں۔ اس سلسلے میں سیکرٹری دفاع اور اس وقت کے قائم مقام آرمی کمانڈر انچیف سے طریقہ کار سے متعلقہ امور کے حوالے سے ضروری صلاح مشورہ بھی کیا گیا۔

صحافیوں کی درخواست پر پریس کانفرنس

کمیشن کی کارروائی کے آغاز سے قبل صحافیوں کی درخواست پر کمیشن کے سربراہ نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس کے دوران انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ ایسے تمام گواہان جو کمیشن کے روبرو شہادت دیں گے انہیں آفیشل سیکریٹ ایکٹ سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا اور انہیں انتقام یا خوف و ہراس کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ صحافیوں کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے کمیشن کے سربراہ نے کہا کہ:

کمیشن کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ سابق صدر اور چیف آف اسٹاف سمیت پاکستان کے کسی بھی شہری کو معلومات حاصل کرنے کی غرض سے طلب کرسکتا ہے۔ ضرورت پیش آنے پر کمیشن کسی بھی فرد کی حاضری کو یقینی بنانے کے لئے وارنٹ بھی جاری کرسکتا ہے تاوقتیکہ قانون اسے ذاتی طور پر کمیشن کے روبرو حاضری سے مستثنیٰ قرار نہ دے دے۔

چند افسران جو مشرقی پاکستان سے فرار ہوکر یہاں پہنچ چکے تھے' ہتھیار ڈالے جانے کے اصل حالات و واقعات کے بارے میں شہادتیں دینے کے لئے دستیاب ہیں۔ اگر ان کے بیانات اور شہادتیں تسلی بخش نہ پائی گئیں تو ایسی صورت میں کمیشن حکومت سے کہے گا کہ وہ۔

بھارت سے جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہونے تک کمیشن کو دیئے گئے وقت کی میعاد بڑھا دے۔

کمیشن کی کارروائی کو خفیہ رکھنا قومی مفاد کے عین مطابق ہے کیونکہ کمیشن کے روبرو پیش کی جانے والی تمام اطلاعات و معلومات نہایت حساس نوعیت کی ہوں گی جنہیں اس وقت عام کرنا، شائع کرنا یا نشر کرنا ممکن نہیں ہوگا جب کہ مغربی سرحدوں پر بھارت اور پاکستان کی فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی ہوئی ہیں: تاہم یہ کمیشن وقتاً فوقتاً عوام کی اطلاع کے لئے اپنی سرگرمیوں کے بارے میں مختصر ہینڈ آؤٹ جاری کرتا رہے گا۔

ضرورت پڑنے پر یہ کمیشن مسلح افواج کے تیکنیکی ماہرین کی خدمات سے بھی ضروری استفادہ کرتا رہے گا تاکہ وہ ان امور کے سلسلے میں کمیشن کی مدد کر سکیں؛ تاہم وہ کسی بھی صورت میں کمیشن کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے مجاز نہیں ہوں گے۔

ابتدائی مصروفیات

25 جنوری 1972ء کو عید کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل یہ کمیشن ان تمام دستیاب مواد کی ضروری جانچ پڑتال کرنے کے بعد ان افراد کا انتخاب کر چکا تھا جنہیں اس کے روبرو پیش ہونا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بے حد اہم شخصیت کی شہادت بھی ریکارڈ کرلی گئی تھی جو 24 جنوری 1972ء کو راولپنڈی میں موجود تھی۔ مسلسل دو دنوں تک اس کمیشن نے جنرل ہیڈ کوارٹرز کا بھی دورہ کیا تھا تاکہ وہ اس کے مختلف شعبہ جات اور ان کی کارکردگی سے آگاہی حاصل کر سکے۔ کمیشن نے ائر آپریشن سینٹر کا بھی دورہ کیا۔ تینوں مسلح افواج کے نمائندوں نے نقشہ جات چارٹ اور تقاریر کی مدد سے کمیشن کو بریفنگ بھی دی۔ اس موقع پر مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بھی اس کمیشن کو دکھائی گئی۔

31 جنوری سے کمیشن نے دوبارہ اپنی کارروائی شروع کی اور اس وقت سے اب تک مسلسل کام میں مصروف رہا سوائے ان مختصر وقفوں کے جب کمیشن کے سربراہ یا کسی اور رکن کو اپنی دیگر ذمے داریوں کے سلسلے میں کوئی مصروفیت درپیش ہوئی ہو۔ 17 مارچ سے 26 مارچ تک کمیشن کو اپنی کارروائی ملتوی کرنا پڑی کیونکہ کمیشن کے سربراہ کو ایک اہم مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں لاہور کی سپریم کورٹ بنچ میں بیٹھنا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر اراکین کو بھی اپنے اپنے متعلقہ دفاتر کی فوری نوعیت کی ذمے داریوں کو نمٹانا تھا۔ کمیشن کے اس قدر پھیلے ہوئے کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی یکسوئی اور کامل توجہ کی ضرورت تھی جبکہ کمیشن کے سربراہ اور دیگر اراکین کو اپنے متعلقہ دفاتر کے اضافی امور بھی دیکھنے پڑتے تھے؛ تاہم کام کی تکمیل کے پروگرام اور کمیشن کے روبرو موجود تمام تر مواد کا مکمل طور پر احاطہ کرنے کی غرض سے مخصوص اوقات کار کے علاوہ بھی کام کرنا پڑتا تھا یہاں تک کہ اتوار اور عام تعطیلات کے دوران بھی کمیشن برابر کام کرتا رہا، اس کے باوجود بھی یہ کام تین ماہ کی مدت میں مکمل نہ ہو سکا۔ اپریل کے شروع میں اٹارنی جنرل نے کمیشن کو مطلع کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے چند شہادتیں پیش کرنا چاہتے ہیں اس کے علاوہ چند اہم گواہوں کے بیانات کی جانچ پڑتال بھی باقی تھی۔ چنانچہ صدر پاکستان سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ مقرر کردہ میعاد کو 31 مئی 1972ء تک بڑھا دیں جس کی انہوں نے

اجازت دے دی۔ مئی 1972ء کے پہلے ہفتے میں کمیشن کے سربراہ کو امریکہ جانا پڑا جہاں انہیں اقوام متحدہ کی ایک کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ 5 مئی سے 21 مئی تک ان کی عدم موجودگی کے دوران انکوائری کمیشن کو رپورٹ کی تکمیل کے لئے ان کا انتظار کرنا ضروری تھا اور جب 22 مئی 1972ء کو واپسی کے بعد انہوں نے رپورٹ کی تکمیل کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ 31 مئی تک بھی اسے تیار کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ ایک بار پھر صدر پاکستان سے درخواست کی گئی کہ میعاد میں 15 جون 1972ء تک توسیع کر دی جائے جس پر صدر پاکستان نے اس مدت میں 15 جولائی تک توسیع کر دی یعنی درخواست کردہ تاریخ میں ایک اور مہینے کا اضافہ کر دیا گیا۔

کمیشن کے روبرو شہادتیں

کمیشن نے شہادتوں کی قلم بندی کا کام یکم فروری 1972ء سے شروع کیا تھا جو 26 اپریل 1972ء کو پایہ تکمیل تک پہنچا۔ گواہوں کے بیانات کی ضروری جانچ پڑتال اور معائنے کی غرض سے کمیشن کو مجموعی طور پر 57 مرتبہ بیٹھنا پڑا یعنی کل ملا کر کمیشن نے 213 افراد کے بیانات قلم بند کئے جن کی تفصیلات نیچے پیش کی جاتی ہیں:۔

1- آرمی:۔
(i) ملازم اہلکار 61   (ii) ریٹائرڈ اہلکار 27

2- ائیرفورس:۔
(i) ملازم اہلکار 39   (ii) ریٹائرڈ اہلکار 6

3- نیوی:۔
(i) ملازم اہلکار 14   (ii) ریٹائرڈ اہلکار 7

4- سیاسی لیڈر 7

5- سول ملازمین:۔
(i) ملازم 17   (ii) ریٹائرڈ 6

6- صحافی 3

7- عوامی نمائندے 10

ان گواہوں کے بیانات، چار ہزار صفحات پر ٹائپ کئے گئے جب کہ ان بیانات کے سلسلے میں پیش کی جانے والی 374 دستاویزات بھی تقریباً اتنے ہی صفحات میں ٹائپ کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ کمیشن کو حکومت کے مختلف محکمہ جات اور شعبوں کے ان کاغذات اور دستاویزات کی بھی ضروری جانچ پڑتال کرنا پڑی جو اس سلسلے میں اس کے روبرو پیش کئے گئے تھے۔ کمیشن نے متعدد سرکاری ایجنسیوں سے بہت بڑی تعداد میں ایسی رپورٹیں حاصل کیں جن کا تعلق زیر غور امور و معاملات کے مختلف پہلوؤں سے تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کمیشن کی معلومات کے لیے کچھ تجزیاتی مطالعے بھی مرتب کئے گئے۔ کمیشن نے ایسے امور اور معاملات کی پولیس کے ذرائع سے تحقیقات کی ہدایات بھی جاری

گئیں جو گواہوں کے بیانات کی جانچ پڑتال کے آخری مراحل تک عوام کی جانب سے تجاویز اور مشورے بھی موصول ہوتے رہے جن کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ کمیشن نے بذات خود تمام گواہوں کے بیانات کی جانچ پڑتال اور جرح کے فرائض ادا کئے۔

21 جنوری 1972ء کو کمیشن نے وزارت صدارتی امور کو ایک خط ارسال کیا جس کے ذریعے یہ معلوم کیا گیا تھا کہ کیا حکومت اس کمیشن کے روبرو اپنی نمائندگی کی خواہش مند ہے یا اس سلسلے میں کوئی خاص نقطہ نظر یا کوئی گواہ پیش کرنا چاہتی ہے؟ وزارت نے کمیشن کو مطلع کیا کہ مسٹر یحیٰی بختیار، اٹارنی جنرل حکومت پاکستان، حکومت کی نمائندگی کریں گے اور ضروری دستاویزات اور گواہان کو پیش کرتے ہوئے کمیشن کی معاونت کریں گے، جبکہ صدر پاکستان کے اسپیشل اسسٹنٹ مسٹر رفیع رضا ایسے بیانات داخل کریں گے جو ائے علم میں موجود حقائق و واقعات پر مشتمل ہوں گے جن میں وہ موجودہ صدر کے 20 دسمبر 1971ء کو اقتدار سنبھالنے سے پہلے کے خیالات اور آرا بھی پیش کریں گے۔ اس سلسلے میں اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار اور مسٹر رفیع رضا نے کمیشن سے چند ملاقاتیں بھی کیں۔ بعد میں مسٹر رفیع رضا رسمی طور پر ایک گواہ کی حیثیت سے کمیشن کے روبرو پیش ہوئے تا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکاری مؤقف اور نقطہ نظر کی ترجمانی کر سکیں۔ چند گواہوں پر جرح کے دوران اٹارنی جنرل خود بھی موجود تھے اور انہوں نے کچھ گواہان پر خود بھی جرح کی: تاہم انہوں نے حکومت کی جانب سے کسی قسم کی شہادتیں پیش نہیں کیں۔

آرمی، ائیر فورس اور نیوی کے ان متعدد افسران کے بیانات کی جانچ پڑتال کے بعد جو ہتھیار ڈالنے سے کچھ قبل یا بعد مشرقی پاکستان سے واپس آئے تھے، کمیشن نے محسوس کیا کہ مشرقی کمان کے افسران سے مناسب انصاف کا اولین تقاضہ یہ ہے کہ کلیدی عہدوں پر فائز ان افسران کے بیانات اور شہادتیں بھی قلم بند کی جانی چاہئیں جو بھارت کی جنگی قید میں تھے۔ چنانچہ اس خیال کے مدنظر حکومت سے معلوم کیا گیا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے توسط سے ضروری اقدامات کرتے ہوئے، پاکستانی فوجی افسران کے بیانات کمیشن کے لیے حاصل کئے جائیں: جن میں سے چند یہ تھے!

1- لیفٹیننٹ جنرل اے۔ اے۔ کے۔ نیازی
2- میجر جنرل راؤ فرمان علی
3- ائیر ایڈمرل ایم شریف
4- ائیر کموڈور انعام الحق

جنگی قیدیوں کی درخواست

آرمی کے دو لیفٹیننٹ کرنلوں اور نیوی کے دو کمانڈروں نے جو اس وقت جنگی قیدی کی حیثیت سے بھارت میں تھے، اس کمیشن کو تحریری پیغامات ارسال کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ جنگی قیدیوں کے تبادلے تک 'انکوائری کمیشن کی کارروائی مکمل نہ کی جائے' کیونکہ ان کے بیانات اور گواہیاں بھی قلم بند کی جانی بہت ضروری ہیں۔ ایک لیفٹیننٹ کرنل نے اس کمیشن کو اپنے پیغام کے ذریعے مطلع کیا کہ ان کے پاس بتانے کے لیے بہت کچھ ہے جو اس کمیشن کو ایک منصفانہ فیصلے تک پہنچنے میں' کافی مدد دے گا! انہوں نے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ کسی سرحدی چوکی پر ان کی شہادتیں قلم بند کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تمام پیغامات حکومت کو ارسال کر دیئے گئے جس کے جواب میں وزارت صدارتی امور نے کہا کہ حکومت نے اس پورے معاملے کا بڑے غور سے جائزہ لیا ہے: تاہم انٹرنیشنل ریڈ کراس کے ذریعے اس قسم کے بیانات اور شہادتوں کو فی الحال قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔

کمیشن کو حکومت کی جانب سے ہر ممکن تعاون اور مدد فراہم کی گئی اور اس کی تمام ضروریات اور مطالبات کو 'وزارت صدارتی امور اور دیگر سرکاری محکموں کی جانب سے فوری طور پر نہایت مستعدی کے ساتھ پورا کر دیا گیا' کمیشن کو نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی سے بھی ضرورت کے مطابق ہر ممکن تعاون فراہم کیا گیا جس کی امارت میں کمیشن کے دفاتر قائم تھے۔

تمام معاونین کا شکریہ

یہ کمیشن ان تمام افراد اور اداروں کا شکر گزار ہے جنہوں نے اس مشکل کام کی تکمیل میں اسے ہر ممکن تعاون اور مدد فراہم کی' اس سلسلے میں کمیشن خصوصی طور پر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) الطاف قادر' ملٹری ایڈوائزر اور تینوں مسلح افواج کے نمائندوں کا ممنون ہے جنہوں

نے مشنری جذبے سے کام لیتے ہوئے اس کمیشن سے ضروری تعاون کیا۔ ان حضرات نے انکوائری کے فوجی پہلوؤں سے نہ صرف قابل قدر امداد فراہم کی بلکہ اطلاعات اور اسٹاف اسٹڈیز کی ترتیب میں بھی اس کمیشن کا ہاتھ بٹایا۔

ہم ایئر مارشل (ریٹائرڈ) نورخان اور وائس ایڈمرل (ریٹائرڈ) ایچ ایم ایس چوہدری کے بھی بطور خاص ممنون اور شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ایئرفورس اور نیوی کے امور و معاملات پر ہمیں اپنی ماہرانہ آرا اور مشوروں سے نوازا۔

کمیشن اس تعاون کے لیے بھی ممنون ہے جو اسے اپنے تمام دفتری اسٹاف کی جانب سے سیکرٹری ایم اے لطیف کی سربراہی میں فراہم کیا گیا' اس کے علاوہ نیشنل ڈیفنس کالج کی جانب سے ہمیں فراہم کیے گئے وہ تمام اسٹینوگرافرز اور ٹائپسٹ حضرات بھی کمیشن کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ان تھک محنت کی۔

❖

اسلامی تاریخ کی ذلت آمیز شکست

لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے شیخی بگھارتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ بھارتی افواج ان کی لاش پر سے گزر کر ہی ڈھاکہ میں داخل ہو سکتی ہیں۔ اس اعلان کے دوسرے ہی دن' پوری قوم غیر ملکی ذرائع ابلاغ سے یہ وحشت ناک خبر سن کر سکتے میں آ گئی کہ انہوں نے نہایت ذلت آمیز طریقے سے شرم ناک انداز میں 14 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ ریس کورس کی ایک تقریب میں' دشمن افواج کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے' شکست تسلیم کر لی! اسی شام پاکستانی افواج کے اس وقت کے کمانڈر انچیف اور خود ساختہ صدر پاکستان نے قوم کے نام اپنے ایک نشری پیغام میں اس ذلت آمیز شکست کو محض ایک خطے میں جنگ ہارنے سے تعبیر کرتے ہوئے' اس عزم کا اعادہ کیا کہ مغربی محاذ پر' یہ جنگ جاری رہے گی! ایک مرتبہ پھر قوم کو ایک شدید دھچکا لگا جب اس اعلان کے دوسرے ہی دن' انہوں نے قلابازی کھائی اور اعتراف شکست کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم کی جانب سے یک طرفہ طور پر' جنگ بندی کو تسلیم کر لیا اور وہ بھی' ایک ایسے مرحلے پر جب سرکاری اخباری رپورٹس کے مطابق مغربی محاذ پر پاکستانی افواج ہر سمت میں پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کے علاقے میں' برابر آگے بڑھ رہی تھیں اور انہیں بہت کم جانی نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ پوری قوم ان واقعات پر شدید احساس زیاں سے دوچار تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس شرم ناک انداز میں' شکست تسلیم کرتے ہوئے بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار کیوں ڈالے گئے اور جنگ بندی کی پیش کش کو تسلیم کرنے میں اس قدر عجلت کا مظاہرہ آخر کس لیے کیا گیا؟ ان تمام واقعات نے' اس وقت کی فوجی حکومت کے حوالے سے قوم کے ذہن میں ان شکوک و شبہات کو جنم دیا کہ یہ سب کچھ قوم اور وطن کو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بے آبرو اور تباہ کرنے کی ایک مجرمانہ سازش تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس شکست کے ذمے داروں پر سر عام مقدمہ چلا کر ہی قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اس احتجاج نے اتنی شدت

اختیار کرلی کہ اس وقت کے ڈپٹی پرائم منسٹر' مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو بڑی عجلت میں نیویارک سے واپس آنے کے لیے کہا گیا' جہاں وہ سیکورٹی کونسل میں پاکستانی وفد کی قیادت کر رہے تھے اور 20 دسمبر 1971ء کو جنرل آغا محمد یحیٰی خان نے انہیں اقتدار منتقل کر دیا.........

سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب

ان حالات کے پس منظر میں' موجودہ صدر نے' برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد اس کمیشن کا تقرر کیا جس کے دائرہ کار میں (26 دسمبر 1971ء کے صدارتی نوٹیفکیشن کے مطابق) اس امر کی تحقیقات کرنا شامل تھا کہ کن حالات میں کمانڈر ایسٹرن کمانڈ اور پاکستان کی مسلح افواج نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے اور بھارت اور مغربی پاکستان کی سرحدوں نیز وادی جموں و کشمیر میں جنگ بندی کے احکامات صادر کئے گئے۔

اس کمیشن کے تمام اراکین' پاکستانی عدلیہ کے رکن ہونے کے ناطے' جنگی چالوں' فوجی حکمت عملیوں اور فن حرب سے ناآشنا ہیں؛ تاہم یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس اعلیٰ اختیاراتی کمیشن کے قیام اور وسیع دائرہ کار کے تعین کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شخصیات کو ملوث کئے بغیر' صداقت کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ اجاگر کیا جائے تاکہ عوام کے ذہنوں میں ان اسباب اور وجوہ کی ایک صاف اور واضح تصویر آسکے جو اس تباہ کن واقعہ کے موجب تھے اور وہ یہ جان سکیں کہ عوام اور پریس کی جانب سے عائد کردہ الزامات کی حقیقی نوعیت اور بنیاد کیا ہے؟ اگر یہ الزامات درست ہیں تو کون کون سے افراد اس میں ملوث ہیں اور ان کے خلاف کیا اقدامات کئے جانے چاہئیں' اور اگر یہ تباہی ان اسباب اور وجوہ کے نتیجے میں نہیں ہوئی تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ کیا خامیاں اور نقائص تھے جو اس واقعہ کا سبب بنے!

مسلح افواج کی جانب سے چند افراد نے اس عدالتی کمیشن کے قیام پر اپنے ذہنی تحفظات کا اظہار کیا ہے' ان کا کہنا ہے کہ اس قسم کا عدالتی کمیشن ایک خالصتاً تکنیکی اور فوجی معاملے پر تحقیقات کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے: تاہم یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس قسم کی ذلت آمیز فوجی شکست کے نتیجے میں' اس نوعیت کی تحقیقات کو خلاف معمول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بھارت میں بھی' ایسے ہی کمیشن کے قیام پر اعتراضات کئے گئے تھے اور اس کی کارکردگی پر شبہات کا اظہار کیا گیا تھا جسے ایک فوجی افسر' میجر جنرل ہینڈرسن بروکس کی سربراہی میں اس لیے

قائم کیا گیا تھا کہ وہ 1962ء کی چین' بھارت جنگ کی تحقیقات کرے' اس کے بعد سے اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے مصنفین کا خیال ہے کہ ایک نسبتاً زیادہ اعلیٰ اختیاراتی صدارتی کمیشن بہتر نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

حمود الرحمن کمیشن کے اپنے متعلق خیالات

کمیشن کو اپنا دائرہ محدود ہونے کا مکمل احساس ہے اسے اس کام کے پھیلاؤ اور اس ضمن میں عائد ہونے والی ذمے داریوں کا بھی بھرپور ادراک ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے کوشش یہی رہی کہ جہاں تک عملی طور پر ممکن ہو ہم ایک مختصر سے وقت میں فن حرب کے طور طریقوں اور تکنیک سے واقفیت پیدا کرلیں، اس کی بلند تر سمتوں کے اصولوں کو سمجھیں اس کی منصوبہ بندی سے عمل اور اس کے نفاذ کے طریقوں کو ذہن نشین کرلیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ملٹری ایڈوائزر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) الطاف قادر کی ماہرانہ اور قابل قدر معاونت کے علاوہ تینوں مسلح افواج کے نمائندوں اور جنرل ہیڈکوارٹر کے متعدد سینئر افسران کا تعاون بھی حاصل رہا ہے جنہوں نے دفاعی اور فوجی ٹیکنالوجی اور ان پر عمل درآمد کے بارے میں کمیشن کو اپنی قیمتی معلومات سے آگاہ کیا۔

ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے ہم نے اس شعبے میں بھرپور مہارت حاصل کر لی ہے؛ تاہم پہلا سبق ہم نے یہی سیکھا ہے کہ کسی بھی جنگ میں شکست کے اسباب تلاش کرنے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ جنگ آخر ہوئی کیوں؟ جدید جنگیں' اب الگ تھلگ انداز سے نہیں لڑی جاتیں نہ ہی اب ان میں ہتھیاروں یا جنرل شپ کا کوئی مقابلہ ہوتا ہے! کہا جاتا ہے کہ جنگی چالوں کا براہ راست تعلق سیاسی اور سفارتی حکمت عملی سے ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ نفسیاتی' سماجی' معاشی اور جغرافیائی عوامل بھی اس سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنگ لڑنے کے لیے ہمارا ایک قومی' سیاسی نصب العین ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ جنگ کا بنیادی مقصد اور صحیح نظر' مربوط منصوبہ بندی' جنگ کی صحیح سمت کا تعین کرنے کے لیے مناسب مشینری اور ان سب سے بڑھ کر جنگی کوششوں میں قوم کی بھرپور شمولیت اور شرکت بے حد ضروری ہے۔ ان عوامل میں سے کسی ایک کی بھی عدم موجودگی' تباہ کن نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ چنانچہ ان اسباب اور وجوہات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے جن کی بنا پر

قوم کو اس تباہی کا سامنا پڑا ہے ہمیں لازمی طور پر ان تمام عوامل کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔

سیاسی پس منظر اور جائزے

چنانچہ انہی حقائق کے پیش نظر' ہم نے اس رپورٹ کو چار جلدوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے پہلی جلد اصل رپورٹ پر مشتمل ہوگی' دوسری جلد میں اسٹاف کے جائزے شامل ہوں گے' تیسری جلد تحریری بیانات اور دیگر دستاویزات اور چوتھی جلد' زبانی شہادتوں پر مشتمل ہوگی۔

رپورٹ کے پانچ حصے

یہ اصل رپورٹ بھی پانچ حصوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلے حصے میں تعارفی اور عام نوعیت کے' فقط دو ابواب' شامل کئے جائیں گے۔ دوسرے حصے میں ہم مختصراً اس سیاسی پس منظر کا ایک جائزہ پیش کریں گے جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی سیاسی تاریخ بھی اختصار کے ساتھ بیان کی جائے گی' جس میں ان تمام حالات کا خصوصی طور پر حوالہ دیا جائے گا جو مشرقی پاکستان میں بے چینی کا سبب بنے جس کے بعد ملک کے اس حصے کے لیے مکمل خودمختاری کے مطالبے نے زور پکڑا۔ اس حصے کو بھی ہم مزید چار خاص ادوار کے حوالے سے تقسیم کریں گے جو درج ذیل ہیں:

(الف) پہلا آئینی دور...... اگست 1947ء سے اکتوبر 1958ء تک

(ب) پہلے مارشل لا کا زمانہ...... 7 اکتوبر 1958ء سے 6 جون 1962ء تک

(ج) دوسرا آئینی دور...... 7 جون 1962ء سے 24 مارچ 1969ء تک

(د) دوسرے مارشل لا کا زمانہ ...... (i) 25 مارچ 1971ء تک اور

(ii) 25 مارچ 1971ء سے 20 دسمبر 1971ء تک

یہ حصہ بھی سات ابواب پر مشتمل ہوگا جن میں سے آخری باب' آخری مارشل لا حکومت کے ارادوں اور فیصلوں کے تجزیے کے لیے مخصوص ہوگا۔ اسی باب میں ہم اس سوال کا بھی جائزہ لیں گے کہ ملک کے خلاف' کسی قسم کی کوئی سازش تو نہیں کی گئی؟ اور اگر ایسا ہے تو اس سازش کی اصل نوعیت کیا تھی اور کون کون اس میں شریک تھا؟

آخری باب میں مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات اور وہاں کئے گئے فوجی ایکشن کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ دوسرے حصے کے بارہ ابواب میں ہم ملک کے بین الاقوامی تعلقات سے بحث کرتے ہوئے' مشرقی پاکستان پر بھارت کی کھلی جارحیت پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

مبہم جنگی حکمت عملی اور غلط فیصلے

اس حصے میں ہم ان بین الاقوامی تاثرات کے جائزے کو بھی شامل کریں گے جو مشرقی پاکستان میں کئے گئے' فوجی ایکشن کے نتیجے میں مرتب ہوئے تھے اور ان نتائج پر بھی غور کریں گے جو ہمارے غیر ملکی سفارتی تعلقات پر' اثر انداز ہوئے۔

بعد ازاں ہم جنگ کے فوجی پہلوؤں' اس کے مقاصد' نظریئے' منصوبہ بندی اور عمل درآمد پر غور کریں گے' جس کے بعد' مشرقی پاکستان آزاد کشمیر اور مغربی پاکستان کے جنگی محاذوں کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی۔ اس کے بعد ہم مختلف ابواب میں' فضائی اور بحری آپریشنز کا ایک جائزہ لیتے ہوئے' مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے حالات' مغربی پاکستان میں' بھارت کی یک طرفہ' اعلان جنگ بندی کی پیش کش اور اس کی منظوری اور آزاد کشمیر کے حوالے سے بات کریں گے۔

جنگ کی بلند تر سمت اور جنگی منصوبہ بندی کے سوال پر بھی علیحدہ سے گفتگو کی جائے گی کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے' جس کے بارے میں' ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ سب' مجموعی المناک لاتعلقی کا' نتیجہ تھا۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک بھی کہا ہے کہ ہماری جنگی حکمت عملی اس قدر مبہم' ہماری فوجی منصوبہ بندی اتنی ناقص اور ہمارے فیصلے اس درجہ تذبذب کے ساتھ اور خامیوں سے پر تھے کہ اس ساری تباہی سے شرم ناک رسوائی ہمارے حصے میں آئی' اس کا اہم اور بنیادی سبب' جنگ کے آخری مرحلوں میں' سپاہیوں اور فوجی ساز و سامان کی کمی میں نہیں بلکہ اسی نوعیت کی غیر منظم کارروائیوں اور غیر مربوط جنگی منصوبہ بندی تھا۔

اس کمیشن کے روبرو' کچھ ایسے الزامات بھی آئے ہیں جن کا تعلق نہ صرف متعدد اعلیٰ فوجی افسران کے' اخلاق و کردار سے ہے بلکہ خاص طور پر ان افسران سے بھی ہے جو دوسری مارشل لا حکومت کے دوران' مارشل لا ڈیوٹی کی انجام دہی پر مامور تھے۔ پانچویں حصے میں'

معاملے کے اس پہلو پر بھی گفتگو ہوگی۔

ایک علیحدہ باب میں ہم ان امور و معاملات کا بھی جائزہ لیں گے جو ہمارے علم میں لائے گئے ہیں جن کا تعلق' افسران کی ذاتی کوتاہیوں' تربیتی نقائص' فوجی ساز و سامان کی خامیوں' فوج کی غلط تعیناتی' نظم و ضبط برقرار رکھنے کے اختیارات اور بھرتی اور ترقی کے اس طریقہ کار سے ہے جس کے نتیجے میں' سپاہیوں کا مورال اور کارکردگی' بری طرح متاثر ہوئی۔

اس رپورٹ کا پانچواں حصہ ایک ایسے باب پر ختم ہوگا جس میں ہم اپنے برآمد کردہ نتائج کا خلاصہ اور اس حوالے سے اپنی سفارشات پیش کریں گے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہم اپنی رپورٹ کو اس کے طے شدہ دائرہ کار کی حدود ہی میں رکھیں: تاہم تحقیقات کے دوران ہمارے دفاعی سیٹ اپ کے حوالے سے ایسے سنگین نقائص اور خامیاں' سامنے آئی ہیں جن کی طرف سے ہم کسی صورت اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس نوعیت کے اعلیٰ اختیارات کمیشن کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ہمیں اپنی خامیوں اور نقائص سے آگاہ کرے تاکہ ہم اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے' مستقبل میں ان کا اعادہ نہ کریں۔ چنانچہ ہم اس رپورٹ کی طوالت کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی معذرت ضروری نہیں سمجھتے۔

جہاں کہیں ضروری تھا' رپورٹ کے ہمراہ ضمیمہ جات کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے: تاہم شہادتوں اور دستاویزی ثبوت جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے' علیحدہ جلدوں میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ بہر کیف' خفیہ اور حساس نوعیت کی معلومات اور دستاویزات' ان جلدوں میں شامل نہیں ہیں یہ معلومات' اصل شہادتوں اور دستاویزات کے ہمراہ' ان فولڈرز میں دستیاب ہیں جو ایک مہر بند صندوق میں' وزارت صدارتی امور کو پیش کر دیئے جائیں گے۔

برطانوی مصنف کی رائے

پاک بھارت تنازع پر اپنی ایک کتاب میں' برطانوی مصنف رسل برائنز نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "برٹش انڈین ایمپائر کی 1947ء میں دو علیحدہ ہندو اور مسلم ریاستوں کی شکل میں تقسیم ہی اس پر تشدد خطے کے مسائل کا آخری حل تھا" کسی حد تک یہ بات درست ہے تاہم فاضل مصنف نے' جس اہم چیز کو نظر انداز کر دیا' وہ خود برطانوی سرکار کا اپنا کردار تھا جس کے نتیجے میں گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں کے دوران' برصغیر کی تاریخ' خون آشامیوں سے پر رہی ہے مسلمان حکمرانوں نے' اس خطے پر' ایک ہزار برس سے زیادہ حکومت کی تھی اور ان کے خلاف' اس الزام کے باوجود کہ انہوں نے تلوار کے زور پر اسلام کی اشاعت کی' ہزاروں' لاکھوں کی تعداد میں' ہندو' بدھ' سکھ اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے' ان کی غیر متعصبانہ اور منصفانہ حکومتوں میں' بڑے اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ عہد مغلیہ میں تو خاص طور پر' اعلیٰ ترین رواداری کا مظاہرہ کیا گیا۔ اکبر اعظم تو اس حد تک آگے چلا گیا کہ اس نے ہندوؤں کو اپنے نورتنوں میں شامل کر لیا تھا۔ اس نے ایک ہندو کو' اپنے فوجی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور ایک ہندو رانی سے شادی بھی کر لی تاکہ آبادی کے اکثریتی حصے سے مطابقت کا اظہار کیا جا سکے۔ اس نے مسلم قدامت پرست طبقے کی شدید مخالفت کے باوجود ایک نئے مذہب کی تشکیل اور تبلیغ کی جسے اس نے دین الٰہی کا نام دیا تھا تاکہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں مذہبی ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اس نے ملک کے عدالتی نظام محصولات اور کوتوالی کو از سر نو منظم کیا۔ اس کی ان کوششوں کے نتیجے میں' رعایا امن و امان اور چین کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی اور اس کی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان کی خوش حالی کی داستانیں سمندر پار پہنچنے لگیں اور یورپین ممالک کے سفرا کو اس کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی۔

مسلم حکمرانوں کا برتاؤ

اکبر کی انہی پالیسیوں پر اس کا بیٹا جہانگیر بھی عمل پیرا رہا جو اپنی رعایا سے مساویانہ برتاؤ اور انصاف پسندی کے حوالے سے امتیازی شہرت کا حامل ہے اس کا جانشین شاہ جہاں امن اور ثقافت کا دل دادہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے امن وامان اور خوش حالی کو فنون لطیفہ فن تعمیر اور ثقافت کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ بنایا۔ اسی شاہ جہاں نے اپنے خوابوں کو "تاج محل" کی شکل دی جس کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔ شاہ جہاں کے بعد اس کا بیٹا اورنگزیب تخت نشین ہوا جو ایک پکا مسلمان اور پاکیزہ عادات کا مالک تھا وہ نمود و آرائش کا سخت مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی رعایا میں بھی اس کی ذاتی زندگی کی سادگی اور پرہیزگاری کا عکس نظر آئے۔ اس نے قانون کے عملی نفاذ کو ممکن بنانے کی غرض سے اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا تاکہ بدعنوانیوں رشوت ستانی اور کاسہ لیسی کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اسی کے عہد حکومت کے دوران اسلامی قوانین کے یادگار مجموعہ "فتاویٰ عالمگیری" کی تالیف عمل میں آئی تاہم اس نے مغلوں کی روایتی رواداری کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوؤں اور دیگر مذہبی فرقوں کے پرسنل لاز کو قطعاً نہیں چھیڑا۔ قوانین کے نفاذ میں اس کی سخت گیر پالیسیوں کا کچھ طبقات میں شدید ردعمل ہوا چنانچہ شیواجی کی سربراہی میں جنوب میں آباد مرہٹوں نے اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کی کوششیں شروع کردیں اورنگ زیب پیرانہ سالی کے باوجود خود اس بغاوت اور سرکشی کو کچلنے کی غرض سے روانہ ہوا جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی؛ تاہم وہ ابھی جنوبی ہندوستان ہی میں تھا کہ 1707ء میں موت نے اسے آلیا۔

مغربی سامراج کی سازشیں

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں ان مغربی عناصر نے جو ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کر چکے تھے صوبے داروں اور ہندو مہاراجوں کے ساتھ مل کر سازشیں شروع کردیں جو خود بھی اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ فرانسیسی پرتگیزی اور انگریز کسی نہ کسی ہندو مہاراجہ سے ساز باز کرتے ہوئے اپنی طاقت اور اقتدار کی اس جنگ کو برصغیر تک کھینچ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس مرحلے پر نپولین کو بھی یہ خیال آیا کہ بحیرہ احمر کو دریائے نیل سے ملاتے ہوئے ہندوستان تک پہنچنے کا مختصر ترین بحری راستہ دریافت کر کے میسور کے حکمران کی مدد کو پہنچ جائے جو انگریز کو نکال باہر کرنے کی جنگ میں مصروف تھا اس کا یہ خیال اس زمانے میں قابل عمل نہ تھا؛ تاہم بعد میں نہر سویز کی تعمیر بھی ایک فرانسیسی کے ہاتھوں ہی عمل میں آئی جو خاصی تعجب انگیز بات ہے۔

اسی دوران ہندوستان میں انگریز کی سیاست کامیاب ہوگئی سترہویں صدی کے اواخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی کو کلکتہ مدراس اور بمبئی میں قدم جمانے کا موقع مل چکا تھا کلکتے میں جو اس زمانے میں تین ملحقہ دیہات پر مشتمل تھا ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورنگزیب کے پوتے شہزادہ عظیم الشان سے زمینداری کے حقوق حاصل کر لیے جو اس وقت بنگال کا صوبے دار تھا۔ اس زمینداری میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا کیونکہ کمپنی نے مزید زمینیں بھی حاصل کرلی تھیں جس کے نتیجے میں 1757ء میں جنگ پلاسی کا واقعہ پیش آیا جس میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی جس کے بعد بنگال کے چوبیس پرگنوں پر انگریزوں کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ مغلیہ سلطنت کے مزید زوال کے نتیجے میں 1765ء میں لارڈ کلائیو مشرقی صوبوں بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی 26 لاکھ کے عوض حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دیوانی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے اور ان مہاراجوں پر بھی تسلط حاصل کرلیا جو مغلیہ

سلطنت کے زوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے صوبوں کی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ ان میں سے چند مہاراجے ہندو تھے جو دوسری مغربی طاقتوں کی مدد سے مغل شہنشاہ کے خلاف اعلان بغاوت کر چکے تھے۔ ان کے خلاف' کامیاب فوجی کارروائی کرتے ہوئے انگریزوں کو ملک کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول حاصل ہو گیا۔

پہلی جنگ آزادی

انہی حالات میں مسلمانوں نے چند وفادار ہندو عناصر کے ساتھ مل کر 1857ء میں مغلیہ سلطنت کے اختیارات کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہماری پہلی جنگ آزادی تھی جسے انگریزوں نے بغاوت کا نام دیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ ناکام ہوگئی' آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو حراست میں لے کر رنگون بھیج دیا گیا جہاں بالآخر ان کا انتقال ہو گیا اس دن کے بعد سے انگریزوں نے خود کو ہندوستان کا فاتح قرار دیتے ہوئے ملکی اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

چونکہ انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ 1857ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کی جانب سے مغلیہ سلطنت کو بحال کرنے کی ایک کوشش تھی' لہٰذا ان سے ایسا بے رحمانہ امتیازی سلوک کیا جانے لگا کہ رفتہ رفتہ مسلمان اپنے ماضی کی شان و شوکت کے مقابلے میں ایک درماندہ اور حقیر اقلیت کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انگریزوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے' ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابل' آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔ انہوں نے اراضی کی ملکیت کے نظام کو از سر نو منظم کیا اور مسلمانوں سے چھینی گئی اراضی کو ہندوؤں میں تقسیم کر دیا جو رفتہ رفتہ بڑی زمین داریوں میں تبدیل ہو گئیں۔ انگریز کے ایجنٹ کی حیثیت سے اسی فیصد کاروبار اور تجارت کا کنٹرول ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گیا۔ انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی جس کے نتیجے میں نوے فیصد سرکاری ملازمتیں انہیں حاصل ہو گئیں پیشہ ورانہ امور میں بھی انہیں مسلمانوں پر سبقت حاصل تھی۔ چنانچہ معاشرے کے تمام طبقات میں انہیں انگریز کے بعد دوسری اہم حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔

اپنی اسی نئی بالادست حیثیت کے پیش نظر ان کا رویہ غریب مسلمانوں سے یکسر تبدیل ہونے لگا' انہیں اچھوت قرار دے کر نفرت کا نشانہ بنایا گیا اب ان کی حیثیت فقط غیر ملکی حملہ آوروں کی رہ گئی تھی جنہوں نے ایک ہزار برس تک اس ملک پر حکومت کی تھی۔

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی

ان حالات کا فطری تقاضا تھا کہ ردعمل کے طور پر مسلمان ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہوں خود کو منظم کریں اور ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے از سر نو اپنی شناخت کا تعین کریں شروع شروع میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد بریلوی شہید کی سربراہی میں احیائی تحریکوں نے نہایت سخت مؤقف اختیار کرتے ہوئے انگریزی علوم و فنون سیکھنے سے بھی انکار کر دیا تھا: تاہم سر سید احمد خان' سید امیر علی اور بنگال میں نواب عبداللطیف کی کوششوں کے نتیجے میں اس مؤقف میں قدرے لچک پیدا ہو گئی۔ اس وقت تک 1857ء کے ملکہ برطانیہ کے اعلان کی رو سے انگریزوں نے مقامی آبادی کی سیاسی تعلیم اور تربیت کا عمل بھی شروع کر دیا تھا تاکہ انہیں ملک کی حکومت کے امور میں شریک کیا جا سکے۔ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا جس کا پہلا صدر ایک انگریز تھا..... انگریز چاہتا تھا کہ ہندوستان کی مقامی آبادی کو سیاسی عمل اور سیاسی طریقوں سے آشنا کیا جائے لیکن ہندو نے اس معاملے میں انگریز کو بھی مات دے دی اور انڈین نیشنل کانگریس پر کٹر مذہبی ہندو عناصر نے غلبہ حاصل کر لیا۔ ہندو راج اور ہندو تسلط کا خواب ان کے ذہنوں میں پروان چڑھ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طبقات میں چھوٹے چھوٹے اور بعض اوقات غیر اہم معاملات پر تصادم اور جھگڑوں کی نوبت آنے لگی: تاہم ان جھگڑوں اور تصادم کا بنیادی سبب' سیاسی اور مذہبی اختلاف ہی تھا۔

1905ء میں لارڈ کرزن کی جانب سے تقسیم بنگال کی اسکیم اگرچہ خالصتاً انتظامی وجوہ کی بنا پر پیش کی گئی تھی لیکن ہندوؤں کی جانب سے اس کے خلاف غیر معمولی احتجاج کیا گیا کیونکہ ایسی صورت میں مشرقی بنگال اور آسام میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جاتی (یہی مشرقی بنگال آگے چل کر مشرقی پاکستان کہلایا) کانگریس نے اس معاملے کو ایک ملک گیر مسئلے میں تبدیل کر دیا اور ہندو قوم پرستی اپنی برہنہ شکل میں سامنے آنے لگی۔ آخرکار انگریز کو ان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور بنگال کی تقسیم کا منصوبہ منسوخ کر دیا گیا۔

ہندو مسلم اصطلاحات

اس واقعہ کے ردعمل میں مسلمانوں نے بھی اپنی علیحدہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے 1906ء میں ڈھاکہ میں قائم کر لی۔ 1909ء میں ہندوؤں کے دباؤ کے نتیجے میں منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے مقامی باشندوں کو صوبائی قانون ساز اداروں میں محدود پیمانے پر نمائندگی کا حق دیا گیا تھا؛ تاہم جوابی اقدام کے طور پر انگریز حکومت نے مسلمانوں کی جانب سے محفوظ نشستوں اور "جداگانہ انتخابی حلقوں" کا مطالبہ بھی تسلیم کر لیا اس اقدام کو ہندوؤں نے پورے ہندوستان پر واحد ہندو تسلط کے خلاف سمجھتے ہوئے شدید احتجاج شروع کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے قانون ساز اداروں کے بائیکاٹ کی بھی دھمکی دے دی۔ فضا میں تلخی اور کشیدگی اور گہری ہوگئی اور باہمی رویوں میں روز بروز تلخی آتی چلی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسٹر جواہر لال نہرو نے بھی جو بعد میں بھارت کے وزیر اعظم مقرر ہوئے جولائی 1931ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس واقعہ کو "پاکستان کی پرچھائیں" سے تعبیر کیا تھا۔

ہندوؤں کی اس شدید نفرت اور مخالفت کے باوجود مسلمان کافی عرصے تک ہندو کانگریس سے تعاون کرتے رہے' تحریک خلافت کے ذریعے اور اس سے پہلے 1916ء میں قائداعظم کے اصرار پر "میثاق لکھنؤ" میں شامل ہو کر' جو آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے مابین طے پایا تھا۔ میثاق لکھنؤ میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کی توثیق کرتے ہوئے آبادی کے تناسب سے قطع نظر اسمبلیوں میں نیابت کو بھی تسلیم کیا گیا تھا لیکن 1928ء میں مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر دھوکے اور فریب کا تجربہ ہوا جب جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو نے آل پارٹیز کانفرنس کی درخواست پر تیار کئے جانے والے آئینی مسودے میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کی مکمل منسوخی کی سفارش کرتے ہوئے ایسے اقدامات تجویز کر دیئے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی بقا اور وجود کے سراسر خلاف جاتے تھے۔

دسمبر 1928ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں ان سفارشات اور تجاویز کی پرزور مخالفت کی؛ تاہم انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ قائداعظم اس واقعہ سے انتہائی دلبرداشتہ ہوئے اور اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے اور یہ تاریخی اعلان فرمایا کہ "آج سے ان کے اور ہمارے راستے الگ ہوں گے" اس رپورٹ کے جواب میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1929ء میں قائد کی قیادت میں چودہ نکات پیش کئے جو آزادی کی جدوجہد میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے کم از کم شرائط تھیں۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ مسلم لیگ اس معاملے میں کانگریس پر سبقت لے گئی اور انگریز حکومت کو "مکمل آزادی" کا مطالبہ پیش کر دیا جبکہ کانگریس "ڈومینین اسٹیٹس" کے مطالبے سے ابھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

کانگریس کے اس مخالفانہ اور غیر مصالحانہ رویئے کے باوجود مسلمانوں نے مایوسی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور تعاون کے جذبے سے کام لیتے ہوئے کانگریس کے ساتھ ایک اور معاہدے میں شریک ہو گئے جس کی رو سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء کے تحت یوپی میں منعقد ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ اور کانگریس کو مشترکہ طور پر حصہ لینا تھا جس میں کامیابی کی صورت میں دونوں جماعتوں کی مخلوط حکومت کا قیام عمل میں آتا۔ ان انتخابات میں کانگریس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی لیکن فتح کے نشے میں اس نے اپنی سابقہ حرکات کا اعادہ کرتے ہوئے ایک بار پھر فریب دہی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں سے وعدہ خلافی کی اور مخلوط حکومت میں ان کی شمولیت سے منکر ہو گئی۔ مخلوط حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کو اس نے اس بات سے مشروط کر دیا کہ وہ پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جائیں تب ہی انہیں یوپی کی مخلوط حکومت میں لینے پر غور کیا جائے گا۔ کانگریس اور ہندوؤں کی اس دہری فریب دہی نے مسلمانوں میں تلخی کا زہر گھول دیا اور ان کا یہ خدشہ یقین میں تبدیل ہو گیا کہ ہندو ذہنیت ان کی مکمل سیاسی تباہی کے درپے ہے۔ اس یقین کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں بالخصوص بہار میں جہاں کانگریسی حکومت قائم تھی مسلمانوں کو شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں جبراً ہندی زبان سیکھنے پر مجبور کیا گیا تاکہ وہ اپنی زبان اور کلچر سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق عبادت کرنے سے روکنے کی کوشش بھی کی جانے لگی۔ کانگریس کی حکومت مسلمانوں کے

لئے انگریز راج سے بھی بدتر ثابت ہوئی اور اکتوبر 1937ء کے بعد دو برسوں کے دوران ہندوستان بھر میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات کے پچاسی واقعات ہوئے۔

یہ تمام واقعات فرضی اور خیالی نہیں تھے اور نہ ہی یہ کوئی سیاسی پروپیگنڈہ تھا۔ 1938ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں' قائداعظم نے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کی داستانیں سن کر فرمایا۔ ''فرقہ وارانہ امن اور ہم آہنگی کی تمام امیدیں کانگریسی فاشزم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں'' انہوں نے مسلم لیگ کونسل کی ایک کمیٹی قائم کردی تاکہ وہ ان تکالیف اور مصائب کی تحقیقات کرے جن سے مسلمان دوچار ہو رہے تھے۔ کمیٹی نے مارچ 1939ء میں اپنی مرتب کردہ رپورٹ پیش کردی جو ''پیر پور رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہے۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ ''ہندی کے مقابلے میں اردو کا گلا گھونٹا جا رہا ہے'' ''مسلمانوں کو کانگریسی پرچم لہرانے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے' گاؤں اور دیہات کے تمام اسکولوں میں ''ودیا مندر اسکیم'' کے قومی ترانہ ''بندے ماترم'' گانے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی ایسی ہی ایک اور رپورٹ دوسری انکوائری کمیٹی نے مرتب کی تھی جو ''شریف رپورٹ'' کے نام سے معروف ہے جس میں صوبہ بہار کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے ظلم وستم کی تحقیقات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ اے۔ کے فضل الحق مرحوم نے بھی دسمبر 1939ء میں بنگال کی قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کانگریسی حکومت میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مصائب کا ذکر بڑے تلخ انداز میں کیا تھا۔ ایچ وی ہڈسن نے اپنی کتاب ''دی گریٹ ڈیوائڈ'' میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''اس بات میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ 1937ء اور 1939ء کے دوران صوبائی حکومت کا کردار دو قومی نظریئے کی اشاعت اور تحریک پاکستان کا اہم ترین سبب تھا۔''

قرارداد پاکستان

کانگریس کی جانب سے بار بار کیا جانے والا یہ معاندانہ سلوک ہی تھا جس نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر بالآخر مجبور کردیا کہ علیحدگی ہی اس صورتحال کا واحد حل ہے یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے فروری 1940ء میں اپنے اجلاس منعقدہ دہلی میں یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کے مارچ 1940ء کے لاہور اجلاس میں اس مطالبے کو قرارداد کی شکل میں پیش کیا جائے گا۔

یہ قرارداد 23 مارچ 1940ء کو جناب فضل الحق نے پیش کی جو اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ 24 مارچ 1940ء کو یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کرلی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ......

> ''آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ملک کا کوئی آئینی منصوبہ اس وقت تک قابل عمل یا قابل قبول نہیں ہوگا جب اسے مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کے مطابق وضع نہ کیا جائے۔ جغرافیائی اعتبار سے ملحقہ وحدتوں کی علاقائی ردوبدل کرتے ہوئے اس طرح حد بندی کی جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے ''آزاد ریاستوں کے ایک گروپ کی شکل اختیار کرلیں جس میں تمام تشکیلی وحدتیں آزادی اور خودمختاری کے ساتھ کام کرسکیں''۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اس قرارداد میں لفظ ''پاکستان'' کہیں استعمال نہیں ہوا بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ''وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' آزاد ریاستوں کی حیثیت سے تشکیل دیئے جائیں'' تاہم اپریل 1946ء کو دہلی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے اجلاس میں اس قرارداد میں درج ذیل ترمیم کردی گئی تھی۔

''شمال مشرق میں واقع بنگال اور آسام' نیز پنجاب سرحد' سندھ بلوچستان ایک ایسے' پاکستانی'' علاقے ہیں جہاں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں چنانچہ اس تمام علاقے کو آزاد اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے تشکیل دیتے ہوئے اس امر کی واضح یقین دہانی کرائی جائے کہ مزید کسی تاخیر کے پاکستان کا قیام عمل میں لایا جائے گا''۔

بہار میں خونریز بلوے

ہر چہ بادا باد کے مصداق' حصول پاکستان کی حمایت ہی اب وہ واحد شرط تھی جس پر مسلم لیگ آزادی کی جدوجہد میں کانگریس سے تعاون اور شرکت پر رضامند ہوسکتی تھی اس مطالبے کی نامنظوری کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ یا متبادل نہیں تھا کہ وہ اپنی بقا اور قومی وجود کے تحفظ کے لئے ہر اس آئین کے نفاذ کی پرزور مخالفت اور مزاحمت کریں جسے'' متحدہ ہندوستان'' کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔

بنگال سے تعلق رکھنے والے مسلمان ارکان اسمبلی نے قرارداد میں اس ترمیم کی پرزور حمایت کی جس کے بعد یہ مسلم لیگ کا بنیادی موقف اور نعرہ بن گیا یعنی'' مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطہ وطن۔ اس کے سوا کچھ نہیں''۔

اگر اس موقف کو کسی مزید جواز کی ضرورت تھی تو وہ بھی ہندوؤں نے 1942ء کے اوائل میں فراہم کر دیا جب انہوں نے عید الاضحی کے دوران گائے کے ذبیحے کے سوال پر صوبہ بہار میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جس میں ہزاروں مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ عورتوں نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی جبکہ بے شمار لوگ اپنی جان بچانے کی خاطر یہاں سے ہجرت کر گئے۔

خوش قسمتی سے' کانگریس کے زیر حکومت دوسرے صوبوں کے مسلمان اس خوں ریزی اور تباہی سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ کانگریس نے اگست 1942ء میں ہندوستان پر متوقع جاپانی حملوں کے تناظر میں انگریز حکومت کے خلاف'' ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس تحریک کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری عمل میں آئی جس کے بعد صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ قائداعظم نے

اس واقعہ پر'' یوم نجات'' منانے کا اعلان کیا اور برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کے بعد چھوڑ دے۔

کیبنٹ مشن اور دیگر تجاویز

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے اور برطانیہ میں لیبر گورنمنٹ کے برسر اقتدار آنے کے نتیجے میں انگریز سرکار کی پالیسی میں بھی تبدیلی آ گئی۔ کانگریسی رہنماؤں کو قید سے آزاد کر دیا گیا اور سیاسی تصفیے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نئی تجاویز کے ہمراہ ہندوستان آئے جن سے اس برصغیر میں دو آزاد ممالک کے قیام کی امیدوں کو تقویت ملی: تاہم کانگریس نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا جس کے بعد'' ویول پلان'' سامنے آیا جس کی رو سے فوری طور پر ایک عارضی حکومت کا قیام اور تشکیل عمل میں لائی جانی تھی اس سے پہلے 1945ء میں انتخابات منعقد ہوئے اور مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی؛ تاہم اس کے باوجود کانگریس کا یہ دعویٰ بدستور موجود تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نمائندگی کرتی ہے جس کے نتیجے میں ڈیڈ لاک کی صورتحال پیدا ہو گئی۔

ان حالات کے پیش نظر برطانوی سرکار نے'' کیبنٹ مشن'' کو اس مسئلے کو حل تلاش کرنے کی غرض سے ہندوستان بھیجا جس نے ایک فوری عارضی حکومت کے قیام کی اسکیم پیش کر دی جس میں ہندو اور مسلمان' مساوی تعداد میں شریک ہوتے اور ایک طویل المیعاد منصوبے کے مطابق ایک ایسی سہ وحدتی اور مربوط فیڈریشن کا قیام عمل میں آتا جس میں مرکز کے پاس صرف تین شعبے ہوتے یعنی امور خارجہ' دفاع اور مواصلات اور تین گروپوں میں مشتمل یہ صوبے جنہیں ریاستوں کا درجہ دیا جاتا ہندو اور مسلم اکثریتی بنیادوں پر قائم کیے جانے تھے۔ یہ منصوبہ اپنی بعض خامیوں اور نقائص کے باوجود مسلم لیگ کونسل نے 6 جون 1946ء کو منظور کر لیا جبکہ کانگریس نے ایک ماہ بعد طویل المیعاد تجاویز کی منظوری کا اشارہ دیتے ہوئے حسب عادت ذہنی تحفظات کا اظہار کیا اور عارضی حکومت کی تشکیل کا منصوبہ مسترد کر دیا۔ کانگریس کی جانب سے انحراف اور حیلہ جوئی کا یہ رویہ بعض ایسے شکوک کا سبب بنا جس کی تصدیق بہت جلد کانگریس کی اس تعبیر و تشریح سے ہو گئی جو اس اسکیم کے حوالے سے کی گئی تھی جس میں عارضی حکومت کی تشکیل کو مسترد کیا جانا بھی شامل تھا۔

ہندوستان کوایک وفاقی صورت میں متحد رکھنے کی یہ آخری امید تھی جسے انڈین نیشنل کانگریس نے خاک میں ملا دیا حالانکہ انگریز سرکار نے مرکز میں ایک عارضی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی تھی چنانچہ ردعمل کے طور پر مسلم لیگ نے حصول پاکستان کے لئے راست اقدام کا مطالبہ کر دیا۔

اس راست اقدام کے لئے 14 اگست 1946ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ یوم راست اقدام منانے کے لئے جلسے اور جلوسوں کے ذریعے مسلم لیگ کے مؤقف کی بھرپور ترجمانی کا پروگرام بنایا گیا تھا جسے ناکام کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ خصوصاً کلکتہ میں مسلم لیگ کے جلوسوں پر حملے کئے گئے اور ان کے جلسوں میں گڑبڑ کی گئی تا کہ اس راست اقدام کو ہر ممکن طریقے سے کچل دیا جائے۔ مسلسل چار دنوں تک بلوے اور فسادات ہوتے رہے۔ پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ اگر کہیں اس نے کوئی ایکشن لیا بھی تو وہ قطعاً غیر مؤثر ثابت ہوا۔ مسلح ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیئے۔ ہندو علاقے میں رہنے والے کسی بھی مسلمان کو نہیں چھوڑا گیا۔ گلیاں اور محلے انسانی لاشوں سے پٹ چکے تھے۔ راست اقدام کے نتیجے میں شروع ہونے والے ان ہندو مسلم بلوؤں اور فسادات میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بیس ہزار انسانی جانوں کا اتلاف ہوا۔ اس کے باوجود قتل و غارت کے یہ واقعات کسی نہ کسی طور پر قیام پاکستان تک مسلسل جاری رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ تھا جو کسی طور پر ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ ان ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات میں مزید سینکڑوں ہزاروں افراد کی جانیں ضائع ہوئیں ان بہیمانہ اور وحشت ناک خون آشامیوں کے بعد اس کے سوا اور کوئی راستہ سوائے اس کے نہ تھا کہ ہندوستان کو ہر صورت میں تقسیم کر دیا جائے۔ انگریز اور ہندو دونوں برصغیر کی تقسیم کے مخالف تھے۔ برطانوی مصنف رسل برائنز نے پاک بھارت تنازع پر اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ''آخر کار کلکتہ میں ہجوم کی طاقت نے برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا'' بہر حال جو بات وہ لکھنا بھول گئے وہ یہ تھی کہ یہ ہجوم مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہندوؤں کا تھا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ

اگست 1947 تا اکتوبر 1958

پاکستان کے وجود میں آنے کی تاریخ پرتشدد تھی جو بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ مزید پرتشدد ہوتی گئی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بڑھتے ہوئے واقعات کی وجہ سے انگریزوں کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ واقعات ختم ہونے والے نہیں ہیں اور ان کے حل ہونے کی کوئی امید بھی نظر نہیں آتی۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بھی وہ تھک چکے تھے اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی عبوری انتظام کے تحت ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کر کے یہاں سے چلے جائیں اور ہندوستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

اس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول نے اکتوبر 1946ء میں ایک مجلس آئین ساز قائم کی اور کوشش کی ایک عبوری حکومت قائم ہو جائے لیکن ان کی کوشش ناکام ہوئی اور ایک سیاسی تعطل پیدا ہوتا نظر آنے لگا۔ انگریزوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سیاسی تعطل کے نتیجے میں ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور انگریزوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ وہ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ انہوں نے خفیہ طور پر برطانوی حکومت کی مرضی سے مارچ 1948ء میں واپس جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا (دی گریٹ ڈیوائڈ از ایچ وی ہڈسن)

18 دسمبر 1946ء کو برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ وہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیج دیں۔ اسے توقع تھی کہ وہ اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے اس کام میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں ویول ناکام رہے تھے۔ نامزد وائسرائے نے بھی سوچا کہ جب تک برطانیہ ہندوستان میں برطانوی راج ختم کرنے کی تاریخ کا اعلان نہیں کرتا اس وقت وہ بھی کوئی مفید کام نہیں کر سکتے۔ پہلے تو وزیر اعظم نے کچھ پس و پیش کی لیکن نامزد وائسرائے کے زور دینے

پر انہوں نے 20 فروری 1947ء کو پارلیمنٹ میں مندرجہ ذیل اعلان کیا:۔

ہز میجسٹی کی حکومت یہ بات واضح کرنا چاہتی ہے کہ وہ برصغیر کی حکومت جون 1948ء سے پہلے ہندوستان کے ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنا چاہتی ہے۔

اگر یہ ظاہر ہوا کہ مقررہ تاریخ تک نمائندہ اسمبلی ایسا دستور (جس کی کیبنٹ مشن نے تجویز پیش کی تھی) نہیں بنا سکے گی تو پھر ہز میجسٹی کی حکومت یہ فیصلہ کرے گی کہ برطانوی ہند کی مرکزی حکومت کے اختیارات اس تاریخ تک کس کے حوالے کئے جائیں اور آیا یہ مرکزی حکومت کی شکل میں دیے جائیں یا کچھ علاقوں میں موجود صوبوں کو اختیارات دیے جائیں یا کسی اور ایسے طریقے سے اختیارات حوالے کئے جائیں جو سب سے زیادہ مناسب معلوم ہو اور برصغیر کے لوگوں کے مفاد میں ہو"۔

لارڈ اور قائد میں تلخی

اس اعلان کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 مارچ 1947ء کو نئی دہلی آ گئے اور انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ اپنے پیشرو کی طرح ان کی بھی پہلی ترجیح یہ تھی کہ ہندوستان متحد رہے۔ اس لئے انہوں نے یہ کوشش کی کہ قائداعظم اپنے مؤقف میں تبدیلی کر لیں۔ وائسرائے کی حیثیت سے وہ جانتے تھے کہ اس صورتحال کا حل ان (قائد) ہی کے پاس ہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ بحث مباحثے سے قائد کو قائل نہیں کیا جا سکا تو وہ عاجز آ گئے اور اس طرح دونوں شخصیات میں محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ دونوں کے طرز عمل میں سختی آ گئی اور ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ قائد مناسب بات نہیں کر رہے۔ اس طرح ان کے اور جواہر لال نہرو کے درمیان وابستگی پیدا ہو گئی جو بڑھ کر ذاتی تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔

ماؤنٹ بیٹن کا انتقام

قائد کی طرف اس طرح کا طرز عمل اختیار کرنے میں انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ ان کے اور جواہر لال نہرو کے خیالات میں کوئی تضاد نہیں تھا مگر وہ تمام رعایتیں قائد ہی سے چاہتے تھے۔ قائد اپنے مؤقف سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے کیونکہ انہیں کانگریس کے راج کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور مسلمان ہندوؤں کی دائمی غلامی پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے تقسیم ناگزیر تھی مگر سوال یہ تھا کہ تقسیم کس طرح کی جائے اور اس معاملے میں ماؤنٹ بیٹن نے اپنا انتقام لیا۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم کے لئے جو دلیل دی جا رہی ہے وہی دلیل بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ قائد نے ان سے گزارش کی کہ انہیں کٹا پھٹا پاکستان نہ دیا جائے۔ مگر وائسرائے اپنی ضد پر اڑے رہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کانگریس کا پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ ایک دھوکہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے خوفزدہ

ہو کر قائد پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے قائد کا طرزِ عمل مزید سخت ہو جائے گا کیونکہ ایسے رہنما ان دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہو سکتے تھے۔ افسوس وائسرائے کے طرزِ عمل میں آخر وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر اسے قبول نہ کیا گیا تو وہ کانگریس کو ہندوستان کا اقتدار سونپ دیں گے کیونکہ برطانیہ کو ہر صورت میں اقتدار چھوڑنا ہے اس طرح مسلمانوں کو ایک کٹا پھٹا پاکستان مل سکا جس میں ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعے مزید کمی کردی گئی اس میں مسلم اکثریت کے دو ضلع پنجاب میں گورداس پور اور بنگال میں مرشد آباد جو شروع میں پاکستان کو دیئے تھے ان سے لے لئے گئے۔

برصغیر کی تقسیم کو منصوبے کا فریقین کی طرف سے قبول کئے جانے کی شرط کے ساتھ 3 جون 1947ء کو دارالعوام میں اعلان کردیا گیا لیکن وائسرائے نے کانگریس کا یہ مطالبہ مان کر کہ دونوں مملکتوں کے قیام کی تاریخ جون 1948ء سے پہلے کردی جائے قائد کے ساتھ اپنی دشمنی کا دوبارہ اظہار کیا۔ یہ تاریخ 20 فروری 1947 کے اعلان میں بتائی جاچکی تھی مگر اس تاریخ کو 1947ء کی کسی تاریخ میں تبدیل کردیا گیا۔ اگر یہ تاریخ دسمبر 1947ء میں رکھی جاتی جب بھی کانگریس مطمئن ہو جاتی لیکن وائسرائے نے 15 اگست 1947ء کی تاریخ کا انتخاب اپنی مرضی سے کیا تھا۔ مسلم لیگ سے بھی کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان مشکلات کا کوئی خیال کیا گیا جو پاکستان کو صرف 72 دن میں نئی حکومت قائم کرنے میں پیش آئیں گی۔ اس نامناسب جلد بازی کی نہ وائسرائے اور نہ ہی کسی اور نے کوئی وجہ بتائی۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ سوچا ہو کہ حکومت قائم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ بھارت اور پاکستان دونوں ان کو اپنا مشترکہ گورنر جنرل بنائیں گے اور وہ آئین سازی کی سپریم اتھارٹی ہوں گے جنہیں تقسیم کے نتیجے میں پیش آنے والے اختلافات کو حل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔ انڈیا کی حکومت کے اثاثوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم اور پاکستان کی نئی مملکت کے قیام کے سلسلے میں ان اختلافات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ لیکن جب قائد نے انہیں پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کرنے سے انکار کردیا اور تجویز دی کہ وہ وائسرائے یا برطانیہ کا نمائندہ رہ کر دونوں مملکتوں کے گورنر جنرلوں کے درمیان ثالثی کی ذمہ داری ادا کریں تو ماؤنٹ بیٹن کی انا کو ٹھیس پہنچی اور وہ یکا یک کمرے سے باہر چلے گئے اور یہ کہتے ہوئے گئے" اس کی قیمت تمہارے تمام اثاثے اور پاکستان کا مستقبل ہوگا"۔ (ایچ دی ہڈسن کی کتاب دی گریٹ ڈوائڈ صفحہ 331)

تبادلہ آبادی کا مسئلہ

بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی اس دھمکی کو فوری طور پر عملی جامہ پہنچایا' اس نئی قوم کو صرف اس وجہ سے ہی انتظامی اور مالیاتی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بھارت کی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا کے قابلِ منتقلی اثاثوں میں سے کچھ بھی دینے سے انکار کردیا اور وہ بیس کروڑ کی رقم بھی ادا نہیں کی جو موجودہ کیش بیلنس سے عبوری طور پر دینے کا فیصلہ ہوا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بنگال اور پنجاب میں جنونی ہندوؤں نے قتل و غارت کا بازار گرم کردیا تھا تاکہ وہ ان صوبوں کے ان علاقوں سے مسلمانوں کو نکال سکیں جو تقسیم کے نتیجے میں بھارت کے حصے میں آئے تھے اس کے باعث پاکستان کے علاقوں میں بھی فسادات شروع ہوگئے اس طرح لاکھوں پناہ گزیں دونوں طرف سے سرحد عبور کرنے لگے۔ قائداعظم اور جواہر لال نہرو دونوں نے اپیل کی کہ مارشل لا لگادیا جائے یا سول انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج کو بھیج دیا جائے مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جولائی سے فسادات جاری رہے' گڑگاؤں اور دہلی میں تو فسادات وائسرائے سے بالکل قریب ہو رہے تھے' وائسرائے سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک تمام برطانوی افسران مداخلت سے بچ رہے تھے۔ انہوں نے کوئی سخت اقدام نہیں اٹھایا اور وجہ یہ بتائی کہ اتنے بڑے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ان کے پاس کافی فوج موجود نہیں ہے انہوں نے مزید کہا کہ یہ کوئی معمولی سیاسی یا فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہیں جنہیں امن و امان قائم کرنے کے عام ذرائع سے روکا جاسکے کیونکہ دونوں فرقے ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر پنجاب کے گورنر نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

"بادشاہ کے تمام گھوڑے اور تمام سپاہی بھی ان فسادات کو نہیں روک سکتے اگرچہ وہ سزا دینے کی اہلیت تو رکھتے ہیں۔ ان فسادات میں ملک کے گاؤں گاؤں میں دونوں

فرقوں کے افراد ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہیں'' (ایچ وی ہڈسن کی کتاب دی گریٹ ڈیوائڈ' صفحہ 342)

اس پریشانی میں پارٹیشن کونسل نے جو 22 جولائی 1947ء کو تقسیم پر عمل درآمد کرانے کے لیے قائم کی گئی تھی' پنجاب باؤنڈری فورس قائم کی جس میں 55 ہزار افسران اور جوان شامل تھے جو میجر جنرل ٹی ڈبلیو ریس کے ماتحت تھے۔ اگرچہ اس کے عملے میں کچھ انگریز افسران بھی شامل تھے مگر ان میں کوئی برطانوی یونٹ شامل نہیں تھا کیونکہ ہندوستان میں جو بھی برطانوی فوجی موجود تھے انہیں کسی بھی کارروائی سے علیحدہ رکھا گیا تھا کیونکہ انہیں بتدریج وطن واپس بھیجا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کو ان فسادات کی کوئی فکر نہیں تھی جو وہ چھوڑ کر جا رہے تھے کیونکہ وہ یہاں سے جانا طے کر چکے تھے' باؤنڈری فورس بالکل بے اثر رہی کیونکہ یہ خود بھی فرقہ وارانہ تعصب سے پاک نہیں تھی اور 15 اگست 1947ء کو اسے ختم کر دیا گیا۔

15 اگست سے پہلے ہی لاکھوں آدمی قتل ہو چکے تھے اور لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے محروم ہو گئے تھے۔ وہ پناہ گزیں بن کر ہجرت کر رہے تھے' اس کے بعد ہر دن مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا' پاکستان کو خوفناک قربانی دینی پڑی' اپنے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اسے آبادی کی منتقلی کے سنگین مسئلے سے دوچار ہونا پڑا جو اس پر ہندوؤں نے نہ صرف پنجاب بلکہ بنگال میں بھی مسلط کر دیا تھا۔ رقم کے بغیر اثاثوں اور بغیر کسی حکومتی نظام کے پاکستان نے اس طوفان کا کس طرح مقابلہ کیا' یہ ایک معجزہ ہے۔

انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کو 15 جولائی 1947ء کو شاہی منظوری حاصل ہوئی اور 19 جولائی کو نئی دہلی میں دونوں مملکتوں کی عبوری حکومتیں قائم کی گئیں۔ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم ہوئے اور بھارت کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن بنے' نواب زادہ لیاقت علی خان پاکستان کے وزیراعظم بنے۔ حکومت میں مشرقی پاکستان کی نمائندگی صرف دو حضرات تک محدود رہی جو دہلی میں ان دنوں مقیم تھے۔ یہ فضل الرحمن اور جوگیش چندر منڈل تھے جو شیڈولڈ کاسٹ کے رکن تھے' یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ بھارت کی عبوری حکومت دہلی میں قائم کی گئی تھی۔ اس میں بھی بنگال سے ایک مسلمان نمائندہ لیا گیا' بنگال میں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ پاکستان کی اصل شکل تو ریڈکلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد سامنے آئی تھی۔

پاکستان کے لیے ایک نئی آئین ساز اسمبلی قائم کی گئی تھی پہلے والی آئین ساز اسمبلی

میں سندھ اور صوبہ سرحد سے جو مسلم اراکین منتخب ہوئے تھے انہیں برقرار رکھا گیا لیکن بنگال اور پنجاب سے نئے اراکین منتخب ہونا تھے تاکہ وہ ان علاقوں کی نمائندگی کر سکیں جو پاکستان میں آتے ہیں۔

بلوچستان' قبائلی علاقوں اور پاکستان میں شامل ہونے والی ریاستوں کی نمائندگی کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا' اس وقت پاکستانیت کا جذبہ اس قدر زیادہ تھا کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں، اشتیاق حسین قریشی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جن کا پاکستان میں کوئی حلقہ انتخاب نہیں تھا نہایت خوشی کے ساتھ مشرقی پاکستان سے نشستیں پیش کر دی گئیں اور وہاں کے مسلمانوں کے تعاون سے وہ مجلس قانون ساز کے اراکین منتخب ہو گئے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی (گواہ نمبر 106) نے کہا: ''تمام مسلمانوں میں اسلام اور اتحاد کا جذبہ اتنا مضبوط تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کس شخص کا کہاں سے تعلق ہے'' بنگالیوں نے خوشی کے ساتھ اپنی نشستوں کی قربانی دی اور غیر بنگالیوں کے حق میں اپنے ووٹ ڈالے۔''

انتظامیہ کی بے سروسامانی اور کشمیر

یہ اسمبلی 26 جولائی 1947ء کو وجود میں آئی' اسے دو فرائض انجام دینے تھے ایک آئین ساز اسمبلی کا اور دوسرا وفاقی قانون ساز ادارے کا۔ عبوری حکومت کراچی منتقل ہوگئی اور 69 اراکین پر مشتمل آئین ساز اسمبلی کا اجلاس کراچی میں پہلی بار 10 اگست 1947ء کو منعقد ہوا' 11 اگست کو اس کے اجلاس میں قائداعظم کو صدر اور مولوی تمیزالدین کو وفاقی قانون ساز اسمبلی کا اسپیکر منتخب کیا گیا۔ اس وقت کسی اسمبلی کے لیے بھی زیادہ کام نہیں تھا کیونکہ اس وقت نئی حکومت قائم کرنے کا اور بھارت سے آنے والے مہاجرین کی آبادکاری کا کام اتنا زیادہ تھا کہ دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا تھا' کراچی میں اگرچہ سندھ حکومت کی کچھ عمارتیں موجود تھیں جنہیں انتظامیہ کا مرکز بنایا جاسکتا تھا مگر مشرقی پاکستان ان سہولتوں سے بھی محروم تھا۔ وہاں نہ صرف یہ کہ عمارتیں نہیں تھیں بلکہ فرنیچر' کاغذ اور پنسلیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ اگرچہ اس کا مہاجرین کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں تھا جتنا مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں کا تھا لیکن بہاریوں کی بہت بڑی تعداد مشرقی پاکستان منتقل ہوگئی اور تعلیم یافتہ درمیانہ طبقے کے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اور ہندو سرکاری عملہ مشرقی پاکستان سے چلا گیا تھا۔ ان غیر معمولی مسائل سے حکومت کے معمول کے اختیارات کے ساتھ نہیں نمٹا جاسکتا تھا اس لیے ایمرجنسی کا اعلان کیا گیا اور کابینہ کی ایمرجنسی کمیٹی قائم کردی گئی تاکہ ان ہنگامی مسائل کو حل کیا جاسکے' خوش قسمتی سے پاکستان کو قائداعظم اور ان کے دست راست نواب زادہ لیاقت علی خاں کی قیادت نصیب ہوئی تھی۔ ملک کو ان دونوں کے مشوروں سے ہی چلایا جارہا تھا اور گورنر جنرل کو 1947ء کے انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ کے تحت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ ان کی لائق رہنمائی میں سرکاری مشینری رفتہ رفتہ حرکت میں آ گئی۔ صوبوں میں وزارتیں قائم کی گئیں اور ایک طرح کا نظام قائم ہونا شروع ہوگیا تھا کہ ملک کو ایک دھچکے سے دوچار ہونا پڑا یہ کشمیر کے مہاراجہ کا بھارت میں شامل ہونے کا 27 اکتوبر

1947ء کا اقدام تھا جو اس سے پہلے پاکستان سے کئے گئے معاہدات جوں کے توں رکھنے کے معاہدے کی خلاف ورزی تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے اس کام کے پیچھے ماؤنٹ بیٹن کا ہاتھ تھا۔ یہ سیبوں کی ٹوکری کے 560 سیبوں میں دیسی ریاستوں سے ایک تھا جسے انہوں نے تقسیم کا منصوبہ قبول کرنے کے عوض سردار پٹیل کو فروخت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بھارت نے مہاراجہ کے فیصلے کا بہانہ بنا کر اپنی افواج کشمیر میں اتار دیں تاکہ مہاراجہ کی مدد کی جاسکے جسے اپنی مسلم رعایا کی بغاوت کا سامنا تھا جن کی ریاست میں بھاری اکثریت تھی اس مسئلے کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان 1948ء میں پہلی جنگ کشمیر میں ہوئی' دونوں فوجوں میں جھڑپیں تیز ہوئیں اور صورت حال نہایت سنگین ہوگئی لیکن جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ نے جنگ بندی کرادی اس کی وجہ سے کشمیر کا ایک حصہ جنگ بندی لائن کے اس طرف باقی بچ گیا لیکن کشمیر کا جھگڑا اب بھی بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم ابھی تک 1949ء کی جنگ بندی لائن پر قائم ہیں۔

نئی مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ

ان اہم واقعات کی وجہ سے ملک کی سیاسی سرگرمیوں کو عارضی طور پر دھچکا پہنچا؛ تاہم قائداعظم نے 15 ستمبر 1948ء کو فیصلہ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ختم کر کے آل پاکستان مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ اگلے سال اپریل میں نئی مسلم لیگ کی کونسل کا پہلا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا' بدقسمتی سے مشرقی پاکستان میں پہلا سیاسی اختلاف' اسی مسلم کونسل کی تشکیل پر رونما ہوا۔ پنجاب سے منتخب ہونے والے کونسلروں کا تعلق پنجاب کے مختلف ضلعوں سے تھا جو اب پاکستان میں شامل تھے جنہوں نے "پنجاب پراونشل مسلم لیگ کونسل" قائم کرنے کا اعلان کر دیا تھا:

بنگال کی سیاسی صورتحال

تاہم مشرقی بنگال میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ یہ صوبہ پہلے ہی اپنے نام سے جانا پہچانا تھا۔ وہاں پرانی کونسل کو تحلیل کر کے نئی کونسل کا انتخاب کیا گیا' جس کے سربراہ' خواجہ ناظم الدین تھے جو مشرقی بنگال کے وزیراعلیٰ مقرر ہوئے' حسین شہید سہروردی کو کونسل سے برطرف کر دیا گیا جس پر پرانی کونسل نے' برہمی کا اظہار کرتے ہوئے عوامی مسلم لیگ کا نام اختیار کر لیا اور سہروردی کو ان کی عدم موجودگی میں اس کا سربراہ منتخب کیا گیا جو اس وقت صوبہ سرحد میں' مرحوم پیر صاحب آف مانکی شریف کے ساتھ کام کر رہے تھے' مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن دونوں اس نئی سیاسی جماعت کے اہم رکن تھے' بعد میں جب پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی تو بائیں بازو کے عناصر' مولانا بھاشانی کے گرد جمع ہو گئے جو پہلے تو عوامی مسلم لیگ کے اندر ہی بائیں بازو کے ایک سیل کے طور پر شامل رہے؛ تاہم بعد میں انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت قائم کر لی۔ عوامی مسلم لیگ اور آل

پاکستان مسلم لیگ کے پروگراموں میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ عوامی مسلم لیگ نے اپوزیشن پارٹی کی حیثیت اختیار کر لی اور حکومت سے تصادم کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس طرح مشرقی بنگال میں خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کے درمیان محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا۔

پنجاب کی سیاسی صورتحال

پنجاب میں بھی' سیاسی صورت حال' کسی طور اطمینان بخش نہیں تھی! نواب آف ممدوٹ جنہیں قائداعظم نے کابینہ کی تشکیل کی دعوت دی تھی' بہت جلد اپنی ہی کابینہ کے ان اراکین کی مخالفت کا نشانہ بن گئے جن کی سربراہی میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور سردار شوکت حیات خان کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں قائداعظم کی تمام مصالحانہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں اور پنجاب مسلم لیگ کے صدارتی انتخاب میں' پنجاب کے وزیراعلیٰ نواب آف ممدوٹ بھی شکست کھا گئے۔

میاں ممتاز دولتانہ اب پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے منتخب صدر تھے۔ نواب آف ممدوٹ کی سیاسی حیثیت بے حد کمزور ہو چکی تھی جسے دیکھتے ہوئے مرکزی حکومت کے پاس' اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ گورنمنٹ آف پاکستان ایکٹ کی دفعہ A-93 کے تحت اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ان کی وزارت کو برطرف کر کے پنجاب میں گورنر راج نافذ کر دے۔

سندھ کی سیاسی صورتحال

سندھ میں بھی سیاسی صورت حال کم و بیش ایسی ہی تھی کرپشن کے الزامات کے تحت سندھ کے وزیراعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کو برطرف کر دیا گیا تھا ان کی جگہ مئی 1948ء میں پیر الٰہی بخش کو صوبے کا وزیراعلیٰ مقرر کیا گیا...... بہرحال صوبائی مسلم لیگ پر' کھوڑو کا اثر و رسوخ' بدستور قائم تھا چنانچہ وہ اس کے صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے اور مسلم لیگ کونسل میں اپنی اکثریت کی بنا پر انہوں نے کراچی کو وفاقی دارالحکومت بنائے جانے کے سوال پر سندھ حکومت کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا کیونکہ اس طرح کراچی' وفاقی حکومت میں تحویل میں چلا جاتا...... انہوں نے

ایک ''الیکشن کمیٹی'' بھی قائم کی جس کا مقصد صوبائی حکومت کے خلاف اقدام کرنا تھا: تاہم قائداعظم نے مشرقی پاکستان کے دورے سے واپسی پر محمد ایوب کھوڑو کو اس احتجاج سے روک دیا۔ اس کے باوجود' حکومت سندھ اس مشکل صورت حال سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ 1946ء میں منعقد ہونے والی انتخابات میں' بدعنوانیوں کی تحقیقات کرنے والے الیکشن ٹریبونل کے فیصلے کی رو سے پیر الٰہی بخش اپنی نشست سے محروم ہو چکے تھے ان کے جانشین مسٹر یوسف ہارون' زیادہ عرصہ تک تھے اس عہدے پر کام نہ کر سکے جس کے بعد قاضی فضل اللہ کو سندھ کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا لیکن انہیں بھی محمد ایوب کھوڑو نے بہت جلد اقتدار سے محروم کر دیا جن کی کرپشن کے الزامات میں نا اہلی کو چند تکنیکی وجوہات کی بنا پر چیف کورٹ آف سندھ کے ایک فیصلے کے مطابق' نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دوبارہ سندھ کی وزارت اعلیٰ کے منصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انہیں ایک مرتبہ پھر کرپشن کے الزامات میں برطرف کر دیا گیا اور سندھ میں گورنر راج قائم کر دیا گیا۔

وزیر اعلیٰ سرحد کا رویہ

شمال مغربی سرحدی صوبے میں آزادی سے پہلے کانگریسی حکومت قائم تھی جس کے سربراہ ڈاکٹر خانصاحب تھے۔ صوبے میں پاکستان سے الحاق کے لیے ہونے والے ریفرنڈم میں بہت بڑی اکثریت کے اس فیصلے کے باوجود کہ وہ پاکستان میں شمولیت چاہتی ہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے وزیر اعلیٰ کے منصب سے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کی تھی چنانچہ 14 اگست کو انہوں نے پرچم کشائی کی تقریب میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے پختونستان تحریک بھی شروع کر دی جس کے نتیجے میں قائداعظم کے احکام پر ان کی وزارت برطرف کر دی گئی اور صوبائی مسلم لیگ کے لیڈر خان عبدالقیوم خان کو صوبے کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا ان کا طرز حکومت اس قدر آمرانہ تھا کہ ان کے سیاسی مخالفین ان پر جمہوریت کی تباہی کے الزامات عائد کرنے لگے تھے۔

مرکز میں بھی قائداعظم کی تشکیل کردہ پہلی کابینہ کے قیام کے بعد سے ہی' بے اطمینانی کا احساس پیدا ہو چلا تھا اپنی کابینہ میں باصلاحیت افراد کی شمولیت کے پیش نظر وہ مجبور ہو گئے تھے کہ سر ظفر اللہ خان' نواب مشتاق احمد خان گورمانی اور غلام محمد جیسے لوگوں کو بھی حکومت میں شامل کر لیں جو کبھی مسلم لیگ کے رکن نہیں رہے۔ مغربی صوبے میں ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ معاملات اسی طرح چلتے رہیں انہیں اس صورت حال پر کسی قسم کی تشویش نہیں تھی کیونکہ کہ انہیں قائداعظم اور قائد ملت کی قیادت اور فراست پر مکمل یقین تھا۔

مشرقی پاکستان میں مطالبے کا آغاز

مشرقی پاکستان میں جہاں صورت حال زیادہ تشویش ناک نہیں تھی' مسلم لیگ حکومت کے خلاف تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑتی جا رہی تھی اپوزیشن پارٹیوں نے زبان کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے یہ

مطالبہ کیا کہ بنگالی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے' قائداعظم کو علالت اور بگڑتی ہوئی صحت کے باوجود اپریل 1948ء میں مشرقی پاکستان کا دشوار گزار سفر اختیار کرنا پڑا جہاں پہنچ کر انہوں نے اس تنازع کے حوالے سے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ "بنگالی زبان" مشرقی پاکستان کی زبان رہے گی؛ تاہم پاکستان کی قومی زبان کا درجہ اردو ہی کو حاصل رہے گا کیونکہ ایک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم باہمی طور پر مضبوط اور مستحکم ہو کر ترقی نہیں کر سکتی"...... وقتی طور پر ان کی اس بات کا مثبت اثر ہوا......

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقسیم کے بعد مغربی صوبوں میں بڑے وسیع پیمانے پر آبادی کا تبادلہ عمل میں آیا تھا جب کہ مشرقی صوبے میں اب بھی ڈیڑھ کروڑ کی تعداد میں ہندو موجود تھے جس سے اس شبہ کو تقویت ملی کہ زبان کے مسئلے کو ابھارنے میں ان کے اثر و رسوخ کو بھی کافی دخل ہے۔ درحقیقت وہ اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مشرقی پاکستان میں خدمات انجام دینے والے سینئر سرکاری اہلکار اور حکام کی ایک بڑی تعداد کا تعلق یا تو پنجاب سے تھا یا پھر یو پی سے جن کی اکثریت بنگالی زبان سے ناآشنا تھی۔

فرقہ وارانہ فسادات اور نہرو' لیاقت پیکٹ

مشرقی پاکستان میں آباد ہندو آبادی سیاسی طور پر بھی سرگرم ہو چکی تھی اور اس نے حکومت کی مخالف سیاسی جماعتوں میں شمولیت شروع کر دی تھی۔ بالخصوص عوامی مسلم لیگ میں جس کا نام اس وقت بدل کر عوامی لیگ رکھ دیا گیا تھا تاکہ ہندوؤں کو بھی اس جماعت میں شامل کرنے کی طرف راغب کیا جا سکے تاہم بڑھتی ہوئی مخالفت کے باوجود مشرقی پاکستان میں مسلم لیگی حکومت اپنا اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب رہی تھی اسی دوران پوری قوم کو شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا اور 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

خواجہ ناظم الدین کو ان کی جگہ گورنر جنرل مقرر کیا گیا جو کراچی روانہ ہو گئے اور ان کی بجائے نورالامین کو مشرقی پاکستان کا وزیراعلیٰ بنا دیا گیا۔ اگرچہ وہ ایک منجھے ہوئے سیاست دان تھے؛ تاہم وہ عوام سے خاطر خواہ رابطہ برقرار نہ رکھ سکے اور روز بروز اس میں مزید کمی واقع ہوتی چلی گئی۔ ان کی اصل مشکلات کا آغاز 1950ء میں اس وقت ہوا جب مغربی بنگال میں ہونے والے مسلم فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمان مہاجرین مشرقی پاکستان میں داخل ہونا شروع ہوئے اس وقت فضل الحق کلکتہ کا دورہ کر رہے تھے کہ اچانک یہ افواہ پھیل گئی کہ فسادیوں

نے انہیں بھی ہلاک کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے ردعمل میں مشرقی پاکستان کے عوام کے جذبات بھڑک اٹھے جس کے نتیجے میں ڈھاکہ' کھلنا اور نواکھالی میں تشدد آمیز واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے بعد ہندوؤں نے مغربی بنگال کی طرف نقل مکانی شروع کر دی: تاہم وزیراعظم خان لیاقت علی خان کی بروقت مداخلت نے صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچا لیا جنہوں نے بھارت پہنچ کر پنڈت جواہر لال نہرو سے اس مسئلے کے بارے میں گفت و شنید کی تاکہ اس کا کوئی فوری اور دیرپا حل تلاش کیا جا سکے' ان مذاکرات کے نتیجے میں نہرو' لیاقت پیکٹ' وجود میں آیا جس کے سبب کشیدگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس سے قبل 7 مارچ 1949ء کو "قرارداد مقاصد" منظور کی جا چکی تھی' خصوصی قانون "پروڈا" کے تحت لیاقت علی خان نے سیاست کو بدعنوان عناصر سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی لیکن بدقسمتی نے صوبائی حکومتوں نے اس ایکٹ کو اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں محمد ایوب کھوڑو' نواب آف ممدوٹ' قاضی فضل اللہ اور حمید الحق چوہدری کو پروڈا کے تحت کئی برسوں تک سیاست کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا۔

خطرناک فوجی سازش اور لیاقت علی خاں کی شہادت

21 مارچ 1951ء میں ایک خطرناک سازش کا انکشاف ہوا جس کے ذریعے چند فوجی افسران حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے؛ تاہم اس سازش کو فوری طور پر ناکام بناتے ہوئے اس کے ملزمان پر ایک اسپیشل ٹریبونل کے ذریعے مقدمہ چلایا گیا' یہ واقعہ "راولپنڈی سازش کیس" کے نام سے مشہور ہوا اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد اکتوبر 1951ء میں وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان' اس وقت شہید کر دیے گئے جب وہ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ ان کی شہادت کا یہ واقعہ آج تک ایک سربستہ راز ہے۔ لیاقت علی خان کی وفات' قوم کے لیے ایک عظیم صدمے اور المیے سے کم نہ تھی! ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پر کرنا ناممکن تھا! بہرحال کسی نہ کسی کو تو یہ خلا پر کرنا ہی تھا چنانچہ خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر وزارت عظمیٰ اور غلام محمد کو' ان کی بجائے' گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے اصل مصائب اور مشکلات کا آغاز اس واقعہ سے ہوتا ہے' جب پاکستان میں بیوروکریسی کی

حکومت کی داغ بیل پڑی۔ سیاست داں باہمی اختلافات کا شکار تھے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ ملک میں کس قسم کا آئین ہونا چاہئے دوسری طرف ملک کی اقتصادی صورت حال بھی روز بروز بگڑتی چلی جارہی تھی اور بالخصوص مشرقی پاکستان میں روزمرہ استعمال کی جانے والی اشیا کی شدید قلت تھی' خواجہ ناظم الدین ان بیوروکریٹس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے جن کی پوزیشن' غلام محمد جیسے بیوروکریٹ کے گورنر جنرل بننے کے نتیجے میں اب خاصی مضبوط ہوچکی تھی۔

صوبوں کے درمیان اختلافات کا آغاز

پاکستان کی قانون ساز اسمبلی نے دسمبر 1952ء میں دوسرا آئینی مسودہ تیار کیا جسے پنجاب نے نامنظور کردیا' کیوں کہ اس کی رو سے ایوان بالا میں دونوں ''بازوؤں'' کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی۔ پنجاب کا دعویٰ یہ تھا کہ وفاقی طرز حکومت میں ہر ''وحدت'' کو مساوی نمائندگی دی جانی چاہئے' قطع نظر اس کے کہ اس کی آبادی اور رقبہ کتنا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وفاقی ایوان بالا میں مشرقی پاکستان بحیثیت ایک صوبے کے ہمیشہ اقلیت میں رہتا حالانکہ آبادی کے تناسب سے وہ بقیہ پاکستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ اکثریت رکھتا تھا۔ درحقیقت یہیں سے مشرقی اور مغربی صوبوں کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کی جانب سے آبادی کے تناسب سے نمائندگی کا مطالبہ' غیر فطری نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں مکمل تعطل پیدا ہوگیا کیونکہ دونوں بازوؤں کے درمیان ایسی خلیج حائل ہوچکی تھی جسے پاٹنا ناممکن نظر آتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے بھی ضرورت اور مصلحت کے تحت' مشرقی پاکستان کے اس نقطہ نظر کی حمایت کی جس کی بنا پر وہ غیر مقبول ہوتے چلے گئے' ان کی مقبولیت میں اس وقت اور بھی کمی واقع ہوگئی جب قادیانیوں کے خلاف لاہور میں پرتشدد تحریک شروع ہوگئی جسے کچلنے کی غرض سے' پاکستان میں پہلی بار مارشل لا کا نفاذ کرنا پڑا۔ کچھ گواہوں کے بیان کے مطابق یہ تحریک خود خواجہ ناظم الدین کے خلاف چلائی گئی تھی؛ تاہم چند دیگر حضرات کا خیال ہے کہ مذہبی لیڈروں کے حوالے سے' خواجہ صاحب کے رواداری اور صبر و برداشت کے رویئے کی وجہ سے یہ بحران پیدا ہوا۔ خواجہ صاحب نے بیرون ملک قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ حنفی فقہ کے پیروکار اور ایک عملی مسلمان تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس زیب تن کیا کرتے تھے اور پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے؛ تاہم ان خصوصیات کے باوجود' وہ ملک کو ایسی مؤثر لیڈرشپ فراہم نہ

کرسکے جس کی ملک کو ضرورت تھی اور جس کے نتیجے میں' ان کی اپنی پارٹی کے لوگ' ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں رہنے لگے تھے۔ چنانچہ بیوروکریسی کو بہانہ مل گیا اور اس نے ان کے خلاف سازشوں اور سیاسی جوڑتوڑ کا سلسلہ شروع کردیا۔

مشرقی پاکستان میں احساس محرومی

اسی اثنا میں' مشرقی پاکستان کا سیاسی موسم بھی کافی گرم ہوگیا اور اپوزیشن پارٹیاں' مسلم لیگ کے اندرونی اختلافات اور بے اطمینانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مضبوط ہوتی چلی گئیں' روزمرہ ضرورت کی اشیا کی شدید قلت تھی' نمک' سرسوں کا تیل' ماچس' کپڑے اور اناج جیسی اہم اور بنیادی ضرورت کی اشیا ناپید ہوچکی تھیں' دانشوروں' بالخصوص ماہرین معاشیات نے وہاں مروجہ حالات کے پیش نظر' دونوں بازوؤں میں ہونے والی تعمیر وترقی کے نمایاں فرق کو اجاگر کرنا شروع کردیا۔ان کا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان سے کی جانے والی برآمدات کے نتیجے میں حاصل ہونے والا غیر ملکی زرمبادلہ' مغربی پاکستان کی تعمیر اور ترقی پر صرف کیا جارہا ہے جب کہ بنگالی بھوکوں مر رہے ہیں۔ چند سیاست دانوں نے دونوں بازوؤں کے درمیان مساوات کے اصول کی بھی شدید مخالفت شروع کردی' بنگالی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے منوانے کے لیے طلبا نے ایجی ٹیشن شروع کردیا اور تمام اپوزیشن پارٹیاں باہم متفق ہوکر نئے انتخابات کا مطالبہ کرنے لگیں کیونکہ دسمبر 1951ء میں پنجاب میں انتخابات ہوچکے تھے۔ مشرقی پاکستان کی حکمران جماعت کو چونکہ اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا لہٰذا وہ انتخابات کو ملتوی کرتی رہی۔احتجاجی عناصر اور سیاسی جماعتوں نے حکومت کی اس کمزوری کے مدنظر بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دیئے جانے کے حق میں پرتشدد تحریک اور مظاہروں کا آغاز کردیا اور مطالبہ کیا کہ 1952ء کے اوائل میں ہونے والے صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں' اس مسئلے پر قرارداد منظور کی جائے۔طلبا نے اس روز ہڑتال کا اعلان کردیا اور جلوس نکالے اور اسمبلی ہال کے باہر جمع ہوگئے جو ان دنوں کیمپس کے درمیان یونیورسٹی بلڈنگ میں واقع تھا' پولیس اور احتجاجی طلبا کے درمیان پرتشدد جھڑپیں شروع ہوگئیں' پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں چند طلبا ہلاک ہوگئے۔اس واقعہ کے بعد احتجاجی مظاہروں نے انتہائی سنگین صورت اختیار کرلی اور اپوزیشن لیڈروں اور پارٹیوں نے ان

طلبا کے ساتھ مل کر صوبے کے وزیراعلیٰ مسٹر نورالامین سے استعفیٰ کا مطالبہ کردیا۔ان حالات کے دباؤ میں آکر صوبائی اسمبلی بالآخر مجبور ہوگئی اور اس نے یہ قرارداد منظور کرتے ہوئے مرکزی قانون ساز اسمبلی سے سفارش کی کہ بنگالی کو دوسری قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے؛ تاہم اس احتجاج کو کچلنے کی غرض سے مسٹر نورالامین کی حکومت نے اپنے ایمرجنسی اختیارات کا بے رحمی کے ساتھ استعمال کیا۔ مسٹر حسین شہید سہروردی کو جو پہلے بھی مشرقی پاکستان جاچکے تھے اور ان حالات پر قابو پاسکتے تھے' نارائن گنج کے اسٹیمر گھاٹ پر اترتے ہی صوبہ بدری کے احکامات تھما دیے گئے' شیخ مجیب الرحمن' مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور متعدد دیگر مخالف سیاسی رہنما' پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت نظر بند کردیے گئے اس واقعہ کے ردعمل میں' مشرقی پاکستان کے متعدد دوسرے شہروں میں بھی پرتشدد احتجاجی مظاہرے شروع ہوگئے جن میں ہندوؤں نے کھل کر اپوزیشن کا ساتھ دیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں' خان عبدالقیوم خان نے' مرکز کی جانب سے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں نامزد کردہ امیدواروں کو مسترد کرتے ہوئے' اپنے امیدوار کھڑے کردیے جس میں انہیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ پاکستان مسلم لیگ نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ان کی کامیابی کا اعتراف کرلیا' خان قیوم نے نئی کابینہ کی تشکیل دی اور اس کامیابی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی بھرپور قوت اور اختیارات کے ساتھ صوبے پر حکومت کرتے رہے۔

صوبہ سندھ میں' محمد ایوب کھوڑو کی برطرفی کے بعد سے کوئی حکومت تشکیل نہیں دی جاسکی تھی' گورنر راج اس قدر غیر مقبول ہوچکا تھا کہ بالآخر گورنر دین محمد کو' نومبر 1952ء میں خود ہی استعفیٰ دے کر جانا پڑا۔ 1953ء کے صوبائی انتخابات میں' محمد ایوب کھوڑو نے' خان عبدالقیوم خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے' مرکزی پارلیمانی بورڈ کے نامزد کردہ امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدواروں کو منتخب کرالیا؛ تاہم صوبہ سرحد کے برعکس اس مرتبہ پاکستان مسلم لیگ نے ان کی پارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اپنی پارٹی کا دفتر اور تمام فنڈز' مسٹر غیاث الدین پٹھان کے حوالے کردیں۔ مسٹر کھوڑو نے ایسا کرنے سے انکار کردیا اور عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

پہلی جمہوری حکومت کا قتل

غذائی اشیا کی کم یابی اور گرانی' مشرقی پاکستان میں چلنے والی لسانی تحریک صوبوں میں برسراقتدار حکومتوں کی جانب سے اپوزیشن کے خلاف سخت گیر اقدامات اور پروڈا کے تحت پرانے مسلم لیگیوں کے خلاف کارروائیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بحرانی کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس نے گورنر جنرل غلام محمد کو بالآخر وہ موقع فراہم کر ہی دیا جس کا انہیں بڑی بے تابی سے انتظار تھا کہ وہ تمام طاقت اور اختیار اپنی ذات میں مرکوز کر لیں۔ چنانچہ اپریل 1953ء میں انہوں نے خواجہ ناظم الدین کو حکومت سے برطرف کر دیا حالانکہ ایک ماہ قبل ہی وہ مطلوبہ اکثریت کے ساتھ اسمبلی سے ملک کا بجٹ منظور کرانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اس وقت بھی انہیں اسمبلی کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا۔ ظاہر ہے' ایسا انہوں نے اس مقصد سے کیا تھا کہ اپنی مرضی کا وزیراعظم مقرر کر کے اس کی مدد اور حمایت سے ایسا آئین مرتب کیا جا سکے جو ان کے بیوروکریٹ مشیروں پر مشتمل حلقے کی خواہشات کے عین مطابق ہو اور جس کے ذریعے وہ بلاشرکت غیرے اس ملک پر حکومت کر سکیں۔ جمہوریت پر کیا جانے والا یہ پہلا بڑا حملہ تھا جس نے باقاعدہ ایک روایت کی شکل اختیار کر لی جس نے بالآخر اس ملک سے جمہوریت کا جنازہ ہی نکال دیا۔

سول حکومت میں فوج کی شرکت

محمد علی بوگرا اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے وہ قومی اسمبلی کے رکن بھی نہیں تھے لیکن انہیں نہایت عجلت میں امریکہ سے واپس بلایا گیا اور ائیر پورٹ سے سیدھے گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا جہاں انہوں نے اس دن وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا ان کی کابینہ پہلے سے تیار تھی۔ اس نے بھی اسی دن حلف اٹھایا۔ اس کابینہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تمام پارلیمانی روایات کے خلاف ورزی کرتے ہوئے فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو کابینہ میں وزیر دفاع کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔

پاکستان کی امریکی بلاک میں شمولیت

مسلم لیگ کا زوال اخلاقی پستی کی اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اس نے نئے وزیراعظم کو پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کر کے اس تبدیلی کو قبول کر لیا' 1950ء میں پنجاب میں غیر معمولی سیلاب آنے اور 1951ء میں مشرقی پاکستان میں طوفان سے تباہی ہونے کے بعد خواجہ ناظم الدین نے اناج کی درآمد کے لیے جو مذاکرات شروع کئے تھے اس دور حکومت میں ان کے نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ امریکہ کی طرف سے کئی لاکھ ٹن اناج مہیا کرنے سے قحط کا خطرہ ٹل گیا مگر امریکہ نے اس اناج کا کچھ حصہ مفت اور کچھ کم قیمت پر اس شرط کے ساتھ مہیا کیا تھا کہ پاکستان اپنی غیر وابستگی کی پالیسی کو خیر باد کہہ دے' مئی 1954ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی معاہدہ کیا اور بعد میں بغداد پیکٹ (سینٹو) اور سیٹو پیکٹ میں شامل ہو گیا۔

دستور ساز اسمبلی کی بیسک پرنسپلز کمیٹی نے ایک اور ڈرافٹ (تھرڈ ڈرافٹ کانسٹی ٹیوشن) تیار کر لیا تھا جس میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں مساوات کے اصول کو جیسے دوسرے مسودے میں کیا گیا اور جس کی خواجہ ناظم الدین نے تائید کی تھی' ایک تبدیل شدہ شکل میں برقرار رکھا گیا تھا۔

نشستوں کی اس طرح تقسیم کی گئی تھی کہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان مساوات قائم رہے۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں ایوانوں کو برابر کے اختیارات دیئے جائیں گے لیکن اختلاف کی صورت میں مشترکہ اجلاس بلایا جائے گا' مزید کہا گیا تھا کہ کسی بازو کے بارے میں کسی معاملے کے لیے اس بازو کی اسمبلی کے موجود اور ووٹ دینے والے اراکین کی ایک تہائی تعداد کی حمایت حاصل ہونی چاہیے۔ یہ تجویز اس خطرے کی پیش بندی کے لئے رکھی گئی تھی کہ کہیں مشرقی پاکستان کے اراکین سرحد یا سندھ کے اراکین کے ساتھ مل کر ایسا دستور اختیار نہ کر لیں جو دوسرے لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہو' خیال تھا کہ اس بنیادی اصول کو جسے محمد علی فارمولا کہا گیا تھا قبول کرنے کے بعد ایک سال میں دستور تیار ہو جائے گا لیکن صوبوں کی مرضی کچھ اور تھی کیونکہ اس دوران ملک کی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا

تھا۔

1954ء میں ہونے والے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کو مشترکہ حزب اختلاف (جگتو فرنٹ) کے ہاتھوں بھاری شکست ہوگئی۔ اس مشترکہ فرنٹ کے رہنما فضل الحق، سہروردی اور بھاشانی تھے ان میں سے پہلے رہنما کرشک سرامک پارٹی کے دوسری عوامی لیگ کے اور تیسرے عوامی لیگ کے بائیں بازو کے رہنما تھے۔ یہ تینوں بنگال کے نہایت مقبول اور بااعتماد رہنما تھے۔ مسلم لیگ، محترمہ فاطمہ جناح کی آخری وقت کی کوششوں کے باوجود 15 نشستیں بھی حاصل نہ کرسکی۔

وفاقی اسمبلی نے جب دیکھا کہ صورت حال اس کے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے تو اس نے خود کو منوانے کی کوشش کی، 20 ستمبر 1954ء کو اس نے بدنام پبلک اینڈری پریزینٹیو آفیسرز (ڈس کوالیفکیشن) ایکٹ 1949ء (پروڈا) منسوخ کردیا اس ایکٹ کو گورنر جنرل اپنے مخالفین کے خلاف موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے اس کے بعد مشرقی پاکستان کے فضل الرحمن کی سربراہی میں اور کچھ لوگوں کے خیال میں وزیراعظم محمد علی بوگرا کی حمایت سے بڑی عجلت کے ساتھ صرف 18 گھنٹوں میں جب کہ گورنر جنرل صوبہ سرحد کے دورے پر گئے ہوئے تھے، مندرجہ ذیل قواعد منظور کرلیے۔

(ا)...... کابینہ کی ذمہ داری مشترکہ ہوگی

(ب)...... کسی وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پوری کابینہ کے خلاف ووٹ سمجھا جائے گا۔

(ج)...... گورنر جنرل کابینہ کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہوگا۔

جمہوریت کو دوسرا دھچکا

دورے سے واپس آنے پر گورنر جنرل بہت غضبناک ہوئے، انہوں نے اپنے غیر معمولی اختیارات استعمال کرتے ہوئے پبلک اینڈری پریزنٹیو آفیسرز (ڈس کوالیفکیشن) ایکٹ 1949ء سابقہ مدت سے ختم کردیا۔ مسلم لیگ کے اس وقت کے تمام اراکین کے مخالفین کو آزاد چھوڑ دیا اور 24 اکتوبر 1954ء کو دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا، انہوں نے تاج برطانیہ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یہ بہانہ تراشا کہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھوچکی ہے، اسمبلی کی عمارت کو فوج نے گھیرے میں لے لیا اور اس کے اسپیکر مولوی تمیز الدین خان کو اس میں داخل ہونے سے روک دیا۔ سپیکر نے سندھ ہائی کورٹ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی دفعہ A-223 کے تحت رٹ داخل کی اس دفعہ کو دستور ساز اسمبلی نے ایک ترمیم کے ذریعہ 6 جولائی 1954ء کو ایکٹ میں شامل کیا تھا اور خود اسپیکر نے اپنے دستخطوں کے ساتھ اس کی منظوری دی تھی۔ یہ روایت قائداعظم کے انتقال کے بعد سے جاری تھی، اس روایت کے مطابق آئینی نوعیت کے معاملات گورنر جنرل کے سامنے ان کی منظوری کے لیے نہیں رکھے جاتے تھے بلکہ یہ اسپیکر کے دستخطوں سے ہی قانونی شکل اختیار کرلیتے تھے کیونکہ اسپیکر دستور ساز اسمبلی کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی عمل کرتے تھے لیکن قانون سازی کے دوسرے معاملات میں گورنر جنرل کی منظوری لینا ضروری تھا۔

ہائی کورٹ نے ایک رٹ جاری کردی جس میں حکومت کو اسمبلی کے معاملات میں دخل اندازی کرنے سے منع کیا گیا تھا، حکومت نے فیڈرل کورٹ میں اپیل کردی۔ اپیل کے زیر سماعت رہنے کے دوران گورنر جنرل اور اسپیکر کے درمیان اپیل واپس لینے کے بارے میں مذاکرات ہوتے رہے مگر یہ کامیاب نہیں ہوئے، فیڈرل کورٹ نے بغیر اس سوال پر غور کیے ہوئے کہ کیا دستور ساز اسمبلی توڑنا جائز تھا، اس بنیاد پر اپیل منظور کرلی کہ ہر قسم کے قانون منظور

کرنے کے لیے چاہے یہ معمول کے ہوں یا آئینی نوعیت کے گورنر جنرل کی منظوری ضروری ہے (فیڈریشن آف پاکستان بنام مولوی تمیزالدین خاں پی ایل ڈی 1955ء ایف سی-240) لہٰذا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں ترمیم کے ذریعہ شامل کی گئی دفعہ 223-A جس پر گورنر جنرل سے دستخط نہیں لیے گئے تھے درست قانون نہیں ہے اس لیے اس دفعہ کے تحت مولوی تمیزالدین خان کو ریلیف نہیں دی جاسکتی' رٹ خارج کردی گئی اور اس طرح گورنر جنرل کی جیت ہوئی مگر اس سے جمہوریت کو ایک اور سخت دھچکا لگا۔

گورنر جنرل اپنے فیصلہ کے گرداب میں

یہ فیصلہ اگرچہ گورنر جنرل کے حق میں تھا مگر اس نے ان کے لیے بہت سے مسائل بھی پیدا کردیئے۔ اس فیصلے سے قائداعظم کے انتقال کے بعد جو بھی قوانین بنائے گئے تھے وہ کالعدم قرار پائے' گورنر جنرل نے اس مشکل پر قابو پانے کے لیے ایسے تمام قوانین کو جنہیں وہ رکھنا چاہتے تھے جائز قرار دینے کے لیے ایک آرڈیننس کے ذریعہ انہیں گزشتہ مدت سے جائز قرار دے دیا' اس آرڈیننس کا نام ایمرجنسی پاورز آرڈیننس نمبر 9 آف 1955ء قرار دیا لیکن ایک اور مقدمے یوسف پٹیل (پی ایل ڈی 1955ء ایف سی-387) میں فیڈرل کورٹ نے اس آرڈیننس کو بھی کالعدم قرار دے دیا کیونکہ گورنر جنرل فیڈرل اسمبلی کی غیر موجودگی میں آرڈیننس کے ذریعے قوانین تو بنا سکتا ہے لیکن آئینی معاملات میں وہ یہ اختیارات استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ یہ صرف دستور ساز اسمبلی کا کام ہے۔ گورنر جنرل اپنے تیر کا خود ہی شکار ہوگئے۔ اپنے غیر آئینی اقدام سے انہوں نے ایک سیاسی مصیبت پیدا کرلی' اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اس لیے انہوں نے گیند واپس فیڈرل کورٹ میں پھینک دی اور اس کے مشورہ دینے کے فرائض کو استعمال کرتے ہوئے مشورہ طلب کیا (گورنر جنرل کا ریفرنس نمبر 1 یا 1955ء پی ایل ڈی 1955ء ایف سی-435) کیونکہ اس نکتے پر کوئی قانون نہیں تھا اس لیے مدد کے لیے ضرورت کا اصول وضع کیا گیا اور عدالت نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اس کی ہدایات کے مطابق نئی اسمبلی بنائی جائے اور پھر تمام ارکان قوانین کو جائز قرار دینے کے لیے ایک قانون منظور کرایا جائے جنہیں وہ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔

جنرل اسکندر مرزا کی آمد

چنانچہ ایک نئی مجلس قانون ساز کا انتخاب عمل میں آیا۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں میں کم و بیش وہی افراد دوبارہ منتخب ہونے میں کامیاب ہوگئے جو حکمران جماعت' مسلم لیگ کے حامی تھے جبکہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں منتخب ہوکر آنے والے سب ہی لوگ بالکل نئے تھے۔ دوسری مجلس قانون ساز کا اجلاس 1955ء میں مری کے مقام پر ہوا' جس میں مسلم لیگ اسی نشستوں کی مجموعی تعداد میں سے صرف بیس نشستیں ہی حاصل کرسکی۔ مسٹر فضل الحق کی کریشک سرامک پارٹی نے سولہ جبکہ حسین شہید سہروردی کی زیر قیادت عوامی لیگ کو تیرہ نشستیں حاصل ہوئیں۔ بقیہ نشستوں پر دیگر مختلف گروپوں کے لوگ منتخب ہوکر آئے تھے۔ چنانچہ کسی بھی سیاسی جماعت کو ایوان میں واضح اکثریت حاصل نہ ہوسکی جس کے نتیجے میں مخلوط حکومت کی تشکیل اور قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔ فیڈرل کورٹ کی ہدایت کے بموجب آئینی نظام بحال کردیا گیا تھا ؛ تاہم مرکزی کابینہ کی تشکیل میں کافی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ گورنر جنرل غلام محمد کی جسمانی صحت اور حالت فالج کے حملے کے بعد مزید بگڑتی چلی جارہی تھی جس کے سبب وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں' کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا حتیٰ کہ وہ ضروری سرکاری کاغذات اور دستاویزات پر دستخط کرنے کے بھی قابل نہ رہے تھے۔ ان حالات میں انہیں رخصت پر روانہ کردیا گیا اور ایک دوسرے بیوروکریٹ یعنی جنرل اسکندر مرزا اس وقت کے وزیر خزانہ چوہدری محمد علی کی مدد اور تعاون سے قائم مقام گورنر جنرل کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مسٹر اے کے فضل الحق کی پارٹی کے تعاون سے مسلم لیگ نے حکومت تشکیل دی' مسٹر محمد علی بوگرہ وزیراعظم مقرر ہوگئے اور حزب اختلاف کی قیادت سہروردی نے کی۔ کچھ ہی عرصے بعد محمد علی بوگرہ کو بھی وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر دوبارہ سفیر کی حیثیت سے امریکہ بھیج دیا گیا اور ان کی بجائے چوہدری محمد علی مسلم لیگ پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے وزیراعظم مقرر کردیئے گئے۔ اسی اثنا میں گورنر جنرل غلام محمد شدید علالت اور خرابی صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے ریٹائر ہوگئے تھے اور اس طرح میجر جنرل اسکندر مرزا اگست 1955ء میں مستقل طور پر گورنر جنرل بننے میں کامیاب ہوگئے۔

مشرقی پاکستان میں نئی تبدیلیاں

اس دوران مشرقی پاکستان میں بھی نئی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ 1954ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست سے دوچار کرنے والے جگتو فرنٹ کو 3 اپریل 1954ء کو مسٹر فضل الحق کی زیر قیادت حکومت بنانے کی دعوت دی گئی لیکن قبل اس کے کہ یہ حکومت پوری طرح کام کرتی ڈھاکہ نارائن گنج اور کھلنا میں بہاریوں کے خلاف ہونے والے شدید فسادات کے نتیجے میں امن و امان کی صورتحال تشویش ناک حد تک بگڑ گئی۔ حالات کسی طرح قابو میں نہیں آرہے تھے چنانچہ گورنر جنرل کے احکامات کے تحت صوبے میں گورنر راج نافذ کردیا گیا اور اس وقت کے گورنر چوہدری خلیق الزماں کی بجائے میجر جنرل اسکندر مرزا مشرقی پاکستان کے گورنر بنادیے گئے جنہوں نے 20 مئی 1954ء کو ڈھاکہ پہنچتے ہی فوج کو طلب کرلیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کردی اور مسٹر فضل الحق کو نظر بند کردیا گیا۔ ان کی کابینہ کے چند وزرا کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ گورنر راج پورے ایک برس تک نافذ رہا۔ 6 جون 1955ء کو جب صورتحال کچھ بہتر ہوگئی تھی مسٹر فضل الحق کے نمائندے مسٹر ابوحسین سرکار کی قیادت میں ایک حکومت تشکیل دی گئی؛ تاہم یہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکی چنانچہ میجر جنرل اسکندر مرزا کو مرکز میں واپس بلالیا گیا اور جگتو فرنٹ سے سیاسی تصفیہ کرتے ہوئے مسٹر فضل الحق کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کردیا گیا۔ عوامی لیگ کے مسٹر عطاالرحمٰن کی قیادت میں نئی حکومت تشکیل دی گئی جن کی کابینہ میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی شامل تھے۔

مغربی صوبوں کی صورتحال پر ایک نظر

صوبہ سندھ میں 1953ء کے انتخابات کے بعد نافذ کئے گئے گورنر راج کے خاتمے کے بعد مسٹر عبدالستار پیرزادہ کی سربراہی میں حکومت کا قیام عمل میں آیا؛ تاہم یہ حکومت بھی

مرکزی حکومت سے عدم تعاون کے نتیجے میں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور انہیں برطرف کئے جانے کے بعد نومبر 1954ء میں محمد ایوب کھوڑو تیسری مرتبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔

صوبہ پنجاب میں سر فیروز خان نون کی وزارت کا مئی 1955ء میں خاتمہ ہوگیا ادھر نواب آف ممدوٹ کی نئی تشکیل کردہ جماعت جناح عوامی لیگ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں 14 نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ دوسری مجلس قانون ساز کے لئے اراکین کے انتخاب کے مسئلے پر مرکزی حکومت اور گورنر پنجاب مشتاق احمد گورمانی کی ملی بھگت کے نتیجے میں فیروز خان نون کی حکومت کو برطرف کردیا گیا تھا اور ان کی بجائے سردار عبدالحمید خان دستی کا انتخاب عمل میں آچکا تھا۔

اپریل 1953ء میں خان عبدالقیوم خان کے مرکزی حکومت میں شمولیت کے بعد سردار عبدالرشید کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا جو انسپکٹر جنرل آف پولیس تھے اور سیاست سے ان کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ تاہم اپنی عقل مندی اور آزاد پالیسیوں کی مدد سے نہ صرف وہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئے بلکہ اپوزیشن کو بھی رعایت دی۔ انہوں نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے ان تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا جنہیں خان عبدالقیوم خان کی وزارت اعلیٰ کے دور میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی ضبط شدہ جائیدادیں انہیں واپس کردی گئیں اور ڈاکٹر خان صاحب کی نقل و حرکت پر عائد کردہ پابندیاں بھی ہٹالی گئیں۔

ون یونٹ کا قیام

مرکز میں بھی تیزی کے ساتھ سیاسی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ مسٹر غلام محمد مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں سے ون یونٹ اسکیم کی حمایت میں قرارداد منظور کرانے میں کامیاب ہوچکے تھے جس کے قیام کے لئے قانون تشکیل دیا جاچکا تھا اسی دوران 1955ء میں چوہدری محمد علی وزیر اعظم مقرر ہوگئے جنہوں نے اس قانون کو عملی شکل دیتے ہوئے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ضم کرتے ہوئے ون یونٹ کی شکل دے دی اور مغربی پاکستان کے قیام کا ایکٹ مجریہ اکتوبر 1955ء منظور کرلیا گیا چنانچہ مغربی پاکستان کے نام سے ایک نیا صوبہ وجود میں آگیا اور ڈاکٹر خان صاحب کو اس کا پہلا وزیر اعلیٰ مقرر کردیا گیا۔ نئی مجلس قانون ساز بھی متحرک ہوچکی تھی جس نے فروری 1956ء کو دونوں بازوؤں کے درمیان مساوی نمائندگی کے اصولوں کی بنیاد پر

وضع کردہ نئے آئین کی منظوری دے دی تھی۔ اسکندر مرزا اپنی چالبازیوں سے ملک کے پہلے صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے اور آزادی کے 9 برس بعد 23 مارچ 1956ء کو ملک کا پہلا آئین نافذ العمل ہو گیا۔

پہلا آئین وجود میں آ گیا

اس آئین میں موجود خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر ایک بڑے طبقے نے اطمینان کا سانس لیا کہ بالآخر ساڑھے نو برس کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد اس ملک کو ایسا آئین میسر آ گیا ہے جس کی موجودگی میں ایک مکمل آئینی حکومت اور جمہوری عمل کا راستہ کھل گیا ہے جس پر پوری دیانت داری سے عمل پیرا ہو کر جمہوریت اور جمہوری اداروں کو استحکام حاصل ہو سکے گا۔ آئین کے حوالے سے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے نوجوان اور انتہا پسند اراکین پر مشتمل ایک گروپ کے عدم اطمینان کے باوجود جس کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کر رہے تھے نسبتاً عمر رسیدہ سیاستدانوں نے جن میں خواجہ ناظم الدین' اے کے فضل الحق' حسین شہید سہروردی' نور الامین' مسٹر فضل الرحمٰن اور مولوی تمیز الدین خان جیسے حضرات شامل تھے پیرٹی (مساوات) کے اصول کو موجودہ حالات کے تناظر میں مسئلے کا بہترین مصالحانہ حل قرار دیا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ملکی حکومت میں ایک مؤثر کردار ادا کرتے ہوئے پالیسی ساز فیصلوں کی تشکیل میں بھرپور طریقے سے حصہ لے سکتا تھا جس کے لئے صحت مندانہ روایت قائم کرتے ہوئے دونوں صوبوں کے درمیان اہم وزارتوں کی مساوی طور پر تقسیم ضروری تھی؛ تاہم یہ امیدیں بھی بہت جلد دم توڑ گئیں جیسا کہ آئندہ حالات سے ظاہر ہوتا ہے۔

ری پبلکن پارٹی میں لیگیوں کی شرکت

نیا آئین صدر اسکندر مرزا کی آرزوؤں کی بھرپور طریقے سے تسلی و تشفی نہ کر سکا۔ وہ محض ملک کا ایک آئینی سربراہ بنے رہنے پر ہی اکتفا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کے کندھوں پر بندوق رکھتے ہوئے مسلم لیگ کو کمزور کرنے کی ساز باز شروع کر دی جن کی قیادت میں خفیہ طور پر ایک نئی سیاسی پارٹی ''ریپبلکن پارٹی'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس پارٹی کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی غرض سے صدر اسکندر مرزا نے عوامی لیگ سے بھی ایک سمجھوتہ

کر لیا اور اس کے قائد مسٹر سہروردی 12 ستمبر 1956ء کو عوامی لیگ اور ریپبلکن پارٹی کی مخلوط حکومت کے وزیر اعظم بن گئے۔ یہ بات بہر طور بڑی افسوسناک اور تکلیف دہ تھی کہ ہوس اقتدار اور اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے مسلم لیگی ارکان کی بھی ایک بڑی تعداد ریپبلکن پارٹی میں شامل ہونے لگی جس کے نتیجے میں قومی اسمبلی میں مسلم لیگ کے پاس صرف دس نشستیں ہی باقی رہ گئیں۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں بھی اسے اپنے وزیر اعلیٰ کے انتخاب کے سوال پر شکست کا سامنا کرنا پڑا اس حقیقت کے باوجود کہ اسے ایوان میں واضح اکثریت حاصل تھی۔ دوسری جانب مشرقی پاکستان میں تو 1954ء کے انتخابات کے بعد ہی وہ ایک غیر اہم اقلیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

سہروردی ایک لائق اور تجربہ کار منتظم تھے انہوں نے کوشش کی کہ انتظامیہ کو از سر نو استوار کریں اور اس میں نئی زندگی پیدا کر دیں مگر وہ ایسا نہیں کر سکے کیونکہ وہ مخلوط حکومت کے ایک چھوٹے سے حصے کے رہنما تھے اور کرشک سرامک پارٹی ان کے خلاف مسلسل سازشیں کرتی رہتی تھی۔ ان کے یورپ اور امریکہ کے دورے کے دوران موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ریپبلکن پارٹی سے اتحاد کر لیا جسے اب پیپلز پارٹی کہا جاتا ہے۔

اس اتحاد سے مضبوط ہو کر ریپبلکن پارٹی سہروردی پر حکم چلانے لگی۔ پہلے اس نے سہروردی سے کہا کہ مغربی پاکستان کے گورنر گرمانی کو ہٹا دیا جائے جو صدر کی نظروں سے گر گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ ون یونٹ توڑنے اور مغربی پاکستان کا صوبہ ختم کرنے میں ریپبلکن پارٹی کی مدد کرے۔ سہروردی نے پہلی درخواست تو منظور کر لی مگر دوسری درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پنجاب کے دولتانہ نے خفیہ طور پر ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر بھروسہ کرتے ہوئے انہوں نے علی الاعلان ون یونٹ توڑنے سے انکار کر دیا۔ ریپبلکن پارٹی کی رہنمائی ڈاکٹر خان صاحب کر رہے تھے جنہوں نے، جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، پاکستان کی کبھی حمایت نہیں کی تھی انہوں نے اس بات پر اپنی حمایت واپس لے لی اور دولتانہ نے بھی اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اس طرح سہروردی کی وزارت عظمیٰ 17 اکتوبر 1957ء کو ختم ہو گئی کیونکہ صدر نے انہیں اپنی اکثریت ثابت کرنے کا موقع دیے بغیر ان سے استعفیٰ دینے کو کہا۔

مضبوط صدر، کمزور جمہوریت

سیاسی خلفشار اور سیاسی رہنماؤں کی آپس کی ذاتی رقابت کے اس پس منظر میں صدر نے ملک میں سب سے زیادہ طاقتور شخصیت کی حیثیت اختیار کرلی۔ وہ جس کا چاہتا تقرر کرتا اور جسے چاہتا ملازمت سے برطرف کردیتا تھا۔ اس کے دل میں سیاستدانوں کے لئے کوئی احترام نہیں تھا اور وہ اپنے اس خیال کا برملا اظہار کرتا کہ پاکستان میں جمہوریت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ وہ کنٹرولڈ جمہوریت اور سیاست کی مذہب سے علیحدگی پر یقین رکھتا تھا۔ ان دونوں نظریات نے پاکستان کی بنیاد پر سخت ضرب لگائی۔ ڈاکٹر خان صاحب نے یہ اعلان کرکے کہ صرف اسکندر مرزا ہی وہ شخص ہیں جو ملک پر حکومت کرسکتے ہیں اور آئین کو معطل کرکے ایک انقلابی کونسل قائم کردی جائے اپنے آقا کے جذبات کی عکاسی کی۔ مرکز میں حکومت کا قائم ہونا اور ٹوٹنا میوزیکل چیئرز کا کھیل بن گیا۔ وزراء ان کی مرضی سے آتے اور چلے جاتے تھے۔ صوبوں میں بھی یہی کہانی دہرائی جارہی تھی مگر اس کے اسباب مختلف تھے۔

سہروردی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں مشرقی پاکستان کے گورنر فضل الحق کو برطرف کردیا گیا۔ ابوحسین سرکار کی وزارت کو بھی ختم کردیا گیا۔ عطاالرحمٰن خان اور ان کی پوری کابینہ پھر اقتدار میں آگئی۔ پھر 20 جون 1958ء کو ابوحسین سرکار دوبارہ وزیراعلیٰ بن گئے لیکن 23 جون کو ہی اس کے خلاف عوامی لیگ اور مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے متحد ہوکر عدم اعتماد کے ووٹ کے ذریعے اسے حکومت سے ہٹادیا۔ یہاں گورنر راج نافذ کردیا گیا مگر دو ماہ بعد پھر عطاالرحمٰن کو بلایا گیا اور ان سے حکومت بنانے کے لئے کہا گیا۔ اسمبلی کا اجلاس 20 ستمبر 1958ء کو منعقد ہوا مگر اجلاس میں لڑائی شروع ہوگئی جو ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس دوران اسمبلی کے اسپیکر چلے گئے اور ان کی نشست ڈپٹی اسپیکر شاہد علی نے سنبھال لی جو عوامی لیگ کے رکن تھے۔ حکومت کی ایک قرارداد منظور کرلی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ اسپیکر کی ذہنی کیفیت درست نہیں ہے۔ تین روز بعد جب اسپیکر نے اسمبلی کی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی تو پولیس نے انہیں روک لیا۔ ڈپٹی اسپیکر شاہد علی اجلاسوں کی صدارت کرتے رہے مگر ان پر حزب اختلاف نے حملہ کردیا اور ایوان میں دوبارہ لڑائی شروع ہوگئی۔ اس افراتفری میں کسی نے ڈپٹی

اسپیکر شاہد علی کے سر پر مائیکروفون اسٹینڈ دے مارا وہ زخمی ہوئے اور ہسپتال جاکر انتقال کرگئے۔ پولیس نے قتل کی کوشش کے الزام میں ابوحسین سرکار اور کرشک سرامک پارٹی کے دوسرے اراکین کو گرفتار کرلیا۔ اب مغربی پاکستان کے صوبے میں ون یونٹ کے خلاف جدوجہد نے شدت اختیار کرلی۔ خود ریپبلکن پارٹی بھی ون یونٹ توڑنا چاہتی تھی۔ اس نے جی ایم سید کی نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اس سلسلے میں ایک معاہدہ کیا اور 17 اگست 1957ء کو مغربی پاکستان کی اسمبلی نے حقیقتاً ون یونٹ توڑنے کی قرارداد منظور کرلی۔ لیکن گٹھ جوڑ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ جی ایم سید کے گروپ نے ریپبلکن پارٹی کے ساتھ اپنی حمایت واپس لے لی اور اس وقت کے وزیراعلیٰ سردار عبدالرشید کی حکومت کو 17 مارچ 1958ء کو مستعفی ہونا پڑا۔ نواب مظفر علی قزلباش ان کے جانشین بنے۔ وہ زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے اور شکست کھانے سے بچ گئے۔

خفیہ آپریشن کی منصوبہ بندی

صدر اور ریپبلکن پارٹی کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آگئے تھے اور جب 29 مارچ 1958ء کو عبدالقیوم خان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو ان کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی انہوں نے صدر اسکندر مرزا کے خلاف تحریک شروع کردی اور اعلان کیا کہ وہ صدر کے عہدے کے لئے نااہل ہیں۔ وہ جمہوریت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور پاکستان میں ایک جمہوری اور آئینی نظام کی ترقی میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ حکومت اس وقت مسلم لیگ نیشنل گارڈز پر پابندی عائد کرنے کی منصوبہ بندی کررہی تھی۔ عبدالقیوم خان نے یہ چیلنج قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ خود یونیفارم پہن کر احتجاجی مظاہرے کی قیادت کریں گے۔ نئے انتخابات کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا' لوگ سیاسی سازشوں سے مایوس ہوچکے تھے۔ دونوں صوبوں میں کرپشن عام ہوگیا تھا۔ قومی اسمبلی کے انتخابات کے بار بار ملتوی ہونے سے جمہوری ذرائع سے کسی تبدیلی کے آنے کی امیدیں تیزی سے ختم ہوتی جارہی تھیں۔ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہورہا تھا۔ اس دوران اسکندر مرزا آرمی کے کمانڈر انچیف کے ساتھ مل کر ایک خفیہ آپریشن کی منصوبہ بندی کررہے تھے جسے ''آپریشن اوورلارڈ'' کہا گیا تھا تاکہ آئین کو معطل کردیا جائے۔ وہ قومی اسمبلی اور کابینہ کو توڑنے اور سیاسی عمل پر پابندی لگانے کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔

مشرقی پاکستان نئے نظریے کا جنم

7۔ اکتوبر 1958ء کو فوج نے تمام اہم مقامات پر قبضہ کرلیا اور مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ لوگ 1953ء میں مارشل لا کا تجربہ کر چکے تھے لہٰذا سب نے سعادت مندی کے ساتھ یہ سوچ کر اسے قبول کرلیا کہ یہ تھوڑے عرصے قائم رہنے والا مارشل لا ہے۔ اس طرح پاکستان کی تاریخ میں جمہوریت کا ایک دور صرف دو سال سات ماہ جاری رہ کر ختم ہوگیا۔

اس عرصے میں خود غرض سیاستدانوں کی سازشوں' حکومت کے لالچی سربراہوں کی ریشہ دوانیوں اور آئینی دفعات کی سنگین خلاف ورزیوں کے باوجود یہ امید قائم تھی کہ کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت ظاہر ہوگی اور اس کے ذریعے ہمارے وہ مسائل حل ہو جائیں گے جو دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہونے کی وجہ سے پیش آرہے ہیں۔ جب تک اس بات کا امکان تھا کہ حکومت میں تبدیلی آئینی ذرائع سے لائی جاسکتی ہے یہ بھی توقع کی جاسکتی تھی کہ ملک پر حکومت کرنے کے سلسلے میں دونوں صوبوں میں شرکت کے بارے میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ حکومت میں شرکت کا احساس بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ تین بنگالی وزیر اعظم رہ چکے تھے اور ایک بنگالی گورنر جنرل بھی رہا تھا اس کے علاوہ کئی دوسرے لوگ کابینہ میں اہم عہدوں پر رہے تھے۔ یہ بھی امکان تھا کہ قومی سطح کی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل سے ملک کے معاملات میں بنگالیوں کو زیادہ اختیارات مل جائیں۔ مایوسیوں کے باوجود ایک دوسرے سے علیحدگی کا احساس نہیں تھا نہ حکومت کے اس وفاقی ڈھانچے سے نکلنے کا کوئی تصور تھا جسے 1954ء کی قرارداد مقاصد میں منظور کیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستانی اب بھی ایک پاکستان میں یقین رکھتے تھے' اگرچہ وہ اپنے صوبے پر حکومت کرنے کے لئے مرکز سے زیادہ اختیارات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پہلی جمہوریت کے خاتمے نے ایک نئے نظریئے کو جنم دیا جس نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کی سیاسی امنگوں کو ایک نیا رخ دے دیا۔

ان سیاسی ریشہ دوانیوں کا ایک نقصان دہ پہلو یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں ہندو کانگریس پارٹی پیدا ہوگئی جس کے سربراہ سلہٹ کے بسنت کمار داس تھے۔ جگتو فرنٹ میں مسلمان پارٹیوں یعنی عوامی لیگ اور کرشک سرامک پارٹیوں میں اختلافات کی وجہ سے اس کانگریس پارٹی نے ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل کرلی کہ وہ کسی بھی پارٹی کا ساتھ دینے کے لئے اپنی حاکمانہ شرائط پیش کرتی تھی۔ اس کا اثر یہاں تک بڑھ گیا کہ جب 1957ء میں عطاالرحمٰن خان نے مشرقی پاکستان میں فوج کی مدد سے اسمگلنگ روکنے کی کوشش کی تو ہندو فرقے نے جس کی حمایت سے ان کی حکومت قائم تھی ان پر دباؤ ڈالا تو انہیں اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔

1961-62ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے وضع کردہ آئین کی رپورٹ کے پیراگراف اکیس میں درج ذیل عبارت دی گئی ہے۔

"1957ء میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ نے فوجی حکام سے تعاون کی درخواست کی تاکہ ایسی اسکیم کا آغاز کرتے ہوئے اس پر عمل درآمد کیا جائے جو پاکستان سے اشیا کی بیرون ملک اسمگلنگ کی مؤثر روک تھام کر سکے۔ اس اسکیم پر بڑی کامیابی سے عمل درآمد کیا گیا اور ایک ہی ماہ میں ایک کروڑ روپے مالیت کی اشیا ضبط کرلی گئیں؛ تاہم ہندوؤں کے ایک طبقے کی جانب سے ڈالے گئے دباؤ کے نتیجے میں' جس پر صوبائی وزیر اعلیٰ کی تمام تر سیاسی حمایت کا دارومدار تھا' اس اسکیم کو ترک کر دیا گیا۔ ایسے ہی ایک اور دباؤ کے تحت' ان افراد کے خلاف قائم کئے گئے فوجداری مقدمات بھی واپس لے لیے گئے جو ہمسایہ ملک کو مبینہ طور مشرقی پاکستان میں ہونے والی فوجی نقل و حرکت کی اطلاعات فراہم کرنے میں ملوث تھے۔"

پاکستان کی سیاسی تاریخ

7 اکتوبر 1958ء تا 6 جون 1962ء

7 اکتوبر 1958ء کو صدر اسکندر مرزا نے اپنے جاری کردہ اعلان میں کہا......

''گزشتہ دو برسوں کے دوران' میں نے گہری تشویش کے ساتھ' حصول اقتدار کے لیے کی جانے والی بے رحمانہ تگ و دو' بدعنوانیوں' اپنے سادہ' ایمان دار اور محب وطن عوام کے شرم ناک استحصال' نظم وضبط کے فقدان اور سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے اسلام کے غلط استعمال کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے: تاہم اس میں چند مستثنیات بھی ہیں جو اقلیت میں ہونے کے سبب' اس حیثیت میں نہیں تھیں کہ ان ملکی معاملات اور امور کے حوالے سے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرسکتیں۔

اس قسم کی حقیر اور قابل نفرت سرگرمیوں نے' انتہائی گھٹیا درجے کی آمریت کو جنم دیا ہے موقع پرستوں اور ابن الوقتوں نے' غریب عوام کا خون چوس کر اپنے خزانے بھر لیے ہیں اور اپنی استحصالی حرکتوں کے طفیل' دن بدن' امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں میری بار بار کی کوششوں کے باوجود خوراک کے بحران پر قابو پانے کے لیے سنجیدگی سے کوئی خاطر خواہ اقدام نہیں کیا گیا۔ خوراک کا مسئلہ ایک ایسے ملک کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے جسے اس معاملے میں مکمل طور پر خود کفیل ہونا چاہیے تھا اور جو فاضل غذائی پیداوار کی صلاحیت سے مالا مال ہے' زراعت اور اراضی کے انتظام کو اس حال تک پہنچا دیا گیا ہے کہ ہمارے مروجہ حکومتی نظام کے تحت کوئی بھی سیاسی جماعت ایسے مثبت اقدامات اور عمل سے معذور ہو چکی ہے جو پیداوار میں اضافے کا موجب بن سکیں۔ دوسری جانب' مشرقی پاکستان میں' منظم پیمانے پر' غذائی اشیا' ادویات اور دیگر ضروریات زندگی کی اسمگلنگ' بڑے دھڑلے سے جاری ہے' جن کی قلت کے

سبب عوام مصائب اور پریشانیوں کا شکار ہیں اور ان اشیا کی ہوشربا گرانی نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران' اناج کی درآمد پر ہمارے غیر ملکی زرمبادلہ کا خاصا بڑا حصہ صرف ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں حکومت کو ملک کے ترقیاتی منصوبوں کی تعمیر اور تکمیل میں شدید دشواریوں کا سامنا ہے' ہمارے چند سیاست دانوں نے حال ہی میں خونی انقلاب کی باتیں کی ہیں' ان میں کچھ ایسے مہم جو بھی ہیں جو غیر ممالک سے براہ راست رابطے کی کوششوں میں مصروف ہیں جس کا مطلب صرف غداری لیا جاسکتا ہے۔

شرم ناک واقعات

حال ہی میں مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں ہونے والے شرم ناک واقعات سے ہر پاکستانی بخوبی واقف ہے' میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ اس نوعیت کے واقعات' تقسیم سے پیشتر بالعموم بنگال میں ہوا کرتے تھے: تاہم اس بات میں کتنی صداقت ہے' اس سے قطع نظر یہ یقیناً کوئی مہذب طرز عمل نہیں ہے اسمبلی کے اسپیکر کو زدوکوب کرنا، اس کے ڈپٹی اسپیکر کو ہلاک کر دینا اور قومی پرچم کو آگ لگا دینا یقیناً ایسے اعمال ہیں جو کسی بھی صورت ملک کی عزت اور وقار میں اضافہ نہیں کرتے۔

سیاسی جماعتوں کی ذہنیت اس قدر پست ہو چکی ہے کہ میں ہرگز یہ ماننے اور یقین کرنے پر تیار نہیں کہ انتخابات' موجودہ بحرانی صورت حال میں بہتری کا ذریعہ بن کر ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی تشکیل اور قیام میں کوئی مدد دے سکتے ہیں جو ہمیں درپیش بے شمار پیچیدہ مسائل پر قابو حاصل کرنے کے قابل بنا سکے۔ ہمارے مسائل کو حل کرنے کے لیے اب چاند سے تو کوئی آنے سے رہا' لوگوں کا یہی ٹولہ جس نے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے' اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے' انتخابات میں بھی دھونس اور دھاندلی کا مظاہرہ کرے گا اور پہلے کی نسبت زیادہ انتقام پسندی سے کام لے گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ انتخابات بنیادی طور پر ذاتی شخصی' علاقائی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہی لڑے جائیں گے چنانچہ منتخب ہونے پر' یہ وہی پرانے ہتھکنڈے دوبارہ استعمال کریں گے جنہوں نے جمہوریت کا جنازہ نکال دیا جس کے نتیجے میں' ملک آج وسیع پیمانے پر محرومی اور افراتفری میں مبتلا ہے۔

اقتدار کی لامتناہی ہوس

بہر حال' انتظامیہ اپنی سی کوشش کر کے آزما لے؛ تاہم بدلتی ہوئی وفاداریوں اور اقتدار کی لامتناہی ہوس کو دیکھتے ہوئے' میں پوری طرح قائل ہو چکا ہوں کہ انتخابات آزاد ہوں گے اور نہ ہی منصفانہ! یہ کسی بھی طور' ہماری مشکلات کا حل نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس' اس بات کا قوی امکان ہے کہ غم اور مایوسی کے بادل اور بھی گہرے ہو جائیں جن کا لازمی نتیجہ خونی انقلاب کی صورت میں بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں' کراچی میونسپل کارپوریشن کے انتخابات منعقد ہوئے جن میں' فقط 29 فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے' ان میں سے بھی پچاس فیصد ووٹ جعلی نکلے' اس پر مستزاد' سول نافرمانی کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں تا کہ پرائیویٹ رضا کار تنظیموں کی مدد سے' ون یونٹ کا خاتمہ کیا جا سکے اس قسم کے انتشار انگیز اور تشدد پسند رجحانات' ان کے جذبہ حب الوطنی کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ' اس انتہا کی جانب واضح اشارہ کرتے ہیں جس تک' یہ سیاسی مہم جو' اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کی خاطر جا سکتے ہیں۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران' میری پوری کوشش یہی رہی ہے کہ آئین پر جمہوری طریقوں سے عمل درآمد کو ممکن بنایا جائے' ایک کے بعد ایک' مخلوط حکومت کی تشکیل کے لیے میں نے سخت محنت کرتے ہوئے اس امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا کہ شاید اس طرح حکومت اور انتظامیہ' مضبوط اور مستحکم ہو کر امور مملکت کو عوامی مفاد میں احسن طریقے سے چلا سکتی ہے۔ میرے مخالفین اور ناقدین نے بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور میری ان کوششوں کو محلاتی سازشوں سے تعبیر کیا...... تمام تر الزامات کا ملبہ' صدر کے سر ڈالنا اب ایک فیشن بن چکا ہے۔ کل کسی نے ایک لطیفہ سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے تو اس میں بھی صدر کا ہاتھ ہوتا ہے اور بالکل ہی بارش نہ ہو تب بھی اس کی ذمہ داری صدر پر عائد ہوتی ہے! اگر بات' میری اپنی ذات تک ہی محدود ہوتی تو میں خاموشی سے اسے برداشت کر لیتا لیکن یہ غیر محب وطن اور غدار عناصر صدر' پاکستان اور حکومت پر حملے کر کے پاکستان کے عزت اور وقار کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں جس میں یہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں اور اگر یہ صورت حال اسی طرح

برقرار رہی تو وہ اپنے مقصد کے حصول میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

ملک کے اندرونی حالات و واقعات کا تفصیلی اور تجزیاتی جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لوگوں کی بڑی اکثریت کو حکومت کے موجودہ نظام پر اب کوئی اعتماد نہیں رہا۔ اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ' اس دام پر فریب سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو رہے ہیں اور یہ حقیقت اچھی طرح جان چکے ہیں کہ انہیں بے رحمی کے ساتھ استحصال کا نشانہ بنایا گیا ہے' ان کی مایوسیوں اور تلخیوں کا قطعاً جواز موجود ہے' ہمارے سیاسی لیڈر اس قابل نہیں تھے کہ ان کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے ان کی خدمت کرتے جن کے وہ بجا طور پر مستحق تھے' چنانچہ اس طرح وہ عوام کے اعتماد پر پورا اترنے میں بری طرح ناکام ہو گئے..........

23 مارچ 1956ء کو نافذ العمل ہونے والا آئین جسے بڑی تگ و دو اور کد و کاوش کے بعد تیار کیا گیا تھا' ناقابل عمل ثابت ہوا۔ یہ آئین ایسے خطرناک سمجھوتوں پر مشتمل ہے جن کے نتیجے میں' یہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا ہے! آئین میں موجود ان خامیوں کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ پر امن انقلاب کے ذریعے' ملک کو عقل و ہوش کی راہ پر لایا جائے اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ تمام محب وطن افراد کو جمع کر کے اپنے موجودہ سیاسی مسائل پر غور و خوض کے بعد ایک ایسا آئین تشکیل دیا جائے جو ہمارے مسلمان عوام کے ورثے اور تاریخی روایات سے بھرپور مطابقت رکھتا ہو اور جب یہ تیار ہو جائے تو مناسب وقت پر اسے عوام کی رائے اور منظوری کے لیے پیش کر دیا جائے"..........

(اسکندر مرزا کے اعلان کا متن ختم)

چنانچہ' ان اسباب اور وجوہات کی بنا پر خود کو خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتے ہوئے اسکندر مرزا نے اپنا اولین فرض یہ سمجھا کہ درج ذیل اقدامات اور احکام کے ذریعے پاکستان کو مکمل انتشار اور تباہی سے بچایا جائے...... جو اقدامات کیے گئے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے......

(الف) 1956ء کے آئین کی منسوخی:

(ب) فوری طور پر مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی برطرفی:

(ج) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی تحلیل:

(د) تمام سیاسی جماعتوں کا خاتمہ اور

(و) کسی متبادل انتظام تک پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ

پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف' جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا اور مسلح افواج کو ان کی کمان میں دے دیا گیا' جنہوں نے دوسرے دن قوم سے اپنی نشری خطاب میں اسی قسم کی باتیں دہرائیں اور اس اقدام کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انقلابی اور انتہا پسندانہ اقدام بڑے تذبذب اور سوچ بچار کے بعد اٹھایا گیا ہے: تاہم ہمیں کامل یقین ہے کہ اگر یہ اقدام نہ کیا جاتا تو ملک کو بھرپور انتشار اور مکمل تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا"۔

انہوں نے بھی اس صورتحال کے لیے سیاست دانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور ان پر الزام عائد کیا کہ اپنے باہمی اختلافات دشمنیوں اور تنازعات کی اس لامتناہی جنگ کے دوران انہوں نے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ ملک اور قوم پر اس کے کیا مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں' انہیں صرف اپنے مفادات سے ہی غرض تھی اس سلسلے میں وہ تمام حدیں عبور کر چکے تھے چونکہ ان کے پاس قوم کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا' چنانچہ انہوں نے صوبائی تعصب اور مذہبی' نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دے کر' ایک پاکستانی کو دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا انہیں کسی میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی تھی۔ اقتدار اور اختیارات کی اس دوڑ میں جس چیز کو اولیت حاصل تھی وہ تھا ذاتی مفاد! ملک اور قوم جائے بھاڑ میں ان کی بلا سے!

فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنی نشری تقریر میں یہ انکشاف بھی کیا کہ مرحوم غلام محمد ان سے کئی مواقع پر یہ کہہ چکے تھے کہ وہ اقتدار سنبھال لیں؛ تاہم انہوں نے ایسا کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کیونکہ انہیں بہرحال امید تھی کہ کوئی نہ کوئی سیاست دان' اس موقع پر اٹھے گا جو قوم کی رہنمائی کرے گا؛ تاہم بعد کے واقعات نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ایک مضبوط اور مستحکم ملک' کی جگ ہنسائی ہوئی' یہ سب کچھ بہت افسوس ناک تھا: تاہم اس صورت حال کا کوئی نہ کوئی حل اور علاج بھی ضروری تھا...... اپنے فوری مقاصد کی نشان دہی کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہم جمہوریت بحال کر دیں گے لیکن وہ جمہوریت ایسی ہوگی جسے لوگ سمجھ سکیں اور جو قابل عمل بھی ہو"۔

اگرچہ دونوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ آئین ناقابل عمل ہے مگر تین دن کے بعد 10 اکتوبر 1958ء قوانین کو جاری رکھنے کا حکم نافذ کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ اگرچہ آئین معطل

کر دیا گیا ہے مگر ملک پر اس کی دفعات کے تحت حکومت کی جاتی رہے گی سوائے اس صورت کے کہ صدر یا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کوئی حکم یا قانون جاری کیا ہو۔ اس آرڈر میں دوسری اہم دفعہ یہ تھی کہ کوئی بھی عدالت چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر یا ڈپٹی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے خلاف یا کسی دوسرے شخص کے خلاف جسے ان کے اختیارات حاصل ہوں' کوئی رٹ جاری نہیں کر سکتی اور کوئی عدالت صدارتی فرمان یا اس کے تحت بنائے گئے کسی قانون پر یا کسی مارشل لا آرڈر یا مارشل لا قانون یا کسی فوجی عدالت کے حکم یا فیصلے یا نتیجے پر نہ اعتراض کر سکتی ہے نہ کسی کو اس کی اجازت دے سکتی ہے۔

تین روز بعد 13 اکتوبر 1958ء کو سپریم کورٹ میں اس آرڈر پر اسٹیٹ بنام ڈوسو (پی ایل ڈی 1958ء ایس سی 533) کے سلسلے میں غور کیا گیا' اس مقدمے میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا ملزم کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم جو دوسو کے مقدمے میں عدالت عالیہ نے جاری کیا تھا' 1958ء کے اس آرڈر کی دفعات سے کالعدم ہو جاتا ہے' 14 اکتوبر 1958ء کو عدالت نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا یہ رٹ معطل ہو گئی اس فیصلے کی وجوہات 23 اکتوبر 1958ء کو بیان کی گئیں اور ان وجوہات میں کہا گیا کہ آئین کا کالعدم ہونا اور صدر اسکندر مرزا کی طرف سے مارشل لا کا نفاذ کسی انقلاب کے کامیاب عمل ہیں جنہوں نے بذات خود ایک نیا قانونی نظام تشکیل کر دیا ہے اور پرانے نظام کو ختم کر دیا ہے کیونکہ قانون کے تحت اگر انقلاب آئین کو معطل کر دیتا ہے اور یہ معطلی مؤثر ہو جاتی ہے تو یہ خود قانون بنانے والا ادارہ بن جاتا ہے۔

یہ فیصلہ اسکندر مرزا کے اقدامات کو جائز قرار دینے کا ایک سرٹیفکیٹ تھا لیکن اس وقت انہوں نے اندازہ نہیں کیا کہ سپریم کورٹ کی طرف سے پیش کیے جانے والا یہ اصول ان کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا ہے' سپریم کورٹ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ اگر کوئی بغاوت کامیاب ہو جائے تو یہ خود طاقت کا جائز سرچشمہ بن جاتی ہے' کمانڈر انچیف نے اپنی آرزو پوری کرنے میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا تین دن بعد 27 اکتوبر 1958ء کی آدھی رات کو اس صدر کو جس نے کمانڈر انچیف کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا تھا گرفتار کر لیا گیا اور جلاوطن کر دیا گیا' یہ دوسری بغاوت تھی اس کے لیے کمانڈر انچیف کو کوئی سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے انہوں نے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا اس طرح پاکستان کا مارشل لا کا پہلا دور شروع ہوا۔

یہ بات درست ہے کہ صدر اسکندر مرزا کے فرمان جس کی رو سے مارشل لا نافذ ہوا

اور کمانڈر انچیف کے پیغام میں سیاستدانوں پر الزامات عائد کئے گئے وہ بہت حد تک درست تھے لیکن جمہوری نظام اور آئین کی ناکامی کے کیا یہی اسباب تھے؟

صدر اسکندر مرزا کو ہٹانے کے لیے ایوب خان نے بھی ان ہی الزامات کا سہارا لیا اور کہا کہ ان کا ایسے سیاستدانوں سے قریبی تعلق تھا جو پاکستان کو اس افراتفری کی کیفیت تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں' یہ عام تاثر تھا کہ اسکندر مرزا بھی سیاسی ابتری کے اسی قدر ذمہ دار ہیں جتنا کوئی اور ہوسکتا ہے۔ اسکندر مرزا ان شرم ناک واقعات کے بھی ذمے دار تھے کیونکہ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ آئین پر منصفانہ طور پر عمل کیا جائے اور وہ سیاستدانوں کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال نہ کریں' ان کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے آئین ایک تماشہ بن گیا۔

پاکستان دوہری سازش کا شکار ہوا۔

کوئی آئین خامیوں سے پاک نہیں ہوسکتا' 1956ء کا آئین اپنی خامیوں کے باوجود قابل عمل تھا بشرطیکہ جو لوگ اس کی دفعات کو نافذ کرنے کے ذمہ دار تھے وہ خلوص اور نیک نیتی سے اس کے لیے کوشش کرتے' یہ درست ہے کہ دو ڈھائی سال کے اس عرصے میں جب تک یہ آئین نافذ رہا پارلیمانی جمہوریت اس طرح کامیاب نہیں ہوسکی جس طرح کہ توقع کی جارہی تھی۔ خودغرض سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور سربراہ مملکت کے حد سے بڑھے ہوئے لالچ نے آئین کو تماشہ بنادیا تھا اور چند خودغرضوں کے مفادات پورے کرنے کے لیے جمہوریت کو داؤ پر لگادیا گیا' ذاتی مفاد اور صوبائی تعصب کو قومی مفاد پر ترجیح دی جاتی تھی' 1956ء کے آئین کے منظور ہوتے ہی گروہی رقابت نے تھوڑے عرصے ہی میں اپنی جگہ بنالی تھی یہی وجہ تھی کہ سربراہ مملکت بھی سیاست کے کھیل میں شریک ہوگئے اور اپنے مفادات کے لیے حکومتیں بنانے اور توڑنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ پاکستان کے کمیشن نے بھی 1961ء میں اپنی رپورٹ کے پیراگراف 13 میں کہا'' جہاں سربراہ مملکت کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مراد سابق صدر اسکندر مرزا اور ان کے پیش رو ہیں' یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے دخل اندازی نہیں کی یا وہ اس افراتفری کے ذمہ دار نہیں تھے جو سیاسی ماحول میں پیدا ہوگئی تھی یا یہ کہ وہ ذاتی مفاد یا صوبائی تعصب سے بالاتر تھے۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ سربراہ مملکت سے عوام کے

نمائندواں تک اختیارات اسی صورت میں پہنچ سکتے ہیں جب نمائندے منظم ہوں اور مل جل کر آمریت کا مقابلہ کرسکتے ہوں۔ اس مقام تک پہنچنے تک سربراہ مملکت دخل اندازی کردیتے تھے سربراہ مملکت کی طرف سے دخل اندازی کو پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کا سبب تسلیم نہ کرنا ان کو بری الذمہ قرار نہیں دے دیتا۔ ہم ان کے خلاف یا سیاست دانوں کے خلاف تحقیقات نہیں کر رہے ہیں ہم یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ اگر برسراقتدار جماعتوں میں اتحاد اور تنظیم ہوتی تو سربراہ مملکت کی طرف سے دخل اندازی ممکن نہیں ہوتی۔''

مرزا کو اپنی حرکتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا' اس میں شک نہیں کہ حکومت پر قبضے کی سازش تیار کرنے والے دراصل ایوب خان ہی تھے اور انہوں نے ہی اس سے فائدہ اٹھایا انہوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسکندر مرزا کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا اور جب وہ مقصد حاصل ہوگیا تو اسکندر مرزا کو ہٹادیا گیا اس طرح پاکستان دوہری سازش کا شکار ہوا۔

اسکندر مرزا کنٹرولڈ ڈیموکریسی پر یقین رکھتے تھے تو ایوب خان ان سے ایک قدم آگے بڑھ گئے ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے لوگ جمہوریت کے اہل نہیں ہیں' وہ سیاست دانوں کو بھی برا سمجھتے تھے۔ اپنی کتاب 'فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' میں انہوں نے پاکستان کے لیے مندرجہ ذیل اسکیم پیش کی۔

> '' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں حکومت کا ایک ایسا نظام تشکیل دینا ہے جو ایک نسل تک چل جائے یا جو ملک کو جمہوریت کے لیے تیار کرے اور اس کے کچھ مسائل حل کردے''۔
>
> اس انقلاب کے طویل المیعاد مقاصد میں سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ایسی اصلاحات کی جائیں جو ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے افراتفری اور عدم توازن ختم کردیں' ان اصلاحات کا اصل مدعا'' ایک مناسب آئین کا نفاذ اور آئینی زندگی کی بحالی تھا''۔(فرینڈز ناٹ ماسٹرز)

نے ابتدا تو اچھی کی تھی' درستی کے لیے بہت سے سخت اقدامات کئے گئے جن کی وجہ سے بڑی تیزی کے ساتھ قیمتیں کم ہونے لگیں' بلیک مارکیٹنگ کا خاتمہ ہوگیا' ذخیرہ اندوزی کو روکا گیا اور اسمگلنگ بھی ختم کردی گئی' کرپٹ افسروں کو نکال دیا گیا اور اسمگل شدہ سونے کی بڑی

مقدار پر قبضہ کرلیا گیا؛ مارشل لا قوانین کے تحت بہت سے تارکین وطن نے متروکہ جعلی یا مبالغہ آمیز کلیم واپس لے لیے' تاجروں نے اپنی چھپائی ہوئی آمدنی اور زر مبادلہ کے ذخائر ظاہر کردیے' انتظامیہ کی اصلاح بھی ہوگئی' 24 اکتوبر 1958ء کو 12 رکنی کابینہ بنائی گئی جس میں آٹھ سویلین تھے اور چار جنرل۔ شروع میں زیادہ تر لوگوں نے ان اقدامات کو سراہا' مشرقی پاکستان کے پہلے دورے میں ایوب خان کی بے مثال پذیرائی ہوئی' انہوں نے یونیورسٹی کی اسپورٹس گراؤنڈ میں ایک پبلک جلسے سے بھی خطاب کیا جس میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا کیونکہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں تھے کہ مارشل لا ایک عارضی اقدام ہے اور جب حالات ٹھیک ہوجائیں گے تو اسے ہٹالیا جائے گا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی جیسا کہ ایوب خان نے اپنے 8 اکتوبر 1958ء کے پیغام میں کہا بھی تھا کہ انہوں نے مارشل لا کے انتظام کے لیے بھی سویلین ایجنسیوں کو استعمال کیا اور جیسے ہی قبضہ کرنے کا ابتدائی کام مکمل ہوگیا فوج کو بیرکوں میں بھیج دیا اس سے کسی غلط فہمی کا گمان ختم ہو گیا تھا' مارشل لا کا کام صرف سول انتظامیہ کی مدد کرنا تھا اس کے علاوہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی زیادہ تر منصفانہ اور اچھے طریقے سے کام کررہے تھے۔

ان فوری اقدامات کے بعد متعدد کمیشن قائم کردیے گئے تاکہ زمینی' زرعی' تعلیمی' قانونی اور طبی اصلاحات کے بارے میں اسکیم تیار کی جاسکے نیز سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی کی اصلاح اور ترقی کے لیے بھی منصوبے بنائے جائیں۔ مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے کو بڑے جذبے اور عزم کے ساتھ حل کرلیا گیا۔ کراچی کے نزدیک' کورنگی میں چھ ماہ کے اندر' ایک بہت بڑی بستی تعمیر کردی گئی جہاں پندرہ ہزار مہاجرین کی رہائش کا انتظام تھا' ڈھاکہ اور چاٹگام میں بھی ایسی ہی نئی بستیاں آباد کی گئیں۔ مشرقی پاکستان کے مسائل پر ضروری توجہ دی جانے لگی اور اس کی صنعتی اور معاشی ترقی کے لیے منصوبہ سازی کا آغاز ہوگیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اقدامات لائق تحسین تھے اور یہی سبب ہے کہ شروع شروع میں' اس حکومت کو بھرپور عوامی حمایت اور تائید بھی حاصل رہی؛ تاہم جب یہ محسوس ہونے لگا کہ مارشل لا بدستور قائم رہے گا اور مارشل لا حکام' جمہوریت کی بحالی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو بالخصوص' مشرقی پاکستان کے عوام میں' رفتہ رفتہ یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بڑی دلچسپ معلوم ہوگی کہ جب مسٹر نورالامین سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا ایوب حکومت کو مشرقی پاکستان میں مقبولیت حاصل تھی؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا۔

''شروع میں تو ایسے لگا کہ یہ حکومت تین چار مہینوں کے اندر سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرکے واپس چلی جائے گی اور اس کے بعد عام انتخابات کے نتیجے میں جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے گا لیکن جب عوام نے دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ لوگ تو ٹس سے مس نہیں ہورہے نہ ہی ان کے ارادے واپس جانے کے لگتے ہیں' تب یہ حکومت لوگوں میں غیر مقبول ہونے لگی''۔

مشرقی پاکستان کے عوام میں احساس محرومی

جنرل ایوب' جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' اس نقطہ نظر کے حامل تھے کہ مغربی طرز جمہوریت پاکستانی عوام کے ورثے اور تاریخی روایات و خصوصیات سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا' چنانچہ ایسی جمہوریت کی تعمیل بالکل نچلی سطح سے کی جانی ضروری ہے جو عوام کی تاریخی اور موروثی خصوصیات و رجحانات کے حوالے سے موزوں ترین ہو...... جمہوریت کی اس نئی شکل کے بارے میں اختیار کئے جانے والے طریقوں کو' 1959ء کے بنیادی جمہوریتوں کے حکم میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ' بیان کیا گیا تھا یہ نچلی عوامی سطح پر ''لوکل سیلف گورنمنٹ'' کا منصوبہ تھا۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے' بنیادی جمہوریت کا یہ نظریہ اس کے لیے الٹا قدم تھا کیوں کہ ملک کا یہ حصہ اس قسم کے ارتقائی عمل سے انگریز حکومت کے دور میں پہلے ہی گزر چکا تھا جس کا آغاز' ویلج چوکیدارا ایکٹ' مجریہ 1870 اور لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ مجریہ 1885ء کے ذریعے ہوا تھا چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام میں جو مغربی پاکستانیوں کی بہ نسبت' سیاسی اعتبار سے زیادہ باشعور تھے' احساس محرومی پیدا ہونے لگا اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر یہ فوجی حکومت اور مارشل لا اسی طرح موجود رہے تو وہ ایک کالونی بن کر رہ جائیں گے اور ملک کی حکومت میں شراکت کے مواقع سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مشرقی پاکستان کے سابق وزیر اعلیٰ' مسٹر نورالامین نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جب مارشل لا کا نفاذ ہوا اور تین برس گزرنے کے باوجود بھی کوئی آئین تشکیل نہ دیا جا سکا تو مشرقی پاکستان کے عوام میں اس احساس محرومی نے جنم لیا کہ ملکی امور اور انتظام میں ان کا کوئی حصہ یا کردار نہیں رہا''۔

رفتہ رفتہ ملک کے اس حصے میں پایا جانے والا اضطراب اور بے چینی بڑھتی چلی گئی؛ عوام بڑی بے تابی سے 17 فروری 1960ء کے آئین کمیشن کی رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے

تا کہ آئینی تجاویز سامنے آئیں۔

بالآخر آئین کمیشن نے اپنی رپورٹ اپریل 1961ء میں پیش کر دی جس میں ملک کے لیے متوازن اختیارات پر مبنی امریکی طرز کے صدارتی نظام حکومت کی سفارش کی گئی تھی جو دو ایوانی مقننہ پر مشتمل اور وفاقی نوعیت کا ہو۔ صدر' نائب صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات' اس انتخابی ادارے کے ذریعے عمل میں آئیں جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہو۔

1962ء میں نرالا آئین

جنرل ایوب خان نے' صدارتی نظام حکومت کی تجویز تو منظور کر لی؛ تاہم دیگر تجاویز کو نامنظور کرتے ہوئے مارچ 1962ء میں ایک ایسا آئین وضع کیا جو نہ تو صدارتی تھا اور نہ پارلیمانی اور نہ ہی اس میں عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا گیا تھا...... اس کے علاوہ مقننہ کو بھی ایسے مؤثر اور واضح اختیارات نہیں دیئے گئے تھے جن کے ذریعے وہ ملکی انتظامیہ کو کنٹرول کر سکے! تمام تر اختیارات' صدر کی ذات میں مرکوز کر دیئے گئے تھے' جس کا انتخاب بنیادی جمہوریت کے اسی ہزار اراکین کے ذریعے عمل میں آنا تھا حتیٰ کہ بجٹ کے سلسلے میں رائے دینے کا حق بھی چھین لیا گیا تھا' صوبوں کو کسی قسم کی خود مختاری نہیں دی گئی تھی اور نہ انہیں مرکزی حکومت کی ہدایات پر عمل درآمد کا کوئی اختیار ہی حاصل تھا' یہاں تک کہ صوبائی وزرا کی تقرری بھی براہ راست صدر کے پاس تھی۔

اس نوعیت کے آئینی اقدامات اور سفارشات کے نتیجے میں' دونوں صوبوں کے عوام میں' شدید مایوسی پھیل گئی کیونکہ اس طرح جمہوریت کو ایک بھیانک مذاق بنا کر رکھ دیا گیا تھا؛ تاہم اپوزیشن کو سختی کے ساتھ کچل دیا گیا' تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور چھ برس کی مدت کے لیے ''ایبڈو'' کے تحت متعدد سیاسی لیڈروں کو نااہل قرار دے دیا گیا' پاکستان پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس مجریہ 1963ء کے نفاذ کے ذریعے پریس کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے تحت' 1964ء میں کنٹرولڈ پریس کی داغ بیل ڈالی گئی۔

متعدد سیاسی لیڈر جن میں حسین شہید سہروردی' خان عبدالقیوم خان' مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن شامل تھے' حراست میں لے لیے گئے؛ تاہم یہ بات دلچسپ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ایبڈو کے تحت نااہل قرار نہیں دیا گیا بلکہ انہیں بدعنوانیوں کے جرم میں مقدمہ چلانے کی غرض سے گرفتار کیا گیا تھا جس میں وہ بری کر دیئے گئے اور اس طرح اپوزیشن کی قیادت کرنے والے ہیرو کے طور پر سامنے آئے۔

شروع میں تو حکومت کو کوئی خاص دشواری یا مسئلہ درپیش نہیں رہا اور وہ بدستور اطمینان سے کام کرتی رہی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسے طلبا اور سیاست دانوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' 1960ء میں چٹا گانگ ضلع میں بھیانک سمندری طوفان سے زبردست تباہی اور انسانی جان و مال کی بربادی ہوئی۔ جنرل اعظم' اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر تھے انہوں نے اس معاملے میں ذاتی طور پر' گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چٹا گانگ ضلع کو ہر ممکن طریقے سے امدادی ساز و سامان اور غذائی اشیا فراہم کرنے کے انتظامات کئے اور اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر وہاں قائم کرلیا ان کے اس بروقت اقدام اور عملی کوششوں نے حکومت کو ایک بڑی بدنامی سے بچالیا؛ تاہم حکومت کی تعلیمی اصلاحات یا یوں کہہ لیں کہ عجلت اور افراتفری میں ان کے عملی نفاذ کے سبب مشرقی پاکستان میں ایوب حکومت کے خلاف پہلا بڑا مظاہرہ کیا گیا۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ 1962ء کا سال پہلی مارشل لا حکومت کی کامیابیوں کا سال تھا' اس سال بالخصوص مشرقی پاکستان میں متعدد عظیم الشان صنعتی منصوبوں کی بنیاد رکھی گئی' سلہٹ میں' فروری 1962ء میں کھاد کے کارخانے کا افتتاح ہوا' مارچ 1962ء میں ایوب خان نے کرنافلی ملٹی پرپز ہائڈل پروجیکٹ کا افتتاح کیا...... ریلوے کو بھی صوبوں کی تحویل میں دے دیا گیا اور واپڈا اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کو بھی جولائی 1962ء میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ مشرقی اور مغربی دونوں صوبوں کی کارپوریشنیں علیحدہ قائم ہو جائیں حتیٰ کہ جولائی 1962ء میں مرکزی ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا نصف سے زائد حصہ مشرقی پاکستان کو دیا گیا تھا۔

اپنی ان کامیابیوں کے طفیل' فیلڈ مارشل ایوب خان بجا طور پر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہوں نے ایک بنیادی اور ضروری ڈھانچہ بنا دیا ہے جس پر ایک آزاد معاشرہ' مستحکم حکومت اور مضبوط انتظامیہ قائم ہو سکے گی۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ اب مناسب وقت آ چکا ہے کہ وہ اپنے بحالی جمہوریت کے وعدے کی تکمیل کرتے ہوئے اس جمہوریت کو متعارف کروائیں جو پاکستانی عوام کی روایات کے عین مطابق ہے؛ تاہم ان کے یہ اندازے غلط ثابت ہوئے کیونکہ ان کے منصوبوں پر کسی بھی جانب سے مخالفت کی عدم موجودگی نے انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا بنیادی سبب وہ خود تھے جنہوں نے اپنے سیاسی مخالفین اور پریس کا منہ بند کر رکھا تھا۔

❖

پاکستان کی سیاسی تاریخ

(7 جون 1962ء سے 24 مارچ 1969ء تک)

8 جون 1962ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا تاہم جونہی اس پر عملدرآمد شروع ہوا' سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی کی قیادت میں' اس کے خلاف ملک گیر مہم کا آغاز ہو گیا۔ اسے ایک ایسے اقدام سے تعبیر کیا گیا جس کا بنیادی مقصد صدر ایوب کے اقتدار کو دوام بخشنا تھا۔ آئین کے بنیادی اصولوں کو چیلنج کر دیا گیا' سیاسی جماعتوں کی بحالی و بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مقننہ کے براہ راست انتخابات کے نظام اور بنیادی حقوق کی بحالی کے مطالبات نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔

پہلے تو اس مخالفت کو سختی سے کچل دیا گیا اور سہروردی گرفتار کر لیے گئے جس پر شدید عوامی ردعمل ہوا' خاص طور پر مشرقی پاکستان کی طلبا برادری میں' جس نے تعلیمی اصلاحات اور جون 1961ء کے نئے یونیورسٹی آرڈیننس کے نفاذ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیا قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں سے ان طلبا کے تصادم میں' گولی چلنے کے واقعات بھی ہوئے جس کے نتیجے میں صورت حال مزید سنگین ہو گئی اور یہ تحریک مغربی پاکستان تک پھیل گئی۔ 17 ستمبر 1962ء کو مشرقی پاکستان میں طلبا نے تعلیمی کمیشن کی اصلاحات اور تین سالہ ڈگری کورس کے خلاف عام ہڑتال کا اعلان کر دیا جس پر مغربی پاکستان میں بھی عمل ہوا جس کے بعد طلبا کی بے چینی نے انتہائی سنگین اور خطرناک صورت اختیار کر لی۔ آخر کار حکومت کو ان کے مطالبات تسلیم کرتے ہوئے تین سالہ ڈگری کورس کی تجویز واپس لینا پڑی۔

آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی جلد یہ محسوس کیا جانے لگا کہ آئینی مشینری، خواہ اس کی

شکل وصورت کچھ ہو' سیاسی جماعتوں کے بغیر کام نہیں کر سکے گی' چنانچہ 14 جولائی 1962ء کو پولیٹکل پارٹیز ایکٹ منظور کیا گیا جس کی رو سے سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دے دی گئی: تاہم اب بھی ان پر متعدد پابندیاں تھیں' ان پابندیوں کے باوجود' سیاسی جماعتیں منظر عام پر آنا شروع ہو گئیں' بالخصوص اس وقت' جب ایوب خان نے خود اپنی سیاسی جماعت کنونشن مسلم لیگ بنانے کا فیصلہ کیا۔

سیاسی جماعتوں کے ظہور کے ساتھ ہی آئین کے خلاف' سیاسی ایجی ٹیشن میں بھی شدت پیدا ہونے لگی جس کے نتیجے میں بالآخر حکومت نے 1963ء میں بنیادی حقوق اور صدارتی انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا تو لوگوں کو یہ جان کر انتہائی تعجب ہوا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان' اکیس ہزار دو سو ساٹھ ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دیئے گئے تھے حالانکہ عام خیال اور اندازہ یہی تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو شہری علاقوں کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل ہے۔ چنانچہ انہوں نے انتخابات کے نتائج کو مسترد کرتے ہوئے اسے دھاندلی قرار دیا اور نتیجے کے طور پر اب انہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی جن میں سرکاری جماعت کنونشن مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ 23 مارچ 1965ء کو صدر ایوب نے صدر کے عہدے کی دوسری میعاد کے لیے حلف اٹھایا جس کے بعد ان کی حکومت کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں انہیں اسمبلیوں کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ انہی انتخابات کے دوران' جون 1964ء میں شیخ مجیب الرحمن نے عوامی لیگ کا انتخابی منشور جاری کیا جس میں ''دو معیشتوں'' کے ساتھ' ایک ایسے آئین کا مطالبہ بھی شامل تھا' جس کی بنیاد 1940ء کی ''قرارداد لاہور'' پر رکھی گئی ہو جس میں بقول ان کے دو آزاد مملکتوں کے قیام کی ضمانت موجود تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صدارتی انتخابات میں مشترکہ اپوزیشن کی شکست کے بعد' جس کی قیادت' مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمن اور چند رہنما کر رہے تھے' یہ خیال پیدا ہوا کہ مشرقی پاکستان کی خودمختاری کے مطالبے کو منوانے کے لیے زیادہ انتہاپسندانہ اقدامات ضروری ہو چکے ہیں۔

انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو جانے کے بعد فیلڈ مارشل ایوب خان کی نظر ترقی اور استحکام کے ایک نئے دور کے آغاز پر لگی ہوئی تھی لیکن ان کے یہ منصوبے اس وقت تشنہ تکمیل ہی رہ گئے جب 13 اپریل 1965ء کو بھارت نے رن آف کچھ میں پاکستان کی

فوجی چوکی پر زبردست حملہ کیا۔ حالانکہ بھارت نے' بیس ہزار فوجیوں کے علاوہ چھاتہ بردار فوج بھی اس متنازعہ علاقے میں اتار دی تھی: تاہم ہمارے فوجیوں نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جس کے بعد 30 جون 1965ء کو اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی عمل میں آ گئی اور اس تنازع کو ثالثی کی غرض سے بین الاقوامی ٹریبونل کے سپرد کر دیا گیا: تاہم یہ امن دیرپا ثابت نہ ہو سکا کیونکہ 24 اگست 1965ء کو بھارت نے گجرات ضلع کے گاؤں اعوان پر گولہ باری شروع کر دی اور 30 اگست کو آزاد کشمیر کے ایک گاؤں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کا جواب دیتے ہوئے آزاد کشمیر کی فوج نے پاکستانی افواج کی مدد سے جنگ بندی لائن عبور کرتے ہوئے چھمب اور جوڑیاں پر قبضہ کر لیا۔ ابھی وہ اکھنور سے چھ میل کے فاصلے پر تھی کہ 6 ستمبر 1965ء کو علی الصبح بھارت نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر ایک اور بڑا حملہ کر دیا۔ دونوں ممالک کے درمیان سترہ دنوں تک یہ خوں ریز جنگ جاری رہی جس کے بعد بڑی طاقتوں کی مداخلت سے 23 ستمبر 1965ء کو جنگ بندی ہوئی۔

مشرقی پاکستان کے عوام محب وطن تھے

1965ء کی اس جنگ کے دوران' مشرقی پاکستان نے خود کو مغربی پاکستان سے کٹا ہوا اور بالکل الگ تھلگ محسوس کیا جو اب بھارت کے رحم و کرم پر تھا اور جس کے دفاع اور حفاظت کے لیے فقط ایک ڈویژن فوج اور دو ائیر اسکواڈرن' تھے۔ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کے دفاع کا نظریہ غلط اور ناقابل عمل ثابت ہو چکا تھا اگر چین' بھارت پر کھلی جارحیت کا الزام عائد نہ کرتا اور سکم کی سرحد پر اس کی فوجی تنصیبات کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کی دھمکی نہ دیتا تو یقیناً بھارت مشرقی پاکستان پر بھی حملہ کر دیتا۔

دراصل بھارتی طیاروں نے 6 ستمبر 1965ء کو ڈھاکہ اور اس کے نواحی علاقوں پر بھی حملہ کر دیا تھا لیکن ہماری بہادر فضائیہ نے' کلائی کنڈا کے بھارتی فضائی اڈہ پر اچانک ایک زبردست حملہ کر دیا اور زمین پر ہی متعدد بھارتی طیارے تباہ کر ڈالے' چنانچہ اس واقعہ کے بعد بھارت کی مجال نہیں ہوئی کہ وہ اس علاقے پر بری نظر ڈالتا۔

تنہائی اور الگ تھلگ رہ جانے کے اس شدید احساس کے باوجود' مشرقی پاکستان کے عوام میں جذبہ حب الوطنی کا قطعاً فقدان نہ تھا۔ اس جنگ کے دوران وہ پوری قوم کے ساتھ تھے:

اور انہیں رنج تھا تو اس بات کا کہ انہیں مغربی پاکستان میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ دشمن سے لڑنے کا موقع نہ مل سکا۔ کھیم کرن کے محاذ پر ایسٹ بنگال رجمنٹ نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کیا اور پاکستان ائیر فورس کے مشرقی پاکستانی پائلٹوں نے شجاعت اور دلاوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قوم کے دل جیت لیے تھے اس مرحلے تک علیحدگی کا کوئی سوال نہیں اٹھا تھا۔ قوم اب تک ایک تھی اور ہر مشرقی پاکستانی خوشی کے ساتھ قوم اور وطن کے دفاع کے لیے اپنا سر کٹوا سکتا تھا: تاہم اس جنگ کے بعد ان کا احساس محرومی مزید گہرا ہوتا چلا گیا کیونکہ وہ یہ جان چکے تھے کہ کسی خطرے یا بحران کی صورت میں مغربی پاکستان ان کی مدد کو نہیں آئے گا اور انہیں اکیلے ہی اپنا دفاع کرنا پڑے گا۔

امریکہ اور روس نے پاکستان اور بھارت کے درمیان قیام امن میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا' روسی وزیراعظم مسٹر کوسی جن نے صدر ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کو تاشقند میں امن مذاکرات کی دعوت دی جن میں 10 جنوری 1966ء کو "معاہدہ تاشقند" وجود میں آیا۔

مجیب الرحمٰن کے چھ نکات

تاشقند میں ہونے والے اس معاہدے کے تحت بھارت اور پاکستان نے اپنی اپنی افواج کو ان تمام علاقوں سے واپس بلا لیا جن پر جنگ کے دوران انہوں نے قبضہ کر لیا تھا: تاہم ملک میں اس معاہدے کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اس معاہدے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 8 جولائی 1966ء کو کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔

معاہدہ تاشقند کی مخالفت 1966ء کی بنا پر اپوزیشن کو بھی حکومت کی مذمت کا ایک اور موقع ہاتھ لگ گیا چنانچہ 5 فروری 1965ء کو لاہور میں نواب زادہ نصر اللہ خان نے تمام اپوزیشن پارٹیوں کا اجلاس طلب کر لیا' اسی اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے پہلی مرتبہ اپنے چھ نکات پیش کئے اور مشرقی پاکستان کے لیے مکمل علاقائی خود مختاری کا مطالبہ کر دیا' اس مطالبے کے باعث اپوزیشن پارٹیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور بحالی جمہوریت کے لیے حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا منصوبہ پس پشت چلا گیا...... متعدد اپوزیشن لیڈروں کو جن میں شیخ مجیب

الرحمٰن بھی شامل تھے ایمرجنسی کے تحت گرفتار کر لیا گیا......

یہ چھ نکات کیسے وجود میں آئے اور ان کا خالق کون تھا اس بارے میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن ہرگز اس ذہانت کے مالک نہیں تھے جو ان نکات کی تشکیل کے لئے ضروری تھی جب کہ مسٹر نور الامین کا خیال ہے کہ ان کے پیچھے کسی غیر ملکی طاقت کا ہاتھ تھا! چند دیگر حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان نکات کو مشرقی پاکستان کے سی ایس پی افسران کے ایک گروپ نے کسی بینکار سے مل کر ترتیب دیا: تاہم ایک گواہ اے۔ کے۔ رفیق الحسین نے مبینہ طور پر مسٹر الطاف گوہر کو چھ نکات کا خالق قرار دیتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ انہیں مذکورہ بالا بینکار کے توسط سے شیخ مجیب الرحمٰن کو بھیجا گیا تھا۔ اس گواہ نے مزید انکشاف کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ سب کچھ ایوب خان کی رضامندی سے کیا گیا تھا کیونکہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنا آلہ کار بنا کر اس آل پارٹیز کانفرنس کو ناکام بنانا چاہتے تھے جو نوابزادہ نصر اللہ خان نے لاہور میں طلب کی تھی؛ تاہم مسٹر الطاف گوہر نے اس واقعہ کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ گواہ رفیق الحسین کو اس بات کا علم کانفرنس شروع ہونے سے ذرا پہلے اس وقت ہوا جب شیخ مجیب الرحمٰن نے ان نکات کی ایک نقل "اتفاق" کے ایڈیٹر مانک میاں کے حوالے کی جو خود بھی عوامی لیگ کے ممبر تھے۔ بہرحال حقیقت چاہے کچھ بھی ہو' واقعہ یہ ہے کہ چھ نکات اسی کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر سامنے آئے تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نئے آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی صوبوں کے گورنر بھی تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ نواب کالا باغ کو مغربی اور مسٹر عبدالمنعم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ نواب کالا باغ جمہوریت کے سخت مخالف تھے جبکہ منعم خان کو مشرقی پاکستان میں قطعاً کوئی مقبولیت حاصل نہیں تھی: تاہم ان دونوں نے اس بے رحمی کے ساتھ اپنے اختیارات کا استعمال کیا کہ ایوب حکومت کی ساکھ مجروح ہو گئی۔ انہوں نے سیاسی لیڈروں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی' اخبارات کو بند کر دیا' حتیٰ کہ پریس بھی ضبط کر لئے گئے۔ ان اقدامات سے روز افزوں کشیدگی کو ختم کرنے میں یقیناً کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔

دوسرا عنصر جس نے اس مرحلے پر بے اطمینانی اور کشیدگی میں اضافہ کیا وہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے بیٹوں کا کردار تھا۔ وہ نہ صرف روزمرہ ملکی امور و معاملات میں غیر ضروری مداخلت کرنے لگے تھے بلکہ ناجائز ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے اپنی حیثیت کا بھی استعمال

کرتے تھے۔ ان میں سے ایک تو قومی اسمبلی کا رکن بننے کے بعد اپنے باپ کی سرپرستی میں ایک بڑا صنعتکار بننے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

ملکی دولت 22 خاندانوں میں محدود

ان باتوں سے قطع نظر ملک میں تیز رفتار صنعتی ترقی کے نتیجے میں دولت کی غیر مساوی تقسیم بڑھنے لگی کیونکہ اس طرح ملک کی دولت رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کے چند گھرانوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ملک کی تمام دولت مغربی پاکستان کے بائیس صنعتی خاندانوں کے ہاتھوں میں جمع ہو گئی تھی جس کے سبب مغربی پاکستان میں ظاہر ہے ترقی اور خوشحالی کی رفتار نسبتاً زیادہ تیز تھی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے عوام نے ان صنعتکار خاندانوں کو تمام تر استحصال اور حق تلفی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے مغربی پاکستان کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈہ شروع کر دیا جس کا بنیادی سبب دونوں صوبوں کے معاشی اور اقتصادی عدم مساوات اور تفاوت کے علاوہ یہ بھی تھا کہ ایوب حکومت کو مسلح افواج کی تائید و حمایت حاصل تھی؛ جس کی اکثریت کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔

حالانکہ مارشل لا کا بنیادی مقصد ملک سے کرپشن اور بدعنوانیوں کا جڑ سے خاتمہ کرنا تھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے برعکس ایوب خان کی نام نہاد آئینی حکومت کے دوران کرپشن اور بدعنوانیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ دراصل بنیادی جمہوریتوں کا نظام اس تمام کرپشن کا بنیادی سبب تھا جس سے ملک کے ہر گوشے میں بدعنوانیوں کو فروغ حاصل ہو رہا تھا؛ تاہم ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ حکومت خود ان "بی ڈی ممبرز" کی بدعنوانیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کیونکہ صدر کا انتخاب بھی یہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ کھلم کھلا سب سے بڑھ کر بولی لگانے والے کو اپنا ووٹ دیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایوب خان کی مسلح افواج کو ہر قیمت پر راضی رکھنے کی پالیسی نے بھی ان کے خلاف رفتہ رفتہ عوامی ناراضگی اور خفگی کو جنم دیا جن کے تحت افواج کو زمینیں دی جا رہی تھیں۔ ان کی تنخواہوں اور پنشن میں اضافہ کر دیا گیا تھا اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہیں ملازمتیں دی جا رہی تھیں۔

ان تمام عوامل نے مل کر حکومت کے خلاف شدید ناراضگی اور نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ پورا ملک بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار تھا کہ اسی اثنا میں سابق وزیر خارجہ

ذوالفقار علی بھٹو نے 1968ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا اور ایوب خان کے خلاف چلنے والی تحریک میں پورے زور شور کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اپوزیشن نے اپنی تحریک کا پہلا ہدف صوبائی گورنروں اور ان کی جانب سے ایمرجنسی کے تحت اختیارات کے ناجائز استعمال کو قرار دیا۔ چنانچہ تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر ایمرجنسی اٹھا لینے کا مطالبہ کر دیا اور "یونائیٹڈ نیشنل کمانڈ" کے نام سے ایک مشترکہ جماعت قائم کر لی۔ مسٹر بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے اس میں شرکت نہیں کی؛ تاہم جمہوریت کی بحالی اور دولت کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کے لئے انہوں نے اپنی حکومت مخالف مہم کو برابر جاری رکھا۔ بہر حال ان تمام باتوں کا حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تمام سیاسی لیڈر جن میں مسٹر بھٹو بھی شامل تھے گرفتار کر لئے گئے اور اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر حکومت نے ملک میں ایمرجنسی کو بدستور قائم رکھنے کی قرارداد منظور کرا لی۔

اس دور میں نواب کالا باغ اور فیلڈ مارشل ایوب خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں نواب کالا باغ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ان کے بجائے اس وقت کے کمانڈر انچیف، جنرل محمد موسیٰ کو مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کرتے ہوئے جنرل یحیٰی خان کو کمانڈر انچیف کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ جنرل موسیٰ نے نہ صرف زیر حراست سیاسی لیڈروں کو رہا کر دیا بلکہ مصالحانہ اقدامات کئے۔ بلوچستان کے مری، بگٹی اور مینگل قبائل کے لئے معافی کا اعلان کرتے ہوئے ان کی سرداری حیثیت کو بحال کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں گورنر منعم خان کے جبری اقدامات بدستور جاری تھے۔ شیخ مجیب الرحمن پر دیگر 35 افراد کے ہمراہ مسلح بغاوت کے ذریعے مشرقی پاکستان کی ملک سے علیحدگی کی سازش کے الزامات عائد کئے گئے تھے اور ان پر "اگرتلہ سازش کیس" کے عنوان سے مقدمہ بنا دیا گیا تھا جس کا آغاز جون 1968ء میں ہوا۔ مغربی پاکستان میں گورنر (جنرل) محمد موسیٰ کے مصالحانہ اقدامات کے باوجود حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن برابر زور پکڑتا جا رہا تھا جس نے نومبر 1968ء میں کافی سنگین صورت اختیار کر لی جس میں ملک کے تمام طبقات شامل تھے۔ وکیلوں، ڈاکٹروں اور طلبہ نے جلوسوں کی شکل میں حکومت کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے اور ایوب خان سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا جانے لگا حتیٰ کہ فیلڈ مارشل ایوب خان پر پشاور میں ایک جلسے سے خطاب کے دوران قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ جب حکومت نے محسوس کر لیا کہ ایجی ٹیشن پر قابو پانے کی غرض سے اس کی تمام کوششیں لاحاصل اور بے سود ثابت ہو رہی ہیں تو مجبور ہو کر اس نے تمام سیاسی لیڈروں کو قید سے رہا کر دیا اور اپوزیشن

لیڈروں کو راولپنڈی میں' راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کی دعوت دے دی؛ تاہم سیاسی جماعتوں نے جو اس وقت تک "ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی" قائم کر چکی تھیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے پیشگی شرط عائد کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ایمرجنسی کو فی الفور اٹھالیا جائے ورنہ ایجی ٹیشن بدستور جاری رہے گا۔ 14 فروری 1969ء کو اپوزیشن کی جانب سے ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا۔ اس دن متعدد جلوس نکالے گئے جن کا پولیس سے تصادم ہوا جس کے نتیجے میں بے شمار افراد زخمی ہو گئے۔

مسٹر بھٹو نے جواب تک زیر حراست تھے' بھوک ہڑتال کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایمرجنسی کو فوری طور پر اٹھالیا جائے آخر کار 17 فروری 1969ء کو حکومت نے ایمرجنسی اٹھانے کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں مسٹر بھٹو رہا کر دیئے گئے۔

حکومت کے اس اقدام کے بعد' ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کر دی؛ تاہم پاکستان پیپلز پارٹی' عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی نے اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر ہونے والے ابتدائی مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے جس کے بعد کمیٹی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کر کے کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کیا جائے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پیرول پر رہا ہو کر اس کانفرنس میں شرکت پر آمادہ بھی ہو چکے تھے کہ اسی اثنا میں اگرتلہ سازش کیس کے ایک ملزم کو فرار ہونے کے شبہ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی لاش اس کے عزیزوں کے سپرد کر دی گئی۔ وہ اس کی میت کو جلوس کی شکل میں لے کر شہر کی شاہراہوں سے گزرے جس میں ایک بپھرا ہوا ہجوم بھی شامل ہو گیا جس نے انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر لی اور پورے مشرقی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ڈھاکہ' کشتیا اور نواکھالی میں پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کر دی جس میں نو افراد ہلاک اور 51 زخمی ہو گئے۔ چنانچہ شیخ مجیب الرحمٰن نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اس وقت تک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے جب تک اگرتلہ سازش کیس واپس نہیں لے لیا جاتا۔ 21 فروری 1969ء کو ایوب خان نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے اور 22 فروری کو وہ آرڈیننس بھی کالعدم قرار دے دیا گیا جس کے تحت قائم کردہ ٹربیونل کے روبرو شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سازش کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا جس کے نتیجے میں شیخ مجیب رہا کر دیئے گئے اور بعد میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ایوب خان اس بات پر رضامند ہو گئے کہ ملک میں پارلیمانی نظام حکومت قائم ہو گا اور اسمبلیوں کے انتخابات براہ راست بالغ رائے کی بنیاد پر

ہوں گے جس کے بعد نوابزادہ نصراللہ خان نے ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی توڑنے کا اعلان کر دیا؛ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن نے مشترکہ اپوزیشن سے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کر لی کہ اس نے علاقائی خودمختاری اور ون یونٹ کے خاتمے کے لئے ان کے مطالبات کی تائید نہیں کی۔

ایوب خان نے اپنے گورنروں کو بھی تبدیل کر دیا اس کے باوجود مشرقی پاکستان میں ایجی ٹیشن بدستور جاری رہا اور 10 سے 20 مارچ کے دوران 39 افراد کو ڈھاکہ میں قتل کر دیا گیا اور لوٹ مار اور آتش زنی کے بھی متعدد واقعات رونما ہوئے۔

نئے گورنروں کے تقرر کے بعد کشیدگی میں کچھ کمی آ چلی تھی اور تحریک بھی رفتہ رفتہ دھیمی ہونے لگی تھی کہ اچانک 25 مارچ 1969 کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکے ہیں اور انہوں نے اقتدار کمانڈر انچیف' جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دیا ہے۔ اس طرح پاکستان میں ایوبی عہد کا خاتمہ ہو گیا؛ تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں خاصا استحکام تھا اور تمام شعبوں میں قابل ذکر تعمیر و ترقی کا کام ہوا تھا حتیٰ کہ مشرقی پاکستان میں بھی متعدد ترقیاتی منصوبے مکمل کئے گئے۔ اسی دور میں پاکستان کے عزت اور وقار میں اضافہ ہوا اور اقوام عالم میں اسے ایک نمایاں مقام بھی ملا لیکن بدقسمتی سے یہاں سیاسی شعور کا ہمیشہ ہی بڑا فقدان رہا۔ اگر ایوب خان تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز نہ کر لیتے اور سیاسی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام کو حکومت میں شرکت کا حقیقی احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتے تو اس بدقسمت ملک کی تاریخ مختلف ہوتی اور تاریخ میں ان کا نام پاکستان کے عظیم "سیاسی مدبر" کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جنوری 1969ء میں اپنی سنگین علالت کے سبب وہ خود حکومت سے الگ ہو گئے تھے' ورنہ وہ ابھی کافی طویل عرصے تک برسر اقتدار رہنا چاہتے تھے؛ تاہم اس موضوع پر ہم آئندہ باب میں گفتگو کریں گے جب یہ سوال زیر بحث آئے گا کہ ان کی اس سنگین علالت کا کسی نے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھایا تھا۔

پھر مارشل لا

جنوری 1968ء کے آخر میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بیمار ہو گئے۔ اگر چہ اس بات کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ اصل میں ان کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور کچھ عرصہ تک وہ بولنے سے بھی معذور رہے تھے تو وہ اپنے فرائض کیا انجام دیتے لیکن دنیا کو یہی بتایا گیا کہ ان پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا ہے۔

لہٰذا یہ تجویز پیش کی گئی کہ جب سے ایوب خان بیمار ہوئے تھے آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو عارضی طور پر ایوان صدر کا کنٹرول دے دیا جائے۔ سیکرٹریوں اور وزراء سے صدر کی ملاقات بند ہو گئی۔ صدر کا مشیر جوان کے بہت قریب ہوتا تھا اب وہ بھی ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس سے پہلے زیادہ تر فیصلے مشیر کے ذریعے ہی منظر عام پر آتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ صحت یاب ہونے کے بعد بھی صدر کی حیثیت کم ہو کر نام کے سربراہ کی رہ گئی تھی کیونکہ شروع میں تو وہ جسمانی طور پر کوئی کام کرنے کے لائق نہیں تھے۔ ان کی یہ حیثیت اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ 25 مارچ 1969ء کو یحییٰ خان نے مارشل لا کا اعلان کر کے حکومت سنبھال لی اور خود مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں صدر ہونے کا اعلان کر دیا۔

بڑی عجیب صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ ایسا سیاسی جوش و خروش پیدا ہو گیا جو بعد میں ایوب خان کے حکومت چھوڑنے پر ختم ہوا۔ سیاست کے ایک طالبعلم کے لئے جو بے چینی پیدا ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ایوب خان کی بیماری نے ایک سیاسی تحریک کو جنم دیا جو بہرحال شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک کے شروع ہونے میں دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے۔ دیکھنے میں تو ملک میں ایک آئینی حکومت برسر اقتدار تھی اور معمول کا کاروبار حکومت چلا رہی تھی۔ اگر صدر بیماری کی وجہ سے اپنے فرائض انجام دینے کے لائق نہ

رہے تو آئین میں بتایا گیا تھا کہ اسپیکر عارضی طور پر صدر کا عہدہ سنبھال لے گا لیکن اگر صدر ذہنی یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے معذور ہو گیا ہے تو اسے اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کر کے ہٹایا جا سکتا ہے (لیکن یہ ایک طویل طریقہ کار تھا جس میں میڈیکل معائنہ بھی شامل تھا) اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد اسپیکر کو عارضی طور پر کچھ آئینی اقدامات کرنے پڑتے اور بعد میں اس عہدے پر مستقلاً فائز ہو جاتا لیکن 1962ء کے آئین کی دفعات اور اسی طرح کی دوسری دفعات میں ذہنی اور جسمانی معذوری کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ جب بھی صدر بیمار ہو جائے اور وہ اتنا بیمار ہو جائے کہ صاحب فراش ہو جائے تو اسے اپنا عہدہ چھوڑنا ہو گا نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ تھوڑے سے عرصہ کے لئے بھی جیسے ایک دو دن کے لے صدر بے ہوش ہو جائے (جیسا کہ بتایا گیا تھا کہ ایوب خان بے ہوش ہو گئے تھے) تو بھی اس طرح کے اقدامات کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر صدر کسی شدید قسم کی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کے فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ پڑتی ہو کافی عرصے تک اسے ناقابل رکھتی ہو یا اتنے عرصہ تک اسے معذور رکھتی ہو جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تب آئین کے مطابق ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔

کسی صورت میں بھی چاہے صدر تھوڑے عرصے کے لئے بیمار ہوا ہو جہاں آئین کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت ہو یا طویل عرصہ کے لئے اپنے فرائض انجام دینے سے معذور ہو گیا ہو جس میں آئین کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے یحییٰ خان کا ایوان صدر کا کنٹرول سنبھالنا اور ملک کی حکومت چلانا آئین کی خلاف ورزی تھا۔ اگر جنرل یحییٰ خان نے ایسا کیا جس کا ان پر الزام لگایا جاتا ہے تو وہ سنگین خلاف ورزی کے مجرم تھے۔ ایسے حالات میں ملک کی حکومت سنبھالنے میں ان کی نیک نیتی پر شک کیا جا سکتا ہے۔ اس الزام کے بارے میں ثبوت کا معائنہ بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جس گواہ نے سب سے زیادہ ٹھوس شہادت دی وہ الطاف گوہر ہیں جو اس وقت اطلاعات کے سیکرٹری تھے۔ الطاف گوہر بڑے تجربہ کار سول سرونٹ ہیں اور ہمارے خیال میں وہ بڑے لائق بھی ہیں۔ شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے فیلڈ مارشل ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے ہمارے پاس کئی لوگوں کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص حیثیت رکھتے تھے اور ان پر صدر کو بہت اعتماد تھا۔ جنرل یحییٰ نے اپنی گواہی میں کہا فیلڈ مارشل ایوب خان کی نظر میں الطاف گوہر کوئی غلطی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا الطاف گوہر جیسی حیثیت کے شخص کی طرف سے اس الزام پر غور کئے جانے کی ضرورت ہے۔

الطاف گوہر کے مطابق اس وقت وہ ڈھاکہ میں تھے اور صدر سے ان کی آخری ملاقات 28 جنوری 1968ء کو ہوئی تھی اس وقت وہ تندرست تھے۔ الطاف گوہر کو ڈھاکے میں بتایا گیا کہ صدر کا پہلی تاریخ کو ہونے والا خطاب گلے میں تکلیف کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ یہ خطاب ہر ماہ پہلی تاریخ کو ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے رہے اور 3 یا 4 فروری کو ڈھاکے سے واپس آ گئے۔ راولپنڈی پہنچ کر صدر کے پبلک ریلشنز آفیسر نے جو وزارت اطلاعات کے ملازم تھے بتایا کہ صدر بہت بیمار ہیں لہٰذا ان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ وہ دوڑ کر ایوان صدر جائیں مگر وہ ایسا نہیں کر سکے کیونکہ ان کی بیٹی زخمی ہوگئی تھی اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت تھی۔ دوسرے دن جب وہ ایوان صدر پہنچے تو صدر دروازہ بند تھا اور گارڈ نے ان سے کہا کہ کسی شخص کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ الطاف گوہر نے اپنے وزیر خواجہ شہاب الدین سے بات کی اور ان کے ذریعے صدر کے مشیر فدا حسن سے بات کی۔

یہ سمجھنے کے لئے فدا حسن سے بات کرنے کی کیا اہمیت تھی یہ ضروری ہے کہ فدا حسن کے مرتبے کی تفصیل بتائی جائے۔ وہ جون 1966 سے صدر کے پرسنل سیکرٹری تھے لیکن جس زمانے کا یہ ذکر ہو رہا ہے پہلے صدر ان پر اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ ان کے عہدے کو کابینہ کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ فدا حسن کہتے ہیں کہ کسی موقع پر بھی وہ سیاسی مشیر نہیں رہے بلکہ وہ ایک طرح کے پرسنل اسٹنٹ تھے جس میں پرسنل پر زیادہ زور تھا لیکن کابینہ کی سطح پر ان کی ترقی کا مطلب تھا کہ فدا حسن کو سیاست کے دائرے میں لایا جائے لیکن اس بات کی خواہش نہ تو صدر کو تھی اور نہ ہی ایسا فدا حسن چاہتے تھے۔ اس وجہ سے انہیں ایک مشیر کا مرتبہ دیا گیا تھا۔ اس لئے الطاف گوہر کا فدا حسن کو ٹیلی فون کرنا یا اپنے وزیر سے رابطہ کرنا کسی ایسے شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش تھی جو صدر کے قریب ہو اور یہ معلوم ہو سکے کہ ایوان صدر ممنوعہ علاقہ کیوں ہو گیا ہے۔

یحییٰ خاں صدر پر حاوی ہو گئے تھے

مسٹر فدا حسن اور اس وقت کے وزیر داخلہ و دفاع ایڈمرل اے۔ آر۔ خان سے رابطہ کرنے کے بعد مسٹر الطاف گوہر اس نتیجے پر پہنچے کہ صدر ایوب کی صحت اور حالت کے بارے میں صحیح معلومات کسی کو بھی حاصل نہیں ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو صدر ایوب کی حالت کے بارے میں بتایا جانا بہت ضروری ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً ہیلتھ بلیٹن بھی جاری کئے جانے چاہئیں۔ ان کے اس اصرار پر انہیں فوری طور پر ایوان صدر لے جایا گیا جہاں ایوب خان کے ذاتی معالج نے انہیں ریڈیو پر نشر کئے جانے کی غرض سے ایک ہیلتھ بلیٹن دیا جس کے مطابق صدر ایوب کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی؛ تاہم چند دنوں کے بعد صدر ایوب نے خود مسٹر الطاف گوہر کو طلب کیا جنہوں نے دیکھا کہ صدر ایوب بستر میں لیٹے ہوئے ہیں اور اورنج جوس کا ایک گلاس ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ منظر دیکھ کر انہیں خاصا اطمینان ہو گیا؛ تاہم الطاف گوہر کا کہنا ہے کہ صدر ایوب کے ذاتی معالج اور ان کے افراد خانہ سے کی جانے والی گفتگو کے نتیجے میں جو حقیقت ان کے علم میں آئی وہ یہ تھی کہ ان دنوں جس واحد شخص کا صدر ایوب سے برابر رابطہ قائم تھا وہ کمانڈر انچیف تھے۔ صدر ایوب اور الطاف گوہر کی ملاقات پانچ سے دس فروری کے درمیان ہوئی تھی۔ کچھ دنوں بعد آدھی رات کا وقت تھا صدر کے ذاتی معالج نے الطاف گوہر کو ٹیلی فون پر بتایا کہ انہوں نے صدر ایوب اور گورنر مغربی پاکستان کے درمیان جس ملاقات کا اہتمام کیا ہے اسے منسوخ کر دیا جائے کیونکہ صدر کی طبیعت خاصی ناساز ہے جس سے الطاف گوہر نے یہ تاثر لیا کہ ان کی طبیعت دوبارہ بگڑ رہی ہے۔ اس کے بعد ان کی حالت مزید خراب ہوتی چلی گئی اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی بحالی میں خاصا طویل عرصہ درکار ہوگا۔ چنانچہ الطاف گوہر نے مسٹر فدا حسن کو ایک خط لکھا جس کے مطابق لوگ اعتراضات کرتے ہوئے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ آئینی دفعات کا نفاذ کرتے ہوئے قومی اسمبلی کے اسپیکر کو قائم مقام صدر مقرر کر دیا جائے؛ تاہم اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ الطاف گوہر نے بتایا کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ صدر ہی سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ فدا حسن سے بھی تمام رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ آخر کار وزیر

اطلاعات ایڈوائزر سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تجویز پیش کی کہ ملک کو درپیش سنگین صورتحال کے پیش نظر کابینہ کا اجلاس بلایا جائے اور اس پر تبادلہ خیال کیا جائے؛ چنانچہ کابینہ کا اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت خواجہ شہاب الدین نے کی؛ تاہم اجلاس کسی حقیقی کارروائی کے بغیر ختم ہو گیا اور سب کو بتایا گیا کہ صدر اب اچھی حالت میں ہیں۔ خواجہ شہاب الدین نے تجویز پیش کی کہ کابینہ کا اجلاس معمول کے مطابق ہر بدھ کو ہونا چاہیے مگر کسی نے بھی اسے ضروری نہیں سمجھا۔ مسٹر الطاف گوہر کا کہنا ہے کہ ان کا یہ تاثر تھا کہ کوئی پراسرار بات پس پردہ ہو رہی ہے جس کا انہیں ذاتی طور پر علم نہیں تھا؛ تاہم انہوں نے یہ نتیجہ پہلے بیان کی گئی باتوں اور اس حقیقت سے اخذ کیا کہ ان سنجیدہ امور پر پریس نوٹ جاری کرنے کی براہ راست ذمہ دار وزارتوں کو جن میں ان کی سربراہی میں کام کرنے والی وزارت اطلاعات شامل تھی بالکل مطلع نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسی نوعیت کے امور کی بنا پر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کمانڈر انچیف نے ایوان صدر کا کنٹرول مؤثر طور پر سنبھال لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسٹر فدا حسن کے علاوہ جس واحد شخص کی صدر تک رسائی تھی وہ کمانڈر انچیف تھے۔ واضح لفظوں میں مسٹر الطاف گوہر اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ صدر کے بیمار ہونے کے وقت 28 جنوری 1968ء سے 25 مارچ 1969ء کو ایوب خان کے زوال کے وقت تک یحییٰ خان صدر پر حاوی رہے۔ ایوان صدر کا حقیقی کنٹرول ان کے پاس رہا اور وہی حقیقی طور پر ملک کو چلاتے رہے۔ مسٹر الطاف گوہر نے ہم سے کہا کہ اس بات پر یقین کرنے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ نہ صرف اس مختصر وقت میں جب صدر خود کوئی حکم دینے کے قابل نہیں تھے ان کا (جنرل یحییٰ خان کا) حقیقی کنٹرول رہا بلکہ خاصی حد تک صحت یاب ہونے کے بعد صدر محض کٹھ پتلی رہے اور ان کے اقدامات یحییٰ خان کی ہدایات کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اس انتہائی صورتحال کے بارے میں مسٹر الطاف گوہر کے بیان کو ایسے دوسرے گواہوں کے بیانات سے تقویت نہیں ملتی جنہیں مسٹر الطاف گوہر ہی کی طرح صدر کی حالت اور ایوان صدر میں رونما ہونے والے واقعات کا اندازہ لگانے کے مواقع حاصل تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ خود اپنے بیان کے مطابق مسٹر الطاف گوہر اس وقت مغربی پاکستان میں نہیں تھے جب صدر بیمار پڑے اور وہ تین یا چار فروری کو راولپنڈی واپس آئے وہ اس بات کے چشم دید گواہ نہیں ہیں کہ ایوب خان کی علالت کے پہلے ہفتے میں کیا ہوا۔

مسٹر فدا حسن نے بتایا کہ صدر ایک بہت مختصر وقت کے لئے بات کرنے کے قابل

نہیں تھے اور خود انہیں (فدا حسن کو) صدر کی علالت کے تیسرے روز یعنی غالباً 2 فروری کو صدر سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کم از کم اس وقت سے صدر دل کے شدید دورے سے کمزوری کے باوجود اتنے حواس رکھتے تھے کہ ان سے کیا کہا جا رہا ہے اور وہ کیا جواب دے رہے ہیں تاہم یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے باوجود صدر کے سامنے ایسی چیزیں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا جن کی اہمیت اور ضرورت کے مطابق صدر کی مداخلت ضروری نہیں تھی۔ اس طرح سرکاری طور پر طے شدہ نظام کی بجائے بظاہر ایک ایسا نظام خود بخود بن گیا جس میں صدر سے متعلق تمام کاغذات چاہے وہ سیکرٹری کی طرف سے ہوں یا وزیر کی طرف سے یا کابینہ کی سفارشات کی صورت میں ہوں ایڈوائزر کو بھیجے جاتے تھے جو بعد میں صدر سے احکامات حاصل کرتے تھے اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ صدر سے رابطے کا مسلمہ طریق کار ہے ہمیں اس میں کوئی آئینی بے قاعدگی نظر نہیں آتی۔ بیماری سے پہلے وزرا کی براہ راست صدر تک رسائی تھی جو خود کابینہ کے اجلاس کے صدارت کرتے تھے۔ اب یہ معمول بن گیا کہ ایڈوائزر کے احکامات حاصل کریں اور ایک نوٹ لکھیں کہ اس معاملے میں صدر کا کیا فیصلہ ہے۔ بعض معاملات میں قانونی ضرورت کے تحت صدر کو فائل کے اوپر دستخط کرنے پڑتے تھے۔ مثال کے طور پر کسی آرڈیننس کے نفاذ کے لئے صدر کے دستخط ضروری تھے۔ مسٹر فدا حسن نے خود صدر کی علالت کے بعد انہیں 2 فروری کو یا اس کے قریب دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے اور انہوں نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ بلاشبہ ایک بیمار، کمزور اور صاحب فراش شخص کا ہے؛ تاہم وہ شخص پوری طرح چوکس تھا۔

ایک اور گواہ جو صدر کے قریب تھے اور جن سے ہم نے جرح کی وہ اس وقت کے وزیر قانون ایس ایم ظفر تھے۔ انہوں نے بھی دوسروں کی طرح صدر کی علالت کے بارے میں سنا اور انہیں 3 جنوری 1968ء کو صدر سے ملاقات کے لیے بلایا گیا۔ اس روز مسٹر ایس ایم ظفر نے صدر کی حالت میں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی۔ اس حقیقت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا کہ صدر کو دل کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ مسٹر ظفر نے صدر کی ناک پر نشانات دیکھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں آکسیجن دی گئی تھی؛ تاہم صدر ہشاش نظر آ رہے تھے اور نارنگی کے جوس کی چسکیاں لے رہے تھے۔

ہم نے متعدد دوسرے لوگوں سے بھی جرح کی جو اس وقت حکومت کے سیکرٹری تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر غیاث الدین، مسٹر روئیداد خان، مسٹر ریاض الدین اور مسٹر ایم ایچ صفی۔ ان میں سے کسی نے بھی ایسی تصویر کشی نہیں کی جیسی مسٹر الطاف گوہر نے کی۔ الطاف گوہر خود ہی اپنے

سابقہ بیان کی تردید کرتے ہیں جب اپنے بیان کے آخر میں وہ یہ کہتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کے بعد صدر ایوب میڈیکل چیک اپ کی غرض سے انگلینڈ گئے تھے جہاں سے واپسی کے بعد ان کی حالت قدرے بہتر ہو چکی تھی اور وہ اپنے روزمرہ معمولات کی طرف لوٹ آئے تھے؛ تاہم اب بقول الطاف گوہر کے ان کے رویے اور سوچ میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہو چکی تھی اب وہ سختی کے ساتھ اپنی بات پر اصرار نہیں کرتے تھے اور دوسرے فریق کی معقول بات سننے کے بعد اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی بھی کر لیتے تھے لیکن اب ان میں فوری اور بڑا فیصلے کرنے کی صلاحیت تقریباً مفقود ہو چکی تھی جو کبھی ان کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود الطاف گوہر نے زور دیتے ہوئے کہا کہ اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ از خود اپنے عہدے سے الگ ہوتے یا کوئی ان کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دیتا اصل سبب اور وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ کمزور اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ ہم نے جنرل یحییٰ خان سے بھی صدر ایوب کی علالت کے فوری بعد ان کے کردار اور رویے کے بارے میں پوچھا تھا جنہوں نے بتایا کہ اس کی بابت انہیں صدر ایوب کی صاحبزادی بیگم نسیم اورنگزیب نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی۔ وہ انہیں انکل کہہ کر مخاطب کرتی تھیں اور اس وقت ان کے لہجے سے کافی پریشانی عیاں تھی۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد جنرل یحییٰ خان بقول ان کے فوراً ایوان صدر پہنچے اور ان کے افراد خانہ سے مل کر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان دنوں وہ اکثر اوقات ایوان صدر جایا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے صدر ایوب کے ذاتی معالج سے بھی یقیناً گفتگو کی ہوگی؛ تاہم صرف اس ایک واقعے سے ہم جنرل یحییٰ خان کے بدنیتی پر مبنی ان عزائم کے بارے میں قطعاً کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے جس کی جانب الطاف گوہر نے اشارہ کیا ہے۔ جنرل یحییٰ خان پاکستان آرمی کے ایک انتہائی سینئر افسر تھے اور صدر ایوب کے جانشین ہونے کے ناتے ان سے بے حد قریب بھی تھے۔ پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے فیلڈ مارشل صدر ایوب خان، یحییٰ خان پر غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے جو صدر ایوب کی کمانڈر انچیف کے عہدے پر تقرری کے وقت ایک بریگیڈیئر تھے۔ چنانچہ پاک افواج کی متعدد اسکیموں اور منصوبوں کی تیاری اور ان کے عملی نفاذ کے سلسلے میں انہیں صدر ایوب کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔ پاک فوج کے ایک دیرینہ رفیق کار ہونے کے سبب یہ بات واضح ہے کہ ان کے صدر ایوب سے گھریلو تعلقات قائم تھے۔ لہٰذا ہمیں بیگم نسیم اورنگزیب کی جانب سے

انہیں ٹیلی فون کرنے کے واقعہ میں قطعاً کوئی غلط بیانی یا مبالغہ آرائی نظر نہیں آتی جس کو سننے کے فوراً بعد وہ ایوان صدر پہنچ گئے اور اس واقعہ کے بعد اکثر و بیشتر وہاں جاتے رہے۔ یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ انہوں نے صدر ایوب کے ذاتی معالج کرنل محی الدین سے بھی اس بابت گفتگو کی ہوگی؛ تاہم اس مفروضے میں ہمیں قطعاً کوئی صداقت نظر نہیں آتی کہ چونکہ ان کے معالج کا تعلق پاکستان آرمی سے تھا اس لئے انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت صدر ایوب کی طبی دیکھ بھال پر مامور کیا گیا تھا تاکہ کمانڈر انچیف کی خواہش کے عین مطابق صدر پاکستان پر مضبوط گرفت رکھی جا سکے۔ کرنل محی الدین گزشتہ چھ برسوں سے صدر ایوب خان کے ذاتی معالج چلے آ رہے تھے اور ان کی اس حیثیت سے تقرری سے قبل بھی صدر پاکستان کے ذاتی معالج کا تقرر ہمیشہ آرمی ہی سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ ہماری رائے میں اس بات کا قطعاً کوئی جواز موجود نہیں ہے کہ محض فرضی اور بے بنیاد واقعات و حقائق کی بنا پر یحییٰ خان سے اس قسم کے الزامات منسوب کر دیئے جائیں کہ فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کی علالت کے بعد اقتدار کی باگ ڈور انہوں نے خود سنبھال لی تھی۔ صدر کے صحت یاب ہونے سے پیشتر ایک سازش کا پتہ چلا اس سازش کا مقصد مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا تھا اور اسے اس وقت سے اگرتلا سازش کیس کہا جاتا ہے۔ یہ نام اگرتلا قصبے سے لیا گیا ہے جو بھارت میں سرحد کے قریب واقع ہے۔ انکوائری کے دوران معلوم ہوا کہ سازش کرنے والوں میں کچھ لوگ سویلین تھے اور کچھ فوجی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مقدمہ فوجی عدالت میں چلایا جائے یا دوسری عدالت میں کیونکہ جو لوگ ایک ادارے سے منسلک تھے ان پر دوسرا ادارہ مقدمہ نہیں چلا سکتا تھا۔ اس بات کا فیصلہ ہونے تک ملزمان کو زیر حراست رکھا گیا لیکن ان زیر حراست لوگوں کی فہرست میں ایک نام شامل نہیں تھا جو بعد میں نہایت شد و مد سے لیا گیا۔ یہ نام شیخ مجیب الرحمٰن کا تھا ان کا نام شامل نہ ہونے کی ایک توضیح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ایسا کوئی ثبوت موجود نہ تھا جس کی بنیاد پر ان کا نام شامل کیا جا سکتا بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک دستیاب ثبوت میں مجیب الرحمٰن کا نام بطور ''کوڈ نیم'' شامل تھا مگر اس وقت یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کوڈ نیم مجیب الرحمٰن کا ہے لہٰذا ایک دوسرا نوٹیفکیشن جاری ہوا جس میں مجیب الرحمٰن کا نام شامل کیا گیا تھا۔ ایک اور توضیح یہ بھی کی جاتی ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اس وقت زیر حراست تھے جب پہلا نوٹیفکیشن جاری ہوا جس کا مقصد ان لوگوں کو صرف نظر بند رکھنا تھا اس لئے دوسرا آرڈر جاری کرنا غیر ضروری تھا۔ خیال تھا کہ جب

اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ مقدمہ کس شکل میں چلایا جائے تو ملزمان کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل کرلیا جائے گا۔ اس وقت کے وزیر قانون ایس ایم ظفر کہتے ہیں کہ انہیں اس معاملے کے بارے میں اس وقت تک کچھ معلوم نہیں تھا جب تک انہوں نے نوٹیفکشن نہیں پڑھا تھا اور وہ اس وقت اس معاملے میں سامنے آئے جب یہ سوال اٹھا کہ مقدمہ عدالت میں پر چلایا جائے ان کے کہنے کے مطابق کمانڈر ان چیف اس بارے میں رائے رکھتے تھے کہ وہ مسلح افواج کے افراد پر فوجی عدالت کے علاوہ اور کہیں مقدمہ چلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ فوج سے تعلق رکھنے والے ملزمان علیحدہ علیحدہ فورسز سے تعلق رکھتے تھے مگر ان سب کے خلاف بھی ایک ہی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا تھا۔ بہرحال انتخاب یہ ہوا کہ دو مختلف عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے ایک کورٹ مارشل میں اور دوسرا سویلین ٹریبونل میں۔ یہ خدشہ موجود تھا کہ ان دونوں کے فیصلوں میں فرق ہوسکتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس سلسلے میں یہ ضروری ہو گیا کہ کمانڈرانچیف سے بار بار ملاقاتیں کی جائیں۔ جی ایچ کیو میں اجلاس کا ایک سلسلہ جاری رہا جس میں وزیر قانون، دفاع کے سیکرٹری اور صدر کے مشیر موجود ہوا کرتے تھے۔ تمام متعلقہ افراد نے تسلیم کیا ہے کہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کمانڈرانچیف کے ساتھ ان کانفرنسوں کا صرف یہی مقصد ہونے کے بارے میں ہمیں شک محسوس ہوتا ہے۔ جنرل یحیٰی خان کے مطابق جب مقدمہ شروع ہو گیا تھا تب ہی ان سے مشورے کئے جاتے تھے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس میں فوجی قانون کے اہم نکات ملوث تھے اور اس لئے ان سے مشورہ کیا جانا ضروری تھا۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ ایسے نکات زیر غور تھے تو بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کمانڈر ان چیف ہی فوجی قوانین کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ ہمارے خیال میں فوج کا متعلقہ شعبہ یعنی جج ایڈووکیٹ جنرل کا شعبہ زیادہ مناسب تھا۔ آخر میں منظور قادر کی مدد کے لئے جو سرکاری وکیل تھے گروپ کیپٹن اسلم کو مقرر کیا گیا۔ ایئرفورس میں شامل ہونے سے پہلے وہ کافی عرصے تک وکالت کر چکے تھے یہاں بھی وہ جج ایڈووکیٹ جنرل کے طور پر یا اس محکمے میں کافی عرصے تک کام کر چکے تھے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک ٹریبونل تشکیل دیا جائے جس میں جسٹس ایس اے رحمٰن جو سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج تھے اور مشرقی پاکستان کے ہائی کورٹ کے حاضر سروس جج جسٹس ایم آر خان اور جسٹس مقسوم الحکیم شامل تھے ٹریبونل نے اس کیس کی سماعت ڈھاکہ میں شروع کی۔

یحیٰی خان پر غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ

یہ ضروری ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے پس منظر پر ایک نظر ڈالی جائے۔ تقسیم سے پہلے مجیب الرحمٰن طالب علم رہنما تھا۔ اور اس نے پاکستان کے لئے مسلم لیگ کی تحریک میں حصہ لیا۔ بعد میں وہ عوامی لیگ میں ایچ ایس سہروردی کے نائب رہے۔ اس جماعت نے کئی نام بدلے شروع میں یہ عوامی مسلم لیگ تھی۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ 1966ء میں لاہور میں ایک کنونشن ہوا تھا جس میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی اس کنونشن کے کنوینر نوابزادہ نصر اللہ خان تھے کنونشن میں مجیب الرحمٰن بھی شریک تھے اور پہلی بار یہاں پر ہی مشہور چھ نکات پیش کیے گئے۔ مختلف ذرائع سے یہ بتایا گیا ہے چھ نکات کے خالق مجیب الرحمٰن نہیں تھے بلکہ یہ مغربی پاکستان کے کسی سول سرونٹ نے بنائے تھے۔ الطاف گوہر کا نام بھی لیا جاتا ہے اس معاملے کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں ہے اتنا کافی ہے کہ مشرقی پاکستان کے کچھ سول ملازمین نے اس خیال سے متفق ہونے کی بنا پر کہ مشرقی پاکستان کو اگر آزادی نہ ملے تو زیادہ سے زیادہ خود اختیاری حاصل ہو اس نظریئے کی تشکیل میں حصہ لیا ہوگا۔ اس ڈرافٹ کے الفاظ ہمارے خیال میں عوامی لیگ کے رہنما یا شیخ مجیب الرحمٰن سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ جو زبان کے معاملے میں کورے تھے بغیر کسی مغربی پاکستانی کی مدد کے نہیں تحریر کر سکتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تصور 1966ء کے کنونشن سے پہلے پیش ہوا تھا۔ کنونشن سے پہلے چھ نکات کی ایک کاپی نور الامین کو بھیجی گئی تھی جو پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنما تھے (رپورٹ لکھتے وقت پاکستان کے نائب صدر تھے) انہوں نے پارٹی کے ایک اور رکن محمود علی کو یہ ڈرافٹ دکھایا اور دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس میں علیحدگی کے بیج بوئے گئے ہیں جس کی وہ حمایت نہیں کر سکتے۔ محمود علی اور نور الامین یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کاپی انہیں ہی ملی ہے لیکن اس وقت انہیں تعجب ہوا جب کنونشن میں شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کی کاپی نکال کر دکھائی۔ سب کو حیرت ہوئی مگر زبان وہی تھی جو نور الامین کی کاپی میں تھی جو انہیں ڈھاکہ بھیجی گئی تھی۔

یہاں پر یہ بات مفید ہوگی کہ اس وقت تحریر کئے گئے چھ نکات کو یہاں دہرایا جائے۔

پوائنٹ نمبر 1

قرارداد لاہور کے مطابق آئین کو حقیقی معنوں میں ایک فیڈریشن کی ضمانت دیتے ہوئے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب مقننہ کی بالادستی اور پارلیمانی طرز حکومت پر مبنی ہونا چاہئے۔

پوائنٹ نمبر 2

وفاقی حکومت صرف دو محکمے یعنی دفاع اور امور خارجہ اپنے پاس رکھے گی' جب کہ دیگر محکمے وفاق کی تشکیل کرنے والی وحدتوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

پوائنٹ نمبر 3

(الف) ملک کے دونوں بازوؤں میں دو علیحدہ مگر باہمی طور پر تبدیل ہو جانے والی کرنسی متعارف کرائی جائے یا۔

(ب) پورے ملک کے لئے ایک ہی کرنسی رائج کی جائے؛ تاہم اس کے لیے مؤثر آئینی دفعات کی تشکیل ضروری ہے تاکہ مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو رقومات کی ترسیل روکی جاسکے۔ مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ بینکنگ ریزروز قائم اور الگ مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے۔

پوائنٹ نمبر 4

محاصل اور ٹیکسوں کی وصولی کے اختیار کو وفاق کی وحدتوں کے پاس رکھا جائے۔ مرکز کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہئے تاہم فیڈریشن وفاقی وحدتوں کے ٹیکسوں میں حصے دار ہوگی تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ ایسے وفاقی فنڈز پورے ملک سے جمع ہونے والے ٹیکسوں کے طے شدہ فیصد تناسب پر مشتمل ہوں گے۔

پوائنٹ نمبر 5

(الف) دونوں بازوؤں میں زرمبادلہ کی آمدنی کے لئے دو علیحدہ اکاؤنٹس ہونے چاہئیں اور

(ب) مشرقی پاکستان کی آمدنی کو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی آمدنی کو مغربی پاکستان کے کنٹرول میں ہونا چاہئے۔

(ج) مرکز کی زرمبادلہ کی ضروریات' دونوں بازوؤں کو مساوی طور پر یا کسی طے شدہ

تناسب کے مطابق پوری کرنا ہوں گی۔

(د) ملکی مصنوعات کی دونوں بازوؤں کے درمیان آزادانہ حمل ونقل پر کوئی ڈیوٹی عائد نہیں کی جائے گی۔

(ہ) آئین کی رو سے وفاقی وحدتوں کو یہ اختیارات حاصل ہوں گے کہ وہ غیر ممالک میں تجارتی مشن کے قیام کے ساتھ تجارتی معاہدے نیز تجارتی تعلقات قائم کر سکیں۔

پوائنٹ نمبر 6

مشرقی پاکستان کے لئے ملیشیا یا ملٹری فورس کا قیام۔ اس سوال پر کنونشن تقسیم ہو گیا۔

جو تحریک ایوب دور حکومت اور ان کے بنائے ہوئے دستور کے خلاف اعلان تاشقند کے بعد شروع ہوئی تھی اس نے صدر کی علالت کے وقت تک مقبولیت حاصل نہیں کی تھی۔

یہ تحریک کسی ایک جماعت کی تحریک نہیں تھی اور نہ ہی اس کا کوئی متفقہ رہنما تھا اور نہ ہی کوئی ایسا گروپ تھا جو اس تحریک کی رہنمائی کرتا اور کسی مخصوص منزل کی طرف لے جاتا۔ یہ درست ہے کہ کچھ اہم سیاستدان اس سے منسلک تھے جن میں خاص طور پر ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا جا سکتا ہے جنہوں نے ستمبر 1967ء میں ایک نئی پارٹی منظم کرنا شروع کر دی تھی اس کا نام پاکستان پیپلز پارٹی تھا۔

طلبا سیاستدان' کسان اور مزدور سب ہی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور ہڑتالیں اور جلوس روزمرہ کا معمول بن گئے۔ اس تحریک میں کوئی اشتراک' متفقہ مقصد نہیں تھا بس ایوب حکومت کو ختم کرنے اور اس آئین کو ختم کرنے کا مطالبہ تھا جو 1962ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس بات پر کوئی اتفاق نہیں تھا کہ انہیں ختم کرنے کے بعد ان کی جگہ کون لے گا۔ اگرچہ اس بات پر اتفاق پایا جا رہا تھا کہ نیا نظام وفاقی پارلیمانی ہونا چاہئے' کیونکہ گزشتہ عشرے کے صدارتی نظام کا خاکہ لوگوں کے ذہن میں ایک آمرانہ نظام کا تھا لہٰذا یہ تحریک اس نظام کی نفی میں تھی۔ ایک دو جماعتوں کو ہی عوام کا اعتماد حاصل نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اس طرح کا مخصوص پروگرام تھا جیسے آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کا تقسیم سے پہلے تھا۔ یہ دونوں متضاد پروگرام رکھتی تھیں مگر ایک نکتے پر متفق تھیں وہ یہ کہ برصغیر کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ ہم اس بات پر اس لیے زور دے رہے ہیں کہ جب صدر ایوب خان نے آخر کار سیاسی پارٹیوں سے مذاکرات کا فیصلہ کیا کوئی ایسا رہنما یا کئی رہنما ایک جماعت یا کئی جماعتیں اس کی اہل نہ تھیں کہ وہ مطالبات پر

مذاکرات کر سکتیں اور شرائط منواتیں۔ ہمارے خیال میں اسی وجہ سے بعد میں بلائی گئی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ناکام ہو گئی۔ اس وقت تک 12 نومبر 1968ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت بھٹو کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس تحریک کے دوران وہ سب سے اہم شخصیت بن چکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کی وہ قیادت کر رہے ہیں اور واقعی وہی قیادت کر رہے تھے۔

گول میز کانفرنس

گول میز کانفرنس آخرکار 10 مارچ 1969ء کو منعقد ہوئی۔ جو سیاسی جماعتیں اس میں شریک تھیں وہ جمہوری ایکشن کمیٹی کے تحت جمع ہوئی تھیں، مولانا عبدالحمید بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو ایسی شخصیات تھیں جنہوں نے بوجوہ اس کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

گول میز کانفرنس کے دو اجلاس ہوئے۔ اس دوران اہم بات یہ ہوئی کہ جنرل یحیٰی خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ملاقات ان کی سابق رہائش گاہ پر ہوئی اور جب یہ بات منظر عام پر آئی تو ہم سب حیران رہ گئے۔ ہم اس بات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ آرمی کمانڈر ان چیف جنرل یحیٰی خان جو سیاسی امور میں قطعاً دلچسپی نہ رکھتے تھے انہوں نے کیونکر شیخ مجیب سے ملاقات کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن واحد سیاست دان تھے جس سے یحیٰی خان نے پہلی اور آخری ملاقات کی۔ ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یحیٰی نے ایسا کیوں کیا، جبکہ شیخ مجیب سے ان کی کسی قسم کی ذاتی ہم آہنگی بھی نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ الطاف گوہر نے یحیٰی خان کو اس امر پر تیار کیا تھا اور وہ اس میٹنگ میں شریک تھے۔ الطاف گوہر کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ شیخ مجیب سے یہ یقین دہانی حاصل کر لیں کہ اگر گول میز کانفرنس ہو جاتی ہے تو وہ یحیٰی خان پر مارشل لا لگانے کے لئے دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ بلکہ انہیں یہ خوف تھا کہ اگر ان کی تجاویز نہ مانی گئیں تو نتیجتاً مارشل لا نافذ ہو جائے گا۔ مغربی پاکستان سے چھ نکات کے خلاف شدید مزاحمت کرنے کے لئے اپوزیشن کے نمائندے گول میز کانفرنس میں شریک تھے تو دوسری طرف شیخ مجیب الرحمٰن بھی اپنے چھ نکات کی بنیاد پر سیاسی تصفیے کے خواہش مند تھے۔ دونوں جانب سے شدید ردعمل کی صورت میں گول میز کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چھ نکات کا مطالبہ علیحدگی پسندی پر مبنی تھا یا نہیں اس سے قطع نظر ہم نے ان پر بہت تفصیل سے غور کیا اور

آخرکاراس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے اگر اس معاملے پر منصفانہ طرز عمل اختیار نہ کیا تو اس کا نتیجہ علیحدگی کی صورت میں برآمد ہوگا۔

جنرل یحییٰ خان، الطاف گوہر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ہونے والی ملاقات کے بارے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی اس ملاقات نے ہمیں مخمصے میں ڈال دیا جب کہ الطاف گوہر اس بات سے برابر انکار کرتے رہے کہ وہ یحییٰ، مجیب ملاقات کے دوران موجود نہیں تھے حالانکہ اس سے پہلے بھی الطاف گوہر سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی طرف سے آنے والی اس تجویز پر عملدرآمد کے لئے رجوع کیا گیا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن یحییٰ خان کو مارشل لا لگانے پر مجبور نہ کرنے کی یقین دہانی کرادیں۔ اسی تجویز کے پس منظر میں الطاف گوہر نے شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ گول میز کانفرنس کے نتیجے میں مسئلے کا سیاسی حل متوقع ہے کیونکہ یہی ایک حقیقی کوشش ہے اس لئے مارشل لا لگانے کے بارے میں تحریری یقین دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔ الطاف گوہر کو اس کام کے لئے کیوں منتخب کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے مشرقی پاکستان میں ایک عرصے تک ڈیوٹی انجام دی تھی۔ ہم اس بنا پر یہ سمجھتے رہے کہ الطاف گوہر محض شیخ مجیب الرحمٰن سے ذاتی تعلقات کی بناء پر اس کام کے لئے چنے گئے تھے اور اس سلسلے میں ان کا اپنا کوئی سیاسی کردار نہیں تھا۔

جنرل یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے ضمن میں اپنی وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ خود شیخ مجیب الرحمٰن نے ان سے عاجزانہ درخواست کی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کا یہ بھی کہنا تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا یہ خیال تھا کہ آرمی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان خاصی ہم آہنگی پائی جاتی ہے لہذا یہ ملاقات سودمند ہوگی، ممکن ہے یہ ہم آہنگی اگرتلہ کیس کے دوران پیدا ہوئی ہو کیونکہ جب شیخ مجیب الرحمٰن فوج کی تحویل میں تھے، فوج کا رویہ ان کے ساتھ اچھا تھا۔ گویا یحییٰ خان کے الفاظ کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مجیب الرحمٰن جب گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تو ان کے ذہن میں پہلے سے نرم اور لچک دار سوچ موجود تھی، ہم اس وضاحت سے مطمئن نہیں کیونکہ بعدازاں گول میز کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن کے رویئے نے ثابت کردیا تھا کہ یحییٰ خان سے ملاقات کے بعد ان کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔ اگرتلہ کیس کے حوالے سے فوج کی تحویل میں رہنے کے دوران فوج سے ان کے اچھے تعلقات کا آغاز ہوا تھا۔ لہذا ہم یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ یحییٰ خان سے ملاقات کے بعد اس رویئے میں کچھ

بہتری کے آثار پیدا ہوئے ہوں گے بلکہ دوران حراست کچھ فوجی افسران کے نرم رویئوں اور ان کی جانب سے فراہم کی جانے والی سہولتوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہوگا۔ یقیناً مجیب الرحمٰن ان سے متاثر بھی ہوں گے ہوسکتا ہے کہ ان افسران کو ڈھاکہ بلایا گیا ہو۔

ہم یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے کہ گول میز کانفرنس کے دوران اور بعد میں شیخ مجیب الرحمٰن کا رویہ، جنرل یحییٰ خان سے ملاقات کے بعد ہی تبدیل ہوا۔ جس وقت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا مجیب الرحمٰن کو یہ باور کرادیا گیا تھا کہ یہ بہت مشکل نظر آتا ہے کہ کانفرنس میں شریک تمام پارٹیاں ہر معاملے پر متفق ہوجائیں اور یہ ضروری نہیں کہ کانفرنس سے وہ مقاصد کلی طور پر حاصل ہوجائیں جن کے لئے کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ باور بھی کرادیا گیا تھا کہ فیلڈ مارشل ان کے چھ نکات میں سے اکثر پر متفق ہیں اور جن امور کے بارے میں طے ہوجائے گا انہیں آئینی تحفظ دیا جائے گا لہذا عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ بقیہ امور پر بھی بعدازاں سوچ بچار کے بعد اور سیاسی تحمل و بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایوب خان اور 1962ء کے آئین کو بیچ میں لائے بغیر ہی معاملات طے کئے جاسکتے ہیں۔ اس وقت یہ بھی باور کرایا گیا کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جسے کسی بھی قیمت پر کھونا یا گنوانا نہیں چاہئے کیونکہ اسی طرح مارشل لا کو نافذ نہ کرنے کا جواز پیدا ہوسکتا ہے۔ اس موقع پر مجیب الرحمٰن نے جواب دیا تھا کہ ''انہیں مارشل لا سے کوئی خوف یا خطرہ نہیں ہے۔'' ظاہر ہے ان کے اس ردعمل سے دو ہی نتیجے اخذ کئے جاسکتے تھے ان تمام امور کی بنا پر جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن جس راستے پر چل رہے تھے وہ درست نہیں تھا۔ ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مجیب الرحمٰن کو مارشل لا سے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی وہ بعد میں مارشل لا ہٹانے کے لئے مصر ہیں حقیقت میں ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ انہیں یقین ہو کہ بعدازاں مارشل لا کسی بھی قیمت پر نہیں ہٹایا جائے گا۔

مجیب الرحمٰن کے اس رویئے اور مسلسل ضد کی وجہ سے گول میز کانفرنس بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہی ختم ہوگئی جس میں مغربی پاکستان کے متعدد سرکردہ سیاست دان بھی شریک تھے اس کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے قوم کے نام اپنے نشری خطاب میں کہا :

''کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اگر ان (مجیب) کے تمام مطالبات مان لئے جائیں تو ملک میں امن تباہ و برباد ہوجائے گا۔ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون

سے ملک کی بات کر رہے ہیں؟ مطالبات مان لئے جائیں تو ہم پاکستان کے مسئلے کے کسی تصفیے پر ضرور پہنچ سکیں گے۔"

یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ایوب خان نے مطالبات کو مان لیا ہے اور چند ترامیم کے ساتھ ان کی منظوری کا ڈرافٹ تیار کیا جا رہا ہے لہذا صورتحال بہتر ہو رہی ہے اور حالات قابو میں آ رہے ہیں اور حالات زبانی معاملات طے ہو جانے سے ایک حتمی نتیجے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کانفرنس کے شرکاء صورتحال سے مطمئن تھے اور اس بات پر بھی فکرمند نہ تھے کہ ایوب خان نے جب معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے تو ہمیں یہاں کیوں بلایا گیا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ جن مقاصد کے لئے ہم یہاں آئے تھے وہ پورے ہو رہے ہیں۔ ان کے نزدیک تو اب معاملہ یہ تھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے جتنے بھی اقدامات طے کئے ہیں ان کے بعد جنرل یحییٰ خان ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں یا ان پر کس طرح توجہ دیتے ہیں۔

گول میز کانفرنس 13 مارچ 1969ء کو ختم ہوگئی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اس وقت تک یہ عندیہ دے چکے تھے کہ وہ ترامیم جو انہوں نے طے کی ہیں ان پر عملدرآمد کرانے کے بعد وہ عہدہ صدارت پر برقرار نہیں رہنا چاہتے۔ سیاسی پارٹیوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ آئین میں ترامیم سے متعلق اپنی اپنی تجاویز بھی روانہ کریں۔ انہیں یہ بھی باور کرا دیا گیا تھا کہ ضروری نہیں کہ یہ تجاویز تسلیم ہی کر لی جائیں۔ دو گورنروں کو تبدیل کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے گورنر جو صوبے میں ایوب خان کے نمائندے تصور کئے جاتے تھے وہاں کے عوام کے لئے ایک ناپسندیدہ شخصیت تھے جبکہ مغربی پاکستان کے گورنر ایک بے عمل گورنر قرار دیئے جا چکے تھے لہذا 17 مارچ 1969ء کو یوسف ہارون کو مغربی پاکستان کا گورنر اور 22 مارچ کو ڈاکٹر این ایم ہدیٰ کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس اقدام کے بعد کسی حد تک کشیدگی میں کمی آئی اور مسئلے کی طرف سے ذرا سا دھیان ہٹا۔ کچھ لوگوں کا اس وقت یہ یقین تھا کہ گورنروں کی تبدیلی چونکہ مختصر مدت کے لئے ہی ہوگی لہذا اس اقدام کا اصل مقصد لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مدت 25 مارچ تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

گول میز کانفرنس ختم ہوئی تو صرف دو نکات پر ایک سمجھوتہ ہی تحریر کیا گیا جس کے تحت یہ طے پا گیا کہ حکومت کا نظام وفاقی پارلیمانی ہوگا اور آئندہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہی منعقد کرائے جائیں گے۔ صدر پہلے ہی یہ کہہ چکے تھے کہ جو امور متفقہ طور پر طے پا جائیں گے

یا جن پر تصفیہ ہو جائے گا وہ انہیں تسلیم کر لیں گے۔ لہذا یہ بات آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ جمہوری ایکشن کمیٹی سے مذاکرات کے نتیجے میں کسی بھی قسم کا فیصلہ یا معاہدہ طے ہو جانے یا نہ ہونے کے پس پشت مولانا بھاشانی یا ذوالفقار علی بھٹو کوئی فریق تھے جبکہ یہ بات واضح رہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات کے سلسلے میں آئینی ترامیم کے لئے زور دے رہے تھے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے آئینی ترامیم کی یہ تجاویز جب صدر کو بھیجی گئی تھیں تو انہوں نے اس کے آئینی حل کی ضرورت پر زور بھی دیا تھا۔

وزیر قانون کو ٹیلی فون پر ہدایت

20 مارچ 1969ء کو اس وقت کے وزیر قانون نے ان آئینی ترامیم کا اعلان کیا جو حکومت کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ اس پریس کانفرنس میں اپریل کی کسی تاریخ کا بھی اعلان کیا جانا تھا جس تاریخ کو قومی اسمبلی ان ترامیم پر غور کرتی: تاہم بعض پراسرار وجوہ کی بناء پر جنہیں ہم معلوم نہیں کر سکے، ایسا نہیں ہو سکا۔ جب مذکورہ وزیر پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے تو انہیں ٹیلی فون پر ہدایت دی گئی کہ وہ اس اعلان کو مؤخر کر دیں۔

فوج کے فرائض

یہ کہا گیا کہ گول میز کانفرنس ناکام رہی۔ حالانکہ یہ کوئی کم کامیابی نہیں تھی، لیکن ہمیں حیرانی ہے کہ کیا "ناکامی" کی اصطلاح کو حقیقی معنوں میں کانفرنس پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں بتائی گئی وجوہ کی بناء پر یہ توقع رجائیت پسندانہ ہوتی کہ آر ٹی سی میں مکمل اتفاق رائے ہو جائے گا۔ بہرحال دو اہم رہنما مذاکرات میں شامل نہیں تھے۔ ان حالات میں جن دو بڑی تبدیلیوں پر اتفاق کیا گیا انہیں بمشکل غیر اہم تصور کیا جا سکتا ہے بلاشبہ اسے اچھا کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس پر پہنچنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اقوام اتفاق کلی پر نہیں چلتیں اور اختلاف رائے جمہوریت کا لازمی حصہ ہے۔ جو معاہدہ طے پایا وہ نئے باب کا آغاز کرنے کے لئے کافی تھا۔

تاہم جب امن و امان کی صورت حال بری طرح خراب ہو گئی تھی تو سول انتظامیہ کی مدد کرنے کے لئے فوج طلب کرنے کی درخواست پر غور کرنے کے ضمن میں کوئی شخص اس وقت

کے صدر کی دانش پر اعتراض نہیں کرسکتا اور انہوں نے قاعدے کے مطابق جنرل یحیٰ سے پوچھا تھا کہ آیا وہ ایسا کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ مزید آگے بڑھنے سے قبل ہمارے لئے واضح طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ "مارشل لا" کا مطلب کیا ہے۔ مارشل لا کا بذات خود حقیقی مطلب یہ ہے کہ کوئی قانون نہیں۔ تاہم روایتی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں فوجی کمانڈر کا حکم یا ارادہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ ملکی قانون پر اس کا کوئی اطلاق نہیں ہوتا اور جب کوئی بیرونی طاقت کسی ملک پر عسکری قبضہ کر لیتی ہے اس وقت اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ فوج کا کبھی بھی یہ قانونی فرض نہیں رہا اور نہ ہے کہ وہ حکومت کا متبادل بنے اور عوام پر اپنی مرضی چلائے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ جب حکومت اسے طلب کرے تو وہ اس کی درخواست پر ان مخصوص علاقوں میں اس مخصوص مدت کے لئے اس کی مدد کو پہنچے جس کی ہدایت کی گئی ہو۔ غیر منقسم ہندوستان میں یا پاکستان میں 1958ء سے قبل نافذ کئے گئے نام نہاد مارشل لا کی مثالوں میں سول حکومت کو ہٹایا نہیں گیا تھا اور بلاشبہ سول حکومت نے مارشل لا نافذ کرنے کے احکامات دیئے تھے۔ مؤخر الذکر مثال میں جب کسی مخصوص علاقے میں معمول کا کام کرنے والی مشینری ناکام ہوگئی تو فوج سول حکومت کی مدد کر کے اپنے فرائض ادا کر رہی تھی اور ان معاملات کو یا تو پہلے سوچ کر یا ماضی کے تجربے کو سامنے رکھ کر ضروری قانون سازی کے ذریعے باقاعدہ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن 1958ء میں فوج نے سول حکومت کو ہٹا کر اپنی حکمرانی قائم کی تھی۔ یہ فوج کی حکمرانی سے کم یا زیادہ کوئی بات نہیں تھی۔ بلاشبہ ایوب خان نے جنہوں نے پہلے مارشل لا کی انتظامیہ کی سربراہی کی تھی ہم سے اس بات پر اتفاق کیا کہ 1958ء اور 1965ء میں جو کچھ کیا گیا وہ فوج کی حکمرانی کے باعث ہوا۔

عام طور پر یہ غلط فہمی ہے، بالخصوص فوج میں اور ہمارے خیال میں یہ 1958ء کے بعد عام ہوئی کہ کسی علاقے میں فوج کی کمان کرنے والا فوجی افسر ہی ہمیشہ اپنے علاقے میں مارشل لا نافذ کرسکتا ہے۔ الفاظ دیگر جب بھی کوئی فوجی کمانڈر خواہ وہ کم درجے کا ہی کیوں نہ ہو یہ محسوس کرے کہ اس کے زیر کمان علاقے میں معمول کی مشینری اپنا کام نہیں کرسکتی تو وہ بعض ایسے قوانین کے ذریعے جو ماورائے آئین ہوں اختیار رکھتا ہے، یہ حق اور جواز رکھتا ہے کہ مارشل لا نافذ کردے۔ جنرل یحیٰ نے اپنی شہادت میں پرزور انداز میں اس کی حمایت کی۔ ایک کے بعد ایک مارشل لا کے نفاذ نے غیر فوجیوں کے ذہن میں بھی مارشل لا کی تعریف کو دھندلا دیا ہے۔ عاصمہ جیلانی کے مقدمے میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے میں، جسے سراہا گیا ہے، بمکس سند اور

بہت تفصیل کے ساتھ اس سوال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہم یہاں اس کے بعض حصوں کا حوالہ دے رہے ہیں۔

''موجودہ زمانے میں انگلستان میں مارشل لا کے مختلف مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ اصل معنی کے اعتبار سے اب بہرکیف یہ اندرون اور بیرون ملک موجود افواج میں نظم وضبط پیدا کرنے سے متعلق قانون کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے۔ اس معنی میں مارشل لا کی اس شاخ کو ''فوج کا قانون'' کہا جاتا ہے اور زمانہ امن میں اس کا مختلف صورتوں میں نفاذ ہوتا ہے مثلاً آرمی ایکٹ، نیوی ایکٹ اور ائیر فورس ایکٹ۔ قوانین بنانے والے سول ادارے ان صورتوں کی منظوری دیتے ہیں اور یہ اس سے اختیار اخذ کرتا ہے۔ بین الاقوامی قوانین کے مطابق مارشل لا کا مطلب زمانہ امن میں دشمن کے علاقے میں JUS BELLI کے حصے کے طور پر ایک عسکری کمانڈر کے اختیارات ہوتا ہے۔ اس معنی میں اس کی تعریف وہی ہے جو ڈیوک آف ویلنگٹن نے ایک مرتبہ ایوان امراء میں کی تھی "فوج کی کمان کرنے والے جرنیل کے ارادے سے نہ تو کم اور نہ ہی زیادہ" (بہ حوالہ Hansard,Vol.Col.880) کیا اس شکل میں ملک میں مارشل لا کا نفاذ کیا جاسکتا ہے؟ ہالسبری کے قوانین برائے انگلستان، جلد نمبر سات، اشاعت سوم، صفحہ نمبر 260 کے مطابق انگلستان میں آج صورتحال یہ ہے "زمانہ امن میں تاج برطانیہ سویلین افراد پر مارشل لا کے تحت مقدمہ چلانے کے احکامات جاری نہیں کرسکتا، تا آن کہ جنگ کی صورتحال پیدا نہ ہو جائے یا شدید فسادات نہ پھوٹ پڑیں، یا بغاوت جنگ کی صورت اختیار نہ کرے۔ ایسی صورتوں میں تاج برطانیہ اور اس کے حکام اتنی تعداد میں افواج کو استعمال کرسکتے ہیں جو امن وامان بحال کرنے کے لئے ضروری ہو اور فوج کے بعض اوقات اس طرح استعمال کو مارشل لا کہا جاتا ہے۔ جب حقیقی جنگ کی صورتحال پیدا ہو جائے تو سول عدالتوں کو فوجی حکام کے اقدام کے سوال کو زیر غور لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا لیکن اگر سول عدالتوں کے دائرہ اختیار کی بات ہو تو اس کا فیصلہ انہیں کرنا ہوگا کہ کیا جنگ کی صورتحال پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے مارشل لا کے نفاذ کا جواز تھا۔ فوجی حکام کو اختیار تفویض کئے گئے اور سول عدالتوں کے پاس جو اختیارات تھے وہ حالت جنگ ختم ہونے کے بعد بحال تصور کئے جائیں گے اور قانون تحفظ (Act of Indemnity) کی غیر موجودگی میں سول عدالتیں حالت جنگ میں کئے گئے کسی بھی اقدام کے قانونی جواز کو زیر بحث لاسکتی ہیں۔ اگر قانون تحفظ معمول کی اصطلاح میں موجود ہو تب بھی

بدنیتی پر مبنی قوانین کو تحفظ نہیں دیا جا سکے گا۔'' تاہم فرانس کے آئین میں ''محاصرے کی حالت کے اعلان'' کے بارے میں طریقہ کار درج ہے جس کے تحت مجاز شخص سول حکومت کے مفاد میں ملک کے کسی بھی حصے میں فتنہ وفساد اور بغاوت کی صورت میں امن وامان کی بحالی کے لئے فوج کو پولیس کے اختیارات دے سکتا ہے۔ محاصرے کی حالت کے سرکاری اعلان پر آئین میں دیئے گئے تحفظات معطل ہو جائیں گے اور متاثرہ علاقے کی حکومت عارضی طور پر فوج کے کنٹرول میں دے دی جائے گی۔ اس اعتبار سے مارشل لا کا نفاذ دراصل معمول کے قوانین کی معطلی اور ملک کے کسی حصے یا پورے ملک پر فوج کی عارضی حکومت ہوتا ہے۔ اے وی ڈائسی کے مطابق (بہ حوالہ آئینی قوانین صفحہ نمبر 267) ''انگلستان کے قوانین میں یہ قطعاً نہیں ہے'' اور ''محاصرے کی حالت کے سرکاری اعلان'' کے ضمن میں فرانس کے مقابلے میں یہ اس کے مساوی نہیں ہے۔ تاہم انگلستان کے قوانین کے تحت فتنہ وفساد، بغاوت اور سرکشی پر قابو پانے کے لئے مسلح افواج کی بھرتی کے امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس معنی میں ڈائسی کے مطابق مارشل لا محض ''شاہ اور اس کے ملازمین کو عام قانون کے مطابق حاصل حق کا نام ہے جو ملک پر حملے، فتنہ وفساد یا عام طور پر قانون کے خلاف کسی بھی مزاحمت کے ضمن میں اسے افواج کے ضمن میں حاصل ہے۔'' ان کے خیال میں باضابطہ حکومت کی موجودگی کے لئے یہ حق ضروری ہے اور ''انگلستان کے قانون کے مطابق اس کی فراخ دلانہ طریقے سے توثیق کی گئی ہے'' تاہم ان کے مطابق اس حق کا ''مسلح افواج کی موجودگی سے کوئی خصوصی تعلق نہیں ہے'' لیکن اس کا امن وامان کی حالت میں بگاڑ کو درست کرنے کے ضمن میں شاہ کے حق سے تعلق ہے اور وہ قانونی فرائض کے معاملے کے طور پر فوج یا سویلین کو مدد کے لئے طلب کر سکتے ہیں۔ جہاں تک انگلستان کا تعلق ہے وہاں سترہویں صدی کی خانہ جنگی کے بعد کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ اس قسم کا مارشل لا نافذ کیا جاتا لیکن اس شکل میں گذشتہ صدی میں جنوبی افریقہ، جنوبی آئرلینڈ، فلسطین اور برطانوی ہند کے حصے میں مارشل لا نافذ کیا گیا تھا۔ تاہم ان کیسز میں بھی فوج کو طاقت کے استعمال کی جو آزادی دی گئی تھی وہ ہر کیس کے حالات کے لحاظ سے مختلف تھی۔ امن وامان کی بحالی اور مزاحمتی قوت کے طور پر فرائض کی ادائیگی ہمیشہ مداخلت کے تجزیے کے لئے ضروری رہی ہے۔ استثنائی حالات میں فوج حالات کے تحت یہ بھی ضروری محسوس کرتی ہے کہ جارح اور سویلین افراد پر مقدمہ چلانے کے لئے ملٹری ٹریبونل قائم کرے۔ یہ ٹریبونل موت کی سزا بھی دے سکتے ہیں لیکن ہر کیس میں کئے

گئے اقدام کا تعین ضروری تجزیے کے ذریعے کیا جائے گا۔ ایسے ٹریبونل نہ تو عدالتی ادارے ہوتے ہیں اور نہ ہی بری فوج، بحری فوج اور فضائیہ کے قانون کے تحت کورٹ مارشل کر سکتے ہیں۔ البتہ روایتی طور پر یہ ایسے ڈھانچے ہوتے ہیں جو عسکری کمانڈر کو اس کی جانب سے کئے جانے والے ایکشن کے ضمن میں مشورے دیتے ہیں۔

برطانوی عدالتوں نے بھی فیصلہ دیا کہ یہ مارشل لا کے تحت جاری کیا جانے والا اعلامیہ نہیں تھا جس میں طاقت کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہو مگر بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ایسی صورتحال پیدا کر دی جس میں اس قسم کے طاقت کا استعمال بھی جائز ہو گیا تھا۔ اسٹون نے اپنے تبصروں میں (جلد اول صفحہ 381) اس نوعیت کے مارشل لا کو عارضی نوعیت کے اقدامات قرار دیا جو ریاست کے عدم استحکام کی وجہ سے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں ایسے مارشل لا کے جو ایک فعال ادارے کے طور پر امن وامان کی داخلی صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے لگایا گیا ہو یا پھر اس مارشل لا کے درمیان جو ایک فوجی حکومت کے نظام کے طور پر دشمن کے علاقے پر قبضے یا حملے کے لئے لگایا گیا ہو تفریق کرنی ہوگی۔ پہلی قسم کے مارشل لا کا حکم عموماً ایک سول حکومت کے تحت قائم اتھارٹی کے ذریعے جاری کیا جاتا ہے۔ اس حکم کے ذریعے اسی صورتحال میں سول حکومت کو ہٹایا جا سکتا ہے جب سول عدالتوں اور دیگر سول محکموں کے لئے کام جاری رکھنا ناممکن ہو جائے۔ مارشل لا ازخود اس بات کو مقدم نہیں رکھتا کہ اسے سول عدالتیں بند کرنے یا سول حکومت کے اختیارات سلب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مارشل لا کے تحت فوج خاموشی سے ان بلدیاتی حدود میں کارروائی کرتی ہے جہاں عدالتوں کے لئے کام کرنا ناممکن ہو گیا ہو۔ دوسری جانب یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ جن علاقوں میں سول عدالتیں کام کر رہی ہیں اور جہاں سول حکام اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں وہاں مارشل لا کے نفاذ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس صورتحال میں مارشل لا کے نفاذ کا جواز عدلیہ کے سامنے ہمیشہ ایک سوالیہ نشان کی صورت میں موجود رہتا ہے۔ عدالتوں میں ہمیشہ دعوے کئے جاتے ہیں اور یہ عدالتیں اپنے اس اظہار کا حق ہمیشہ استعمال کرتی ہیں کہ کیا عام قانون کے محدود دائرہ کار میں مارشل لا کا نفاذ درست تھا یا نہیں؟ اختیارات کے اس جائزے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مارشل لا کا نفاذ ازخود سول لا، یا سول اتھارٹی اور مارشل لا، مسلح افواج کے کمانڈر کو یقینی طور پر اس بات کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ ملک کے بنیادی قانون کو ختم

کرسکیں۔ یہ بات بظاہر بعید از عقل نظر آتی ہے کہ کوئی حکومت بیرونی حملے یا داخلی انتشار سے بچاؤ کی خاطر خود مارشل لا کے نفاذ کو دعوت دے۔ اگر اس بات کو درست تسلیم کرلیا جائے کہ مارشل لا کے حکم کے ذریعے قانونی نظام مکمل طور پر تباہ ہوجاتا ہے تو اس صورت میں مسلح افواج بدامنی سے نمٹنے میں ریاست کی کوئی مدد نہیں کرسکتیں بلکہ پورے قانونی نظام کو درہم برہم کرنے سے بدامنی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اسی لئے میں لائق اٹارنی جنرل کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ مارشل لا کے حکم کے ذریعے ضرورت کے تحت مسلح افواج کے کمانڈر کو اس آئین کے خاتمے کا اختیار مل جاتا ہے جس کے تحفظ کا خود انہوں نے حلف اٹھایا ہوا ہے۔

ذمہ داری قبول کرنے سے گریز

اب واقعات کی جانب واپس لوٹتے ہیں۔ صدر ایوب خان کے خلاف تحقیقات پر جنرل یحییٰ خان نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا اس پر ہم سب کو شدید حیرت ہوئی تھی۔ ان کے اپنے خیال کے مطابق ایک جزوی مارشل لا کا اس وقت تک کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مسائل پیدا کرنے والے افراد کو مارشل لا کے تحت فوری طور پر ان کے علاقوں سے باہر نہیں نکال دیا جاتا۔ مارشل لا کے دائرہ اختیار میں رفتہ رفتہ اس وقت تک اضافہ کیا جانا چاہئے جب تک پورا ملک مارشل لا کے تحت نہیں آجاتا۔ دوسرے الفاظ میں مارشل لا کا نفاذ پورے ملک پر ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے اس بات کا یہ مطلب نکالا یہ سول حکومت کی امداد سے صریحاً انکار تھا۔ ایک اور گواہ نے انکشاف کیا کہ فوج نے اس وقت تک کوئی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کیا جب تک صورتحال حکومت کے قابو سے باہر نہ ہوجائے۔ گواہوں نے جنرل یحییٰ خان کے حوالے سے کہا ہے کہ جب تک انہیں مکمل طور پر نظم ونسق سنبھالنے کو نہیں کہا جائے گا وہ اپنا سامان باندھ کر پشاور چلے جائیں گے اور یہ بات حکومت پر چھوڑ دیں گے کہ وہ جس طرح بہتر سمجھے نظم و نسق چلائے۔ ہم اس بات پر شدید حیرت اور افسوس کا اظہار ہی کرسکتے ہیں کہ مسلح افواج کے کمانڈر انچیف جن کے افسروں اور جوانوں نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا ہوا ہے ایسا رویہ بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ یہ فوج کا اولین فرض تھا کہ وہ قانونی طور پر قائم حکومت کی مدد کے لئے آتی۔ اس کی بجائے اس نے حکومت کی کمزوریوں سے ایسے وقت میں ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جب وہ خود ان عوام کی خواہشات کے مدنظر جو پاکستان کی سیاسی قوت ہیں' آئینی

طریقوں سے سیاسی منظر سے ہٹنے کی کوشش کررہی تھی۔

اس کے بعد 20 اور 25 مارچ 1969ء کے درمیان ایسا کیا ہوا کہ ملک کی باگ دوڑ ایک فوجی کمانڈر کے حوالے کرنے کی ضرورت پڑگئی؟ اسی صورتحال کا تقابل 1958ء کی صورتحال سے نہیں کیا جاسکتا۔ 1958 میں درست یا غلط وجوہات کی بناء پر فیلڈ مارشل ایوب خان نے برسراقتدار حکومت کا تختہ اس وقت کے صدر کی آڑ لے کر الٹ دیا تھا۔ یہ صدر بھی نئی حکومت میں تین ہفتے سے بھی کم وقت تک شامل رہے۔ 1969ء میں آخرکار ایک سول حکومت نے کمانڈر انچیف کو دعوت دی کہ وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ فیلڈ مارشل نے 1969ء میں جنرل یحییٰ خان کو جو خط لکھا تھا اس میں انہوں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنی ''آئینی ذمہ داریاں'' پوری کریں۔ ان ہی جذبات کا اعادہ فیلڈ مارشل نے اپنے الوداعی نشریاتی خطاب میں بھی کیا تھا۔ اپنے خطاب میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ملک کا تحفظ اس بات کا متقاضی ہے کہ دفاعی افواج کی راہ میں کسی قسم کی مشکلات کھڑی نہ کی جائیں اور انہیں ان کے قانونی فرائض آزادانہ طور پر استعمال کرنے دیئے جائیں۔ اگر ان کے خطاب کے صرف اسی اقتباس کا جائزہ لیا جائے تو اس سے باآسانی یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے پہنچنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایوب خان کے پورے خطاب میں یہ بات ناقابل فہم تھی۔ اس خطاب کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت اپنا کام مزید جاری نہیں رکھ سکتی۔ اپنے خطاب میں فیلڈ مارشل نے اس فیصلے کا بھی اعلان کیا کہ وہ صدر کا عہدہ بھی چھوڑ رہے ہیں۔ تاہم یہ حوالہ ان آئینی فرائض کے لئے تھا جن کے تحت فوج اسی وقت کام کررہی تھی۔ جنرل یحییٰ خان نے عہدے سے ہٹنے کے بعد اسی نکتے پر اسی قانونی پوزیشن کے حوالے سے ہمارے سامنے اپنی بھرپور وکالت کی تھی۔ ہم نے اس مسئلے پر ان سے کافی سوالات کئے تھے جس پر انہوں نے کہا تھا کہ میں کوئی وکیل نہیں ہوں مگر مجھے فوج میں ابتدا ہی سے اس بات کی تربیت دی گئی کہ ملک کا دفاع ایک سپاہی کا مذہبی فریضہ ہے یہ بیان ایک ایسے شخص کے ذریعے سامنے آیا جس نے مختلف مواقع پر خود کو قانونی ماہر ظاہر کیا تھا۔

ایوب خان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا: جنرل یحییٰ

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ گول میز کانفرنس کے اس وقت کے حالات اور توقعات کے مطابق مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں آئینی ترمیم کے کام کا آغاز ہوا بلکہ اس بات کا اعلان عام بھی کیا گیا کہ تمام اقدامات قانونی اور آئینی دائرہ کار کے تحت کئے جائیں گے۔ ملک کو داخلی انتشار سے باہر نکالنے کے لئے صدر بن گئے جو پارلیمنٹری طرز حکومت میں ہوتا ہے یعنی آئینی سربراہ۔ 1962ء کے آئین کے تحت اگر وہ فوری طور پر حکومت چھوڑ دیتے اور انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا تو انہیں اقتدار سپیکر کے سپرد کرنا چاہیے تھا جو نئے صدر کے انتخاب کے لئے ضروری اقدامات کر سکتے تھے۔ اس صورت حال میں اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ صدر نے آئین میں ترمیم کا راستہ کیوں اختیار نہیں کیا۔ اس سلسلے میں خود آئین میں بھی واضح صراحت موجود تھی۔ یہ بات بھی سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایوب خان نے 25 تاریخ کو اچانک عنان حکومت جنرل یحییٰ خان کے سپرد کیوں کر دی تھی؟ ہمیں جنرل یحییٰ خان کے رویئے سے اپنے اس سوال کا بنیادی جواب ملتا ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ سول حکومت کی مدد سے اقتدار قبول نہیں کریں گے۔ فیلڈ مارشل نے بھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ سیاست دان حکومت کو جمہوری انداز میں کامیابی سے چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جنرل یحییٰ کی رائے بھی اس سلسلے میں ان سے مختلف نہیں تھی اور اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے ہمارے سامنے اپنی گواہی میں اس بات کا اظہار بھی کیا۔ وہ اقتدار کی خواہش کی تکمیل کے لئے کسی صورت میں اپنے مؤقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ اس موقع پر بھی جو بات سرگوشیوں تک محدود تھی وہ کھل کر سامنے آ گئی۔ وہ بات جوان کا نام لے کر کہی گئی یہ تھی کہ فیلڈ مارشل کے دور حکومت میں انہوں نے اور ان کے خاندان کے افراد نے اپنی سرکاری پوزیشن کا سہارا لیتے ہوئے کافی مالی مفادات حاصل کئے۔ فیلڈ مارشل کی جانب سے جنرل کو اقتدار کی منتقلی کے فیصلے کے پس منظر میں جزوی طور پر ان کے اس تاثر کا بھی بڑا عمل دخل تھا کہ انہیں اقتدار خود سیاست دانوں کے حوالے کرنا پڑے گا۔ ان کے اس خیال کی تصدیق جنرل یحییٰ کی جانب سے اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک اخبار نویس کے سوال کے جواب میں دیئے جانے والے ایک بیان سے بھی ہوئی۔ جنرل یحییٰ نے اپنے بیان میں کہا تھا "میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا۔"

یحییٰ خان نے مارشل لا نافذ کر دیا

مارچ 1969ء کی شام جنرل آغا محمد یحییٰ خان کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور پورے ملک کا اقتدار حاصل کر لیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر لیا۔ انہوں نے ابتدا میں صدر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا مگر 4 اپریل 1969ء کو انہوں نے یہ عہدہ بھی سنبھال لیا۔

جنرل نے جن مقاصد کے تحت حکومت سنبھالی تھی ان میں یہ مقصد شامل نہیں تھا کہ وہ خود ہمیشہ اقتدار میں رہیں گے یا ان کے عہد حکومت میں کوئی نیا نظام قائم ہوگا۔ یہ بات 7 اکتوبر 1958ء کو اقتدار سنبھالنے والے فیلڈ مارشل (جو اس وقت جنرل تھے) کے عزائم اور مقاصد سے بالکل مختلف تھی۔ اس وقت کے صدر نے اپنے خطاب میں مارشل لا کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ سیاست دان ناکام ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس اقدام کو جمہوریت کی بحالی نہیں قرار دیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ یہ ایک ایسے نئے نظام کا آغاز ہے جو ملک کو بچانے کا واحد ذریعہ ہے۔

جنرل یحییٰ خان نے 26 مارچ 1969ء کو اپنے خطاب میں کہا کہ مارشل لا کے نفاذ کا میرا واحد مقصد عوام کی زندگی، آزادی اور مال کا تحفظ اور ملک میں انتظامیہ کو دوبارہ رواں دواں کرنا ہے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میرا اولین اور اہم ترین کام امن کی بحالی اور اس بات کی یقین دہانی ہے کہ انتظامیہ اپنے روزمرہ کے معمولات عوام کی تسلی کے مطابق شروع کر دے۔ ہم نے انتظامی خرابی اور بدامنی کا کافی تجربہ کر لیا ہے۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ ایسی خرابی اور بدامنی کبھی دوبارہ پیدا نہ ہو۔ انتظامیہ کے ہر فرد کو میری اس تنبیہ کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔ میرے ہم وطنو! میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں کہ ایک آئینی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ایک معقول اور

تعمیری سیاسی زندگی اور حق رائے دہی اور منصفانہ طریقے سے منتخب نمائندوں کے درمیان اختیارات کی بہ آسانی منتقلی کے لئے صاف شفاف اور ایماندار انتظامیہ بہت ضروری ہے۔ ان منتخب نمائندوں کا ہدف ایک قابل عمل آئین کا حصول ہوگا اور ان تمام سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا حل بھی جو عوام کے لئے ذہنی پریشانی کے باعث ہیں۔ اس لئے جنرل یحییٰ کی حیثیت محض قائم مقام کی تھی جو ملک میں لاء اینڈ آرڈر بحال کرے اور جلد از جلد اقتدار منتخب شدہ نمائندوں کو سونپ دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس دو ہی راستے تھے، یا تو وہ خود ایک نئے آئین کا اعلان کرتے یا آئین کی تشکیل کے لئے کوئی انتظامی مشنری قائم کرتے۔

درحقیقت لاء اینڈ آرڈر حیرت انگیز تیزی سے بحال ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ مارشل لا نظام کی سخت سزاؤں کی بدولت یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایک بڑے ہجوم کو ایک وقت میں اکٹھا کرلیا جائے اور سیاسی لیڈروں یا مظاہروں کے ذریعے لوگوں کو جلوس اور ہڑتال کے لئے جمع کیا جاسکے۔ اس وقت لوگوں کے جذبات کا رخ صرف اس سمت میں تھا کہ ان کی تحریک اور جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ایوب خان کا اقتدار اور آئین اس کے نتیجے میں ختم ہوگئے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ لوگ یقین رکھتے تھے کہ اگرچہ مارشل لا بذات خود کوئی پسندیدہ چیز نہیں لیکن ملکی سلامتی اور آئندہ آئینی استحکام کے لئے یہ قدم ناگزیر تھا۔ 1958ء کے تجربے کے نتائج نے لوگوں میں ایک ایسے اندھے اعتماد کو جنم دیا جو ایک بڑے بحران کی کوکھ سے پیدا ہوا۔ مارشل لا کو تمام خرابیوں کے خاتمے کا حتمی علاج سمجھ لیا گیا۔ جن لوگوں نے زیادہ سنجیدگی سے اس بحران کی سنگینی کو محسوس کیا انہوں نے اسے فوج پر اندھا دھند بھروسے کا نتیجہ قرار دیا جس نے آگے جاکر ڈکٹیٹرشپ کی راہ اختیار کرلی۔ امن وامان کی صورتحال اتنی تیزی سے خراب ہوئی کہ جنرل یحییٰ کا اقدام متوقع اور ناگزیر سمجھ لیا گیا۔ ملک کے بدتر حالات نے جنرل یحییٰ کے حق میں راہ ہموار کردی اور ایک ایسا منظرنامہ تیار ہوگیا جس کے لئے لوگ ذہنی طور پر تیار تھے۔ یہاں تک کہ نومبر 1969ء آگیا اور جنرل یحییٰ نے اگلے لائحہ عمل کا اعلان کردیا۔

اسی دوران انہوں نے تمام اہم سیاسی شخصیات سے ملاقات کی تاکہ الیکشن سے پہلے آئین میں تمام ضروری ترامیم کی جاسکیں۔ اس اقدام کی توجیہہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ دراصل یہی وہ معاملہ ہے جس پر مکمل اتفاق رائے اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ باقی کام عوام پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ الیکشن کے بعد کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ 5

اکتوبر 1970ء کو انتخابات منعقد ہوں گے اور یکم جنوری 1970ء سے سیاسی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت ہوگی۔ 31 مارچ 1970ء تک تمام قانونی لائحہ عمل تیار کرلیا گیا اور انتخابی عمل کے لئے مغربی پاکستان کے ون یونٹ کو توڑ دیا گیا۔ دیگر بنیادی معاملات جن کے بارے میں کہا گیا کہ اتفاق رائے سے انجام دیئے جائیں گے، ان میں نئے آئین کے باب میں وضاحت کی گئی کہ یہ وفاقی پارلیمانی طرز کا ہوگا اور انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے۔ بنیادی انسانی حقوق کے نفاذ کو عدالتوں کی مدد سے یقینی بنایا جائے گا۔ عدلیہ کی آزادی اور اس کے بحیثیت ''آئین کے نگراں'' کردار کی حفاظت کی جائے گی۔ آئین کی اساس اسلامی نظام ہوگا جو نظریہ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اگر آئینی نظام کی جلد بحالی اور عوامی نمائندوں کو اقتدار سونپنا ہی اصل مقصد تھا تو یہ ناقابل فہم ہے کہ جنرل یحییٰ کے اقتدار میں آنے کے اٹھارہ ماہ بعد یعنی 5 اکتوبر 1970ء کو الیکشن کا اعلان کیا گیا۔ حالانکہ امن وامان کی صورتحال بہت جلد بحال ہوگئی تھی۔ یہ درست ہے کہ آئینی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے انہوں نے سیاسی راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جنرل یحییٰ نے ایوب دور کے راہنما اصولوں سے ہی استفادہ کیا اور انہی خطوط پر کام کیا جو بعد میں نااتفاقی کا سبب بنے۔ اس عرصے میں سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی سیاسی جماعتوں کو منظم کرنے کی، سیاسی مہم کی اجازت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ان مذاکرات سے کون سی کامیابی متوقع تھی؟ واحد نکتہ، جس پر گول میز کانفرنس میں اتفاق کیا گیا، ون یونٹ کا خاتمہ تھا۔

28 نومبر 1969ء کی نشری تقریر میں جنرل نے تین متبادل حل پیش کئے:

(I) آئینی کنونشن بلایا جائے۔

(II) 1956ء کے آئین پر نظرثانی کی جائے اور

(III) آئینی اصلاحات کے بارے میں ریفرنڈم کیا جائے۔

پہلا راستہ انہوں نے خود ہی مسترد کردیا کیونکہ بقول ان کے انتخابات کے انتظامات ہوچکے تھے ان میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کا بطور خاص ذکر کیا گیا جس کے نتیجے میں منتقلی اقتدار کا عمل غیر ضروری تاخیر کا شکار ہوگیا۔

1956ء کا آئین مسترد کردیا گیا کیونکہ وہ ون یونٹ کی شرط اس میں تھی جو ان کے

مطابق مزید قابل قبول نہیں تھا۔ یہ ایک اہم تبدیلی تھی جو اسمبلی سے باہر عمل میں لائی گئی۔ یہ واضح ہے کہ اگر ون یونٹ کی مخالفت میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی تو 1956ء کے آئین کے مطابق منتخب کردہ اسمبلی آئین میں ترمیم کے ذریعے ون یونٹ کو توڑ سکتی تھی۔

مسئلے کا تیسرا حل یعنی ریفرنڈم، جنرل کے مطابق اسی وقت ممکن ہوتا جب معاملات نہایت سادہ اور سہل ہوتے اور ان کا جواب ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں بآسانی دیا جا سکتا'' آئین'' جیسے اہم مسئلے کے لئے یقیناً یہ کوئی درست حل نہیں۔ بعد ازاں دیکھا گیا کہ لیگل فریم ورک آرڈر بھی آئین میں شامل ہوگا اور نافذ کر دیا گیا ماسوا ایک انتہائی حساس شق کے، جو صوبوں اور مرکز میں اختیارات کی تقسیم سے متعلق تھی۔

ون یونٹ کا اعلان اور الیکشن کا اعلان

یہ بھی واضح نہیں کہ 29 نومبر 1969ء کو یہ اعلان کیوں کیا گیا کہ یکم جنوری 1970ء سے قبل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اس ٹائم ٹیبل کے مطابق 30 مارچ 1970ء کو دو حکم نامے جاری کئے گئے پہلا ''مغربی پاکستان صوبے'' کی تنسیخ کا حکم اور دوسرا قانونی دائرہ کار کا حکم۔ پہلے حکم کے مطابق چار صوبے ون یونٹ سے علیحدہ کئے جانے تھے۔ دوسرے کے مطابق پاکستان کی قومی اسمبلی کو آئین تشکیل دینا تھا اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کروانے تھے۔ لیگل فریم ورک معاہدے کے تحت آئین بناتے وقت قومی اسمبلی کو پانچ بنیادی اصول مدنظر رکھنے تھے۔ دراصل یہ وہی بنیادی اصول تھے جو گول میز کانفرنس کے نتیجے میں ٹھوس شکل اختیار کر کے معاہدے تک پہنچ چکے تھے اور جن کے بارے میں جنرل یحییٰ خود یہ بیان دے چکے تھے کہ ان معاملات میں مکمل اتفاق رائے اور ہم آہنگی موجود ہے۔ دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ مکمل اتفاق رائے سے طے کیا گیا ہے وہ مغربی پاکستان صوبے کی تحلیل یا خاتمے سے متعلق تھا۔ لیگل فریم ورک آرڈر کی سب سے اہم چیز وہ طریقہ کار تھا جس کے تحت مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی جانی تھی۔ اس آرڈر کی متعلقہ شق (4) 20 کے مطابق ''ہر قسم کے اختیارات بشمول قانونی' انتظامی اور مالی امور، اس طرح وفاقی حکومت اور صوبوں میں تقسیم کئے جائیں کہ صوبوں کو ممکنہ حد تک خودمختاری مل جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وفاقی حکومت کے قانونی، انتظامی اور مالی

معاملات کے اختیارات اس حد تک ہونے چاہئیں کہ وہ اپنے داخلی اور بیرونی معاملات خوش اسلوبی سے چلا سکے اور ساتھ ہی آزادی کا تحفظ اور ملکی وحدت کو بھی برقرار اور قائم رکھ سکے۔

چھ نکاتی پروگرام کی نوعیت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لیگل فریم ورک آرڈر میں صوبوں کی خودمختاری کی حدود کا واضح تعین کیا گیا تھا؟ یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طرف چھ نکاتی مطالبہ تھا جس کی وجہ سے گول میز کانفرنس مذاکرات ختم ہو گئے دوسری طرف وہ اصول جس کا ذکر لیگل فریم ورک میں کیا گیا جس کے مطابق آئین میں پاکستان کی وحدت اور سلامتی کا تحفظ یقینی بنایا جائے گا۔ ان کے پاس مرکز اور صوبوں میں اختیارات کی تقسیم سے متعلق تین حوالے تھے۔ ایک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء؛ 1956ء کا آئین اور 1962ء کا آئین۔ ان میں سے دوسرا آئین اسمبلی کا بنایا گیا آئین تھا جو بہت کم مدت نافذ العمل رہا اور 1958ء میں ختم ہو گیا (یعنی پہلے الیکشن سے قبل)۔ اس بات میں وزن ہے کہ معاملے کی حساس نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیگل فریم ورک آرڈر کے ذریعے آئین میں صوبائی خودمختاری کا تعین کر لیا جاتا البتہ آئین میں صوبائی خودمختاری میں اضافے یا کمی کے لئے ترمیم کا کام منتخب اسمبلی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایک عرصے بعد یعنی 1971ء میں جنرل یحییٰ کے مطابق ''جو لوگ قومی سلامتی اور وحدت کے بارے میں فکرمند تھے ان کے لئے لیگل فریم ورک آرڈر کی ضمانت کافی تھی۔'' غور طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ تسلی بخش ضمانت، الیکشن کے بعد اتحاد و اتفاق کا عمل جاری رکھ سکی؟ جس مہم کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ چھ نکات سے متعلق ریفرنڈم ہے یا وہ تسلی بخش اختیارات جو آئین کا نفاذ ممکن بناتے اتنے موثر تھے کہ خودمختار صوبوں کے ساتھ ایک مضبوط اور بااختیار مرکز کی تشکیل کر پاتے؟

قانونی ڈھانچے کے دو اور اہم اجزاء تھے۔ ان میں سے ایک تو کسی مخصوص اکثریت کی ضرورت کے لئے آئین میں کسی مسودے کی بطور قانون منظوری کا استثنیٰ موجود نہیں تھا۔ مثال کے طور پر اس بات پر اصرار کرنا کہ آئین کی منظوری کے لئے ایک معینہ شرح یعنی ہر علاقے کا پچیس فی صد ووٹ یا وفاقی اکائی ضروری قرار دی جائے تاکہ ایک غالب اکثریت سے فیصلہ ہو۔ جب جنرل یحییٰ خان ہمارے روبرو حاضر ہوئے تو ہم نے ان سے اس ذیل میں ہونے والی

فروگزاشتوں پر روشنی ڈالنے کو کہا۔ جنرل یحییٰ خان نے بتایا کہ وہ آئین کی حدود میں رہتے ہوئے وہ سارے اقدامات کر رہے تھے جن پر سب کا اتفاق تھا مگر ووٹنگ کا طریقہ کار ان میں شامل نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "میرے خیال میں یہ ضروری تھا کہ اس معاملے کو منتخب ایوان پر چھوڑ دیا جاتا" ہم قطعی طور پر اس وجہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر ہر قیمت پر اتفاق رائے درکار تھا تو آئین کی ایک شق کی رو سے ایسا کرنا چاہئے تھا اور اسے عام روایتی طریقوں سے نہیں دیکھنا چاہئے تھا جیسا کہ اس ضمن میں کیا گیا۔ تاہم اس سے کہیں زیادہ اہم بات ایسی اکثریت کو زبانی بیان پر چھوڑ دینا اور اس کے نتیجے کو دیکھنا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حزب اقتدار خود یہ کہہ سکتی تھی کہ فیصلہ سادہ اکثریت کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ یہ بات اس حقیقت سے واضح ہے کہ جب ایوان کے سامنے یہ سوال اٹھتا کہ کتنے ووٹوں کی اکثریت ہونی چاہئے تو اس سوال کا جواب اپنے آپ ہی ایک سادہ اکثریت کے ذریعے طے ہو جانا چاہئے تھا۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ وہ لوگ جو ایوان میں اکثریت رکھتے تھے ایسے کسی فیصلے کی حمایت کرتے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے قابل بناتے۔ جہاں تک اس صورت حال کا ہماری سیاست سے تعلق ہے تو حقیقی صورتحال بہت مایوس کن تھی۔ اس فیصلے کی وجہ یہ کہ ہر قیمت پر ایک فرد ایک ووٹ ہونا چاہئے' واضح تھا کہ مشرقی پاکستان کو آبادی کے لحاظ سے اکثریت حاصل تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ایوان کے فیصلے کرنے کی ایک ہی بات اہم تھی اور وہ صوبائی خودمختاری کا معاملہ تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پہلے چھ نکات لے کر آئے تھے اور اگر انہیں مشرقی پاکستان سے اٹھانوے فیصد نشستیں جیتنے کی توقع نہ ہوتی تو گول میز کانفرنس کے جاری رہنے کا ماحول بن سکتا اور اس طرح مجیب یہ ثابت کر سکتے کہ وہ بہت بڑی طاقت ہیں۔ لہٰذا اگر چھ نکات مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک نزاعی معاملہ ثابت ہوئے جس کا ہر امکان موجود تھا تو یہ فیصلہ کرنا کہ ان نکات کو چھوڑنے کے لئے کہ ایوان میں کتنی اکثریت کی ضرورت تھی' درحقیقت مشرقی پاکستان کو ہی طے کرنا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ اسے ساتھ رہنا ہے یا نہیں۔

پچھلے پیراگراف میں جو کچھ بھی بتایا گیا ہے وہ درحقیقت اس تصور پر مبنی ہے کہ اس بات کی نہایت سنجیدگی سے توقع کی جا رہی تھی کہ مشرقی پاکستان رائے شماری میں حصہ لیتا مگر اپنے چھ نکات کی روشنی میں۔ اگر بات کو اطمینان بخش طریقے پر سمجھ لیا جاتا کہ مشرقی پاکستان چھ نکات کے مطالبات کی حد تک نہیں جا سکتا تھا تو صوبائی خودمختاری کے سوال کی اہمیت اور حساسیت کو کم کیا

جا سکتا تھا اور اس بنیاد پر کم از کم اکثریت کی ضرورت کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ ووٹنگ کے طریق کار کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا گیا تھا۔ شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وزیر قانون / مشیر قانون نے جنرل یحییٰ کو اس مسئلے کی نزاکت سے آگاہ کر دیا تھا اور واقعی جنرل نے 28 نومبر 1969ء کو اپنے نشریئے میں جس کا ہم قبل ازیں حوالہ دے چکے ہیں اور 28 مارچ 1970ء کو لیگل فریم ورک آرڈر کے نفاذ سے عین دو دن پہلے یہ باتیں بتائیں۔

''28-11-1969: جہاں تک قومی اسمبلی کے ووٹنگ کے طریق کار کا سوال ہے تو یہ بات باعث مسرت ہے کہ اسمبلی' بنیادی آئینی معاملات پر فیصلہ کرے گی۔ آئین ایک مقدس دستاویز ہے اور مل جل کر ساتھ رہنے کا ایک معاہدہ ہے۔ اس کا کسی بھی عام قانون سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ووٹنگ کے طریقہ کار میں ایوان کو شریک کیا جائے اور اس میں پاکستان کے اندر بسنے والے تمام علاقوں کی صحیح اور صاف ستھری نمائندگی ہونی چاہئے ایوان کے کام مکمل کرنے کے بعد' جو آئین کی تیاری جیسا اہم کام ہوگا اور اسے معتبر تسلیم کیا جائے گا • بننے والا آئین' پاکستان کا آئین تصور ہوگا۔ اس کے بعد ہی نئی حکومت کے قیام کے لئے میدان ہموار ہو سکے گا''۔

''28-3-1970: جب 1970ء کا لیگل فریم ورک آرڈر چھپ کر سامنے آئے گا' تو آپ دیکھیں گے کہ دستوری طریقہ کار کے معاملات میں قومی اسمبلی کے لئے ووٹ ڈالنے کے طریقہ کار کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جسے بہر طور پر ایوان ہی طے کرنے کا مجاز ہے اور یہ میری دلی خواہش اور تمنا ہے کہ اس اہم معاملے پر خیالات میں کوئی بنیادی اختلاف نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کے لئے اتفاق رائے مثالی ہونا چاہئے۔ کسی بھی معاملے میں شرح فیصد کے تناسب سے بات کرنا میں ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا ہوں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر میں پہلے بھی بات کر چکا ہوں لیکن دوبارہ پرزور انداز میں کہنا چاہوں گا کہ آئین کی تیاری کسی معمولی قانون سازی کے کام کے مترادف نہیں ہے بلکہ یہ مل جل کر رہنے کا ایک معاہدہ ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تمام علاقے ووٹنگ کے طریقہ کار سے مکمل طور پر

مطمئن ہوں اور یہ محض ایوان کے ذریعے ہی بہتر طور پر ممکن ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جب تک تمام علاقے صحیح طور پر مطمئن نہیں ہوتے اس وقت تک آئین حقیقی معنوں میں مختلف صوبوں اور علاقوں کے لوگوں کے لئے ویسا قابل قبول نہیں ہوسکتا جیسا کہ ایسی دستاویز کو ہونا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی مناسب اور موزوں بندوبست تک پہنچنا ممکن ہے۔

یہ استدلال غیر معمولی ہے اور بلاکم وکاست صورت حال کی عکاسی کرتا ہے کہ ایک آئین کا ہونا ضروری تھا جس کے تحت ووٹنگ کے طریقہ کار کا معاملہ طے پانا تھا۔ جنرل کا خیال تھا کہ یہ حقیقی تضاد ہے۔

لیگل فریم ورک آرڈر کا دوسرا جزو وہ معاملہ تھا جو طریق کار کے بلکہ کسی حد تک آئین کے استحکام سے متعلق تھا' جسے پائیدار ہونا تھا۔ یہ ایک ضرورت تھی کہ قومی اسمبلی ایک سو بیس دن کے اندر آئین کی تیاری کا کام مکمل کرے ورنہ دوسری صورت میں وہ تحلیل ہوجاتی۔ نظریاتی طور پر یہ اصول کہ آئین بنانے کے لئے ایک دن مختص کرلیا گیا نہیں ہونا چاہئے اور وہ بھی ایسے کہ قانون سازی کا کام بھی جاری ہو۔ اگر قومی اسمبلی ایک آئین ساز اسمبلی ہوتی اور ساتھ ہی قانون ساز اسمبلی بھی ہوتی اور بغیر وقت کے تعین کے اسے آئین کی تیاری کا کام مکمل کرنا ہوتا تو صورت حال کی نزاکت اور خطرہ واضح طور پر نظر آجاتا۔ لہٰذا ایسی اسمبلی خود کو بچانے کے لئے آئین کی تیاری کا کام اس وقت تک معرض التوا میں ڈال دیتی جب تک اس کا وقت نہیں آجاتا اور جب اسمبلی اپنی حقیقی نمائندگی کے اعتبار سے ختم ہوجاتی۔ پاکستان میں ہمارے لئے ایسا تجربہ نیا نہیں ہے اور یہ تازہ ترین بھی ہے۔ پہلی آئین ساز اسمبلی بار بار خطرات سے دوچار ہوتی رہی۔

تاہم خطرے کا احساس کرنا اور بات ہے اور اس پر کسی انتہاپسندانہ اقدام کے ذریعے قابو پانا دوسری بات...... "لیگل فریم ورک آرڈر" کے تحت منتخب کی جانے والی قومی اسمبلی کو قانون سازی کا قطعاً کوئی اختیار اس وقت تک حاصل نہیں تھا' تاوقتیکہ وہ کسی آئین کی تدوین نہ کرلے۔ چنانچہ اس پوشیدہ خطرے کو جو قومی اسمبلی کو بیک وقت ان دونوں امور کی انجام دہی سے لاحق ہوسکتا تھا آغاز ہی سے بھانپ کر مسدود کردیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ایک سو بیس دنوں کی مہلت دی گئی تھی بلکہ اسے اس قدر تقدیس عطا کردی گئی تھی کہ اگر دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان آئین سازی کے مسئلے پر شدید اختلافات پیدا ہونے لگیں تو ایسی صورت میں بھی

ایک سو بیس دنوں کی اس مہلت میں کوئی توسیع اور اضافہ ہرگز نہیں کیا جائے گا۔

اس مرحلے پر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ کیا چھ نکاتی پروگرام کا مطلب واضح طور پر علیحدگی تھا یا کم از کم دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا سا تعلق جو آگے چل کر علیحدگی پر منتج ہوجاتا؟ اس سوال سے ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس وقت کے صاحبان اقتدار کے نزدیک یہ چھ نکاتی پروگرام پاکستان کی سالمیت اور یک جہتی سے متصادم تھا؟ کیا انہوں نے کبھی سنجیدگی سے یہ سوچا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے؟ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ان ترمیم شدہ چھ نکات پر بھی بالترتیب ایک نظر ڈال لی جائے۔

پوائنٹ (1) اس نکتے میں کہا گیا ہے کہ حکومت کی نوعیت وفاقی اور پارلیمانی ہوگی جس میں وفاقی مقننہ اور وفاق کی تشکیل کرنے والی وحدتوں کی مقننہ کا انتخاب براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ وفاقی مقننہ میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوگی!

(2) وفاقی حکومت کے پاس صرف دو محکمے ہوں گے یعنی دفاع اور امور خارجہ جب کہ درج ذیل شرائط سے مشروط وہ کرنسی کا شعبہ بھی رکھ سکتی ہے!

(3) دونوں صوبوں کے لئے دو علیحدہ کرنسیاں' جو باہمی طور پر بآسانی قابل تبادلہ ہوں یا متبادل کے طور پر صرف ایک ہی کرنسی جو وفاقی ریزرو سسٹم کے قیام سے مشروط ہوگی جس میں علاقائی وفاقی ریزرو بنکس کا قیام بھی شامل ہے جو اس بات کی ضمانت دیں گے کہ ذرائع اور سرمائے کی منتقلی ایک صوبے سے دوسرے صوبے کو نہیں ہوگی۔

(4) مالیاتی پالیسی کی تشکیل وفاق میں شامل وحدتوں کی ذمہ داری ہوگی' تاہم وفاقی حکومت کو مطلوبہ آمدنی کے ذرائع مہیا کردیئے جائیں گے' تاکہ وہ دفاع اور امور خارجہ پر ہونے والے اخراجات کو پورا کرسکے۔ اس قسم کے مالیاتی ذرائع خود بخود وفاقی حکومت کو فراہم ہوجائیں گے' جس کے طریقہ کار اور وفاقی وحدتوں کی جانب سے تناسب کے تعین کی بنیاد' آئین میں وضاحت کے ساتھ درج ہوگی۔ یہ آئینی دفعات اس بات کی ضمانت دیں گی کہ وفاقی حکومت کی مالی کی ضرورت مستقل طور پر پوری کی جاتی رہے۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کہ مالیاتی پالیسیوں پر وفاقی وحدتوں کا مکمل کنٹرول بہرصورت قائم رہے گا۔

(5) ایسے آئینی اقدام کئے جائیں گے' جن کی رو سے ہر وفاقی وحدت کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا الگ الگ حساب رکھا جاسکے' جن پر ان وحدتوں کی حکومتوں کا مکمل کنٹرول ہو۔

وفاقی وحدتوں کی غیر ملکی زرمبادلہ کی ضروریات کا تعین اس تناسب کی بنیاد پر کیا جائے گا جو آئین میں طے شدہ طریقہ کار کے عین مطابق ہوگا صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ آئین کے تحت غیر ملکی تجارت اور امداد کے بارے میں ملک کی خارجہ پالیسی کی حدود میں رہتے ہوئے مذاکرات اور گفت وشنید کر سکیں۔

(6) وفاقی وحدتوں کی حکومتیں آزادانہ طور پر اپنی ملیشیا یا پیرا ملٹری فورس رکھ سکیں گی تاکہ قومی سلامتی کے قیام میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

یحیٰی خان چھ نکات سے بخوبی آشنا تھے

ایک ایسا گواہ جو اس پوری مدت کے دوران آئین سازی کے عمل سے وابستہ رہ چکا ہے اور جسے قانون اور آئینی شعبوں کا طویل اور ماہرانہ تجربہ حاصل ہے' ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس اے۔آر۔کارنیلیس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا انتخابی مہم کے دوران کسی موقع پر یہ چھ نکات جنرل یحیٰی خان کو بھی دکھائے گئے تھے تو ان کا جواب یہ تھا" وہ ان نکات سے بخوبی آشنا تھے اور وقتاً فوقتاً ان کے بارے میں گفتگو بھی کرتے تھے' تاہم انہوں نے کبھی ان کے تجزیے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان نکات میں سے چار تو ایسے تھے جنہیں بآسانی قبول کیا جا سکتا تھا اور میں نے کابینہ کے اجلاس میں بھی یہ کہا تھا کہ ہم آسانی کے ساتھ آئین میں ضروری ترمیم کرتے ہوئے ان چھ نکات میں سے اکثر کو اس میں جگہ دے سکتے ہیں جس سے سیاسی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے" جسٹس کارنیلیس کا پورا احترام کرتے ہوئے ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس معاملے کو قرار واقعی اہمیت نہ دیتے ہوئے محض اسے ٹالنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

کرنل حسن کے مطابق جنہیں 26 مارچ 1969ء کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیڈ کوارٹرز میں جج ایڈووکیٹ جنرل ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے کی حیثیت سے متعین کیا گیا تھا اور جو مارشل لا کے تمام عرصے میں ہر لحظہ آئین سازی کے مسئلہ سے کافی متعلق رہے ہیں' ان چھ نکات کا بظاہر مقصد علیحدگی نہیں تھا جس سے ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ دیکھنے میں یہ چھ نکات علیحدگی کا پیش خیمہ معلوم نہیں ہوتے۔

ہمارے روبرو چند اور بھی گواہان ایسے پیش ہوئے جنہیں انتخابی مہم کے مشکل دور میں

حکومت کی جانب سے مشرقی پاکستان کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا جیسے گورنر مشرقی پاکستان ایڈمرل احسن اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ایم۔یعقوب! ان دونوں حضرات کا کہنا ہے کہ انہیں یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ان چھ نکات کے مفہوم اور مطالب کا غور اور سنجیدگی کے ساتھ کوئی تجزیہ کیا گیا ہو یا ان کے اطلاق کے نتائج اور عواقب کا ہی کوئی احاطہ کیا گیا ہو!

یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کیوں کر ایک مرکزی حکومت کو جس کے پاس فقط دفاع اور امور خارجہ کے محکمے ہوں اور جسے ٹیکسوں کے نفاذ کا کوئی اختیار حاصل نہ ہو حقیقی معنوں میں ایک با اختیار حکومت کہا جا سکتا ہے؟ آج کے زمانے میں ایک ترقی پذیر ملک کی خارجہ پالیسی کا بڑا گہرا تعلق اس کی غیر ملکی تجارت سے ہوتا ہے اور اگر وفاق غیر ملکی تجارت ہی کو کنٹرول نہ کر سکے تو یہ بات ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتی کہ وہ کس طرح اپنی خارجہ پالیسی پر مؤثر طریقے سے عمل پیرا ہو سکے گا؟ اور خارجہ پالیسی کو کنٹرول کئے بغیر ایک مرکزی حکومت کس طرح ملک کا دفاع کر سکتی ہے؟

شیخ مجیب الرحمٰن مذاکرات پر آمادہ تھے

عوامی لیگ کے" ترمیم شدہ" چھ نکات اس کے پروگرام کو" اصل" نکات کی بہ نسبت زیادہ مؤثر اور بھرپور طریقے سے پیش کرتے ہیں: تاہم اپنی روح میں وہ سابقہ اصل نکات کے مقابلے میں اتنے زیادہ مختلف بھی نہیں کہ ہم یہ سوچنے لگیں کہ یہ ترمیم شدہ چھ نکات علیحدگی کی طرف لے جاتے ہیں جب کہ اصل نکات اس سے مبرا تھے۔ ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کرنل حسن کے ظاہر کردہ خیالات کافی حد تک تکنیکی تھے بلکہ انہیں مضحکہ خیز بھی کہہ سکتے ہیں: تاہم یہ بات قابل تعریف ہے کہ اس بیان کے فوراً ہی بعد انہوں نے کہا کہ ان چھ نکات میں تبدیلی بھی کی جا سکتی تھی۔ اب بہت سے گواہ ہمیں مستقلاً یہ بتا رہے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے خود بھی کہا تھا کہ چھ نکات پر مذاکرات ہو سکتے ہیں کیونکہ بہرحال یہ کسی مذہبی صحیفے کا حصہ نہیں ہیں!...... تاہم ہمیں ان بیانات پر کسی قدر تعجب اور حیرت کا اعتراف کر لینا چاہئے۔ اگر حکمراں جماعت کے خیال میں چھ نکات کا مطلب علیحدگی نہیں تھا تو یقیناً ان میں کوئی غلط بات نہیں تھی اور اکثریت کی خواہشات کو جس کا تعلق ملک کے ایک صوبے سے تھا مغربی پاکستان کی جانب سے بغیر کسی سخت مخالفت کے قبول کیا جا سکتا تھا! لیکن ایسی صورت میں اس بات پر اصرار کیوں کیا جا رہا ہے کہ شیخ

مجیب الرحمٰن چھ نکات پر سودے بازی کے لئے تیار تھے؟ درحقیقت ان نکات پر مذاکرات یا سودے بازی کا واضح مطلب یہ تھا کہ یہ چھ نکات جوں کے توں قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ ملک کی سالمیت اور یک جہتی کے منافی تھے! اگر ایسا نہ ہوتا تو جنرل یحییٰ خان کو اکثریت کے اس مطالبے اور خواہش کو تسلیم کرنے میں قطعاً کوئی عذر نہ ہوتا۔ انہوں نے خود کہا کہ انہوں نے صرف انہی امور و معاملات کو آخری شکل دی ہے جن پر مکمل طریقے سے اتفاق رائے موجود تھا اور چونکہ ان کی حیثیت محض ایک نگراں کی تھی لہٰذا کوئی بھی ایسا آئینی منصوبہ جو ان کے طے کردہ پانچ بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہوتا انہیں یکساں طور پر قابل قبول ہو سکتا تھا۔

سرکاری ملازم عوامی لیگ کے ساتھ تھے

ہمارے خیال میں اس مہم میں عدم مداخلت کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عوامی لیگ کے معاملے میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے حکومت انتہا کو پہنچ گئی کہ اس نے ان جماعتوں کو تحفظ دینے سے بھی انکار کر دیا جن کی مہم میں عوامی لیگ دخل اندازی کر رہی تھی۔ مثال کے طور پر عوامی لیگ نے جماعت اسلامی کا ایک جلسہ درہم برہم کر دیا مگر حکومت کی ایجنسیوں نے کوئی دخل اندازی نہیں کی اور تماشائی بنی دیکھتی رہیں۔ پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے جلسے کا بھی یہی حال ہوا۔

دوسرا سبب مشرقی پاکستان کے سویلین ملازمین کا طرز عمل تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں حکومت پاکستان جنرل یحییٰ خان کے ماتحت تھی کیونکہ تمام ملک میں مارشل لا نافذ تھا۔ اس لئے مشرقی پاکستان کا انتظام بھی مارشل لا اتھارٹیز چلا رہی تھیں۔ لیکن مشرقی پاکستان میں خدمات انجام دینے والے زیادہ تر سویلین ملازمین مشرقی پاکستانی تھے۔ اگرچہ وہ ایک ذہین طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ ان جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جو اس وقت مشرقی پاکستان کے لوگوں میں عام تھے۔ یہ متوقع تھا کہ مشرقی پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ جذباتی طور پر عام پبلک کے جذبات میں شریک ہوں گے لیکن اگر ان کی تعلیم انہیں جذبات پر قابو پانے میں کچھ مدد بھی کرتی تب بھی استحصال کئے جانے کے الزام سے وہ ضرور متاثر ہوتے۔ سول ملازمین نے دیکھ لیا تھا کہ عوامی لیگ ایک چڑھتا ہوا سورج ہے اور مستقبل اسی کے ہاتھ میں

ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اس جدوجہد کے ابتدائی مرحلے میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن غیر متنازع فاتح کے طور پر ابھریں گے پھر بھی اقتدار کا مرکز فوج کے ہاتھوں سے منتقل ہو رہا تھا اس لئے مشرقی پاکستانی سول ملازمین کی نگاہیں اب آنے والے حاکم کی طرف لگی ہوئی تھیں بجائے اس حاکم کے جو کہ جانے والا تھا۔ اس کے علاوہ چھ نکاتی پروگرام میں مشرقی پاکستان کی بیوروکریسی کے لئے بھی کشش تھی کیونکہ اس میں انہیں اپنی ترقی کے مواقع نظر آ رہے تھے۔ ایک طرح سے مشرقی پاکستان کے سول ملازمین کی وہی حیثیت تھی جو آزادی سے پہلے برصغیر میں ہندو اور مسلمان سول ملازمین کی تھی جو جذباتی طور پر کانگریس اور مسلم لیگ سے لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان کے سول ملازمین نے اپنا تمام اثر اس پارٹی کے حق میں استعمال کیا جو مشرقی پاکستان کے لئے کام کر رہی تھی بجائے ان جماعتوں کے جن کا رجحان قومی تھا۔ لہٰذا یہ حقیقت کہ عوامی لیگ کامیاب ہو گی شروع سے آشکارا ہو گئی تھی اگرچہ اس بات کی توقع کسی کو نہیں تھی کہ وہ ایسی بھاری کامیابی حاصل کر لے گی۔

ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ حکومت کو ایسے نتائج کی توقع تھی۔ سمندری طوفان جیسے ہر واقعے کے بعد عوامی لیگ کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے جا رہے تھے۔ حکومت کی خفیہ ایجنسیاں اندازہ لگا رہی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو 60 فیصد کامیابی حاصل ہو جائے گی جو مجموعی طور پر اکثریت نہیں ہو گی۔ یہ نتائج اس بات کے باوجود ظاہر ہوئے کہ حکومت خاموش تماشائی نہیں رہی نتائج پر اثر انداز ہونے کے لئے انتخابات کے دوران اس نے پس پردہ کچھ کارروائیاں کیں۔ جنرل یحییٰ نے اپنے ایک بااعتماد ساتھی میجر جنرل محمد عمر کو نیشنل سیکیورٹی کونسل کا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ ایسے حالات میں یہ ایک ایسا عہدہ معلوم ہوتا تھا کہ جس کے پردے میں دوسری کارروائیاں کی جاتی تھیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ یہ کونسل صدر ایوب خان کے دور میں بنائی گئی تھی لیکن اس کونسل کے تمام اراکین نے جنہوں نے ہمارے سامنے بیان دیئے اور جن میں جنرل عمر بھی شامل تھے اس بات کا اعتراف کیا جس مقصد کے لئے یہ کونسل بنائی گئی تھی اس کے لئے یہ غیر مؤثر تھی۔ اس کے پاس اختیارات بھی نہیں تھے اور نہ کوئی ایسا نظام تھا جس کے تحت یہ اپنا مقصد حاصل کر سکتی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک ایسے شخص کو جو ان کے اسٹاف آفیسر کی حیثیت سے کام کر چکا تھا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ جنرل عمر کی صدر تک براہ راست رسائی تھی۔ انہوں نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ وہ

غیر مؤثر تھے اور نہ ہی ان کے عہدے کو مؤثر بنانے کے لئے کوئی اقدام کئے گئے۔ جنرل عمر کے پاس سیف میں بہت بڑی رقم پڑی ہوئی تھی اور جب بڑی قیمت کے یونٹوں کو تبدیل کیا گیا تو انہوں نے چھ لاکھ روپے جمع کرائے [illegible] تک تین لاکھ روپے نکلوائے گئے اور ان کا کوئی حساب نہیں دیا گیا۔ اس کے ساتھ جنرل عمر بار بار سیاستدانوں سے ملتے رہتے تھے۔ اس سے واضح طور پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ستمبر 1970ء میں سیلابوں نے مشرقی پاکستان کو آ گھیرا اور یحییٰ خان کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 7 اور 17 دسمبر تک ملتوی کرنے پڑے۔ مجیب الرحمٰن نے اصرار کیا کہ اس موقع پر سیلابوں کی وجہ سے انتخابات ملتوی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ مشرقی پاکستان کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان کے لوگ پانی میں آدھے غرق رہنے کے عادی ہیں۔ ممکن ہے کہ یحییٰ خان نے خلوص کے ساتھ سوچا ہو کہ اکتوبر میں انتخابات کرانا قابل عمل نہیں ہے اسی وجہ سے انہوں نے ملتوی کر دیئے ہوں۔ دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی انتخابات ملتوی کرانے کا مطالبہ کیا۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انتخابات ملتوی کرنے میں یحییٰ خان کا فیصلہ بدنیتی پر مبنی تھا۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ انتخابات ملتوی کرنے سے مہم چلانے کے لئے مزید دو ماہ کا اضافہ ہو گیا اور اس طرح آمرانہ دور کی مدت میں اضافہ ہو گیا۔

اس کا ایک اور برا نتیجہ بھی نکلا نومبر 1970ء میں مشرقی پاکستان زبردست سمندری طوفان کا شکار ہوا اور اسے عوامی لیگ نے مغربی پاکستانیوں کے خلاف پہلے سے موجود شدید نفرت کو بڑھانے کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ مصیبت کے اس وقت میں نہ تو مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے اور نہ ہی حکومت نے جس میں مغربی پاکستان کے لوگوں کی اکثریت تھی مشرقی پاکستان کے لئے کوئی ہمدردی کی۔ مغربی پاکستان کے ایک رہنما خان عبدالولی خان نے بیان دیا کہ اس وقت سوائے ان کے مغربی پاکستان کے کسی رہنما نے مشرقی پاکستان کا دورہ نہیں کیا اور عوامی لیگ نے اس بات کو مشرقی پاکستان کے ساتھ ظالمانہ سلوک نہیں تو عدم توجہی کا سلوک کرنے سے تعبیر کیا۔ مغربی پاکستان میں ایک اہم سیاسی جماعت کے ایک رہنما نے ہمارے سامنے بیان دیا کہ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے رہنماؤں کے صرف جانے سے کچھ نہیں ہوتا مشرقی پاکستان کے لئے مادی امداد بھیجی گئی تھی۔ یہ بات درست ہے۔ لیکن انسانی جذبات کبھی کبھی حقیقی امداد سے زیادہ دکھاوے کی ہمدردی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس موقع پر مغربی پاکستان کے رہنماؤں کی عدم موجودگی مشرقی پاکستان کے لوگوں کو خفیف کرنے کے لئے تھی یا ان کی عدم توجہی کا نتیجہ تھی۔ شاید انہوں نے یہ صحیح طور پر سوچا تھا کہ وہ مادی مدد بھیج دیں اور خود انتخابی مہم کی ضرورت کے پیش نظر مغربی پاکستان میں موجود رہیں۔ ہم یہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اس بات نے ایک اہم کردار ادا کیا اور اس سے مجیب کی حیثیت مزید مستحکم ہو گئی۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ مجیب انتخابات پر چھا جائے گا۔ اس طوفان کے بعد چند جماعتوں کو چھوڑ کر دوسری تمام جماعتیں انتخابات سے علیحدہ ہو گئیں اور مجیب کے لئے میدان خالی چھوڑ دیا۔

مجیب الرحمٰن کی قوت اور کمزوری

انتخابی مہم کے بارے میں یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ جس اکثریت سے مجیب کامیاب ہوئے اور انتخابات کے بعد جس کی وجہ سے ان کی طاقت اور کمزوری ظاہر ہوئی اس کی مجیب کو توقع تھی۔ انہیں شروع ہی سے اس بات کا اندازہ تھا کہ بھاری اکثریت کی وجہ سے وہ اپنی پارٹی کے قیدی ہو کر رہ جائیں گے اس لئے انہوں نے کونسل مسلم لیگ کو کچھ نشستیں پیش کیں کچھ جماعت اسلامی کو پیش کیں اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے نہیں کریں گے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی نشستوں پر واضح اکثریت چاہتے تھے مگر پورے پاکستان میں اکثریت نہیں چاہتے تھے جہاں تک ہم نے سنا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں تقریباً 120 نشستیں حاصل ہو جائیں جس سے وہ ایوان میں سب سے بڑی جماعت کے رہنما بن جائیں مگر انہیں مکمل اکثریت حاصل نہ ہو؛ ہمیں احساس ہے کہ بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجیب چاہتے تھے کہ چھ پوائنٹس کی بنیاد پر مذاکرات کریں بجائے اس کے کہ اس پروگرام کو وہ ایوان میں اپنی قوت کے ذریعے منظور کرائیں یہ بڑا مشکل ہوگا اور یہ ناانصافی بھی ہوگی کہ چھ نکات کے سلسلے میں مجیب الرحمٰن کے ارادوں کے بارے میں ان کی یا ان کی جماعت کے کسی رکن کی شہادت لئے بغیر فیصلہ کر لیا جائے۔

انتخابات کے بعد

تاہم کونسل مسلم لیگ اور جماعت اسلامی نے اس پیشکش کو قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ وہ زیادہ نشستیں حاصل کر سکیں گی۔ نتائج ہمیں معلوم ہیں۔

انتخابات 7 دسمبر 1970ء کو اختتام پذیر ہوئے ماسوا ان چند حلقہ ہائے انتخابات کے جہاں پولنگ سمندری طوفان کے باعث ملتوی کر دی گئی تھی حتمی نتائج میں شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں 162 نشستوں میں سے 160 نشستیں حاصل کیں اور مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی جس نے 138 نشستوں میں سے 84 نشستیں حاصل کیں۔ خواتین کی 13 نشستیں بعد میں پر کی جانی تھیں اور ظاہر ہے کہ مشرقی پاکستان میں یہ عوامی لیگ کو ملیں اور مغربی پاکستان میں ان کی زیادہ تعداد پاکستان پیپلز پارٹی کو ملی۔

طور پر اور اگر جغرافیائی حالات عملی طور پر مختلف ہوتے تو بھی ایک جماعت کا مکمل اکثریت کے ساتھ ابھرنا اور دوسری پارٹی کا بہت زیادہ نشستیں حاصل کرنا جو کم از کم اکثریتی پارٹی کے تقریباً نصف ہو ایک آئینی اور جمہوری طرز حکومت کے لئے مثالی تھا۔ مگر ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ عوامی لیگ نے مغربی پاکستان میں ایک بھی نشست حاصل نہ کی اور اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان میں کوئی نشست حاصل نہ کی۔ اس کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ مجیب الرحمٰن نے جس علاقے سے اکثریت حاصل کی وہ زمینی راستے سے باقی ملک سے ملا ہوا نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے درمیان ایک ایسا ملک حائل تھا جو تاریخی وجوہات کی بنیاد پر پاکستان اور خاص طور پر اس کی سلامتی کا مخالف ہے اور یہ سب کچھ اس حقیقت کے ساتھ منسلک تھا کہ قومی اسمبلی جسے ہر چند قانون ساز ادارے کے طور پر کام کرنا تھا بنیادی طور پر دستور ساز

ادارہ تھی۔ اس وقت یہ کہنا بڑا آسان ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنے قانون ساز ادارے کے الیکشن کی مہم میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے ایک آئینی پروگرام کی مہم چلائی اور واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ ان انتخابات کو ریفرنڈم سمجھتے ہی نہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ جمہوریت اور انصاف کا مطالبہ ایک جیسا ہے اور یہ کہ انہیں اس بنیاد پر آئین تیار کرنے کی اجازت دی جائے مگر بدقسمتی سے برآسان بات سچ نہیں ہوتی۔

ملک جغرافیائی طور پر یکجا نہیں تھا۔ نہ ہی آئین ملک کی معروضی حالت کے مطابق تھا۔ آئین بنانا از خود کوئی مسئلہ نہیں تھا' جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ قانون ساز ادارے کے پاس واحد مسئلہ مرکز اور صوبوں کے درمیان اقتدار کی تقسیم رہ گیا تھا۔ جبکہ یہ ایک وفاق ہونا چاہئے تھا اور اس امر کی مشکل سے تردید کی جا سکتی ہے کہ وفاق محض پورے وفاقی یونٹوں کی آبادی کی اکثریتی رائے سے وجود میں نہیں آ سکتا بلکہ اسے ہر فیڈرل یونٹ کی امنگوں کا ترجمان ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ ہمارا ملک فیڈریشن کا ایک مثالی نمونہ نہیں جس میں شامل یونٹ خود مختار ہوتے ہیں جو عمومی رائے سے وفاق میں شامل ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک ایک صدی تک وحدانی طرز حکومت کے تحت چلتا رہا ہے۔ وفاق پہلی مرتبہ غیر منقسم ہندوستان کے لئے 1935ء میں تجویز کیا گیا۔ جہاں اس وقت بھی فیڈریٹنگ یونٹ پہلی مرتبہ یونین میں نہیں آئے۔ حقیقت سے قطعی دور جہاں تک وفاق کے متعلق کی شقوں کا تعلق ہے 1935ء کا ایکٹ نافذ نہ ہو سکا اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ایکٹ از خود قومی اسمبلی کے ووٹ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اسے برطانوی پارلیمنٹ نے بنایا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہندوستانی عوام کی خواہشات کو تسلیم کرنے کا اقدام تھا مگر یہ کام ان کی رضامندی سے نہ ہوا۔ وفاق آزادی ہند ایکٹ 1947ء کے ساتھ وجود میں آیا اور اس وقت تک یہ حکومت ہند کا ایکٹ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 1956ء کا آئین ہمارے اپنے عوام کی اسمبلی نے منظور کیا۔ لیکن یہاں بھی یہ یونٹوں کی رضامندی کا نتیجہ نہیں تھا۔ 1962ء کا آئین برائے نام وفاقی تھا۔ اور ایک وفاقی آئین حقیقتاً 1970ء کی منتخب اسمبلی نے پہلی مرتبہ منظور کرنا تھا۔ اس قسم کی اسمبلی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ وفاقی آئین اس وجہ سے تیار کر سکے گی کہ وفاق کا ایک میں شامل ایک یونٹ جو ملک کی نصف سے زیادہ آبادی پر مشتمل ہے پورے ملک کے لئے آئین بنا کر اپنی شرائط منوا سکے گا جس کا باقی حصہ اس یونٹ کے رقبے سے کہیں زیادہ ہے اور چار دوسرے یونٹوں پر مشتمل ہے اور اس کے جغرافیائی' سیاسی اور

جذباتی حقائق آزادی کے بعد کے واقعات کونظر انداز کرتا ہے۔

عوامی لیگ کی انتخابات میں بھی اس کامیابی کے بعد پورے مشرقی پاکستان کا صوبہ بے صبری سے قومی اسمبلی کی طلبی کا منتظر رہا اور امید کی جاتی تھی کہ پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوگا جس میں مشرقی پاکستان ایک غالب کردار ادا کرے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ انتخابات میں کامیابی کے باوجود وہ اقتدار کا دعویٰ کرنے کا اہل نہ ہو سکے۔ یہ ایک قسم کا احساس تھا اور اگر حقیقت ہو تو بہت اچھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور مخفی خدشہ مغربی پاکستان یا فوج کا بھی تھا جو مشرقی پاکستان کے خیال میں بدلی ہوئی صورتحال میں اقتدار نہیں چھوڑے گی جس پر وہ گزشتہ 12 سال سے قابض رہے۔

دسمبر کا مہینہ گزر گیا اور ابھی تک ایسی کوئی علامت نہیں تھی کہ اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے گا۔ 3 جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں انہوں نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان سے حلف لیا اور پارٹی کے صوبائی خود مختاری کے پروگرام سے وفاداری کا عہد لیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اس موقف سے پیچھے ہٹتے رہے کہ چھ نکات پر بات چیت ہو سکتی ہے اور اب انہوں نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ چھ نکات بنگلہ دیش کے عوام کی ملکیت ہیں اور ان پر سودے بازی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکنہ طور پر حیرت انگیز تقریباً یکطرفہ انتخابی نتائج کے ساتھ یہ حقیقت بھی شامل تھی کہ انتظامیہ نے عوامی لیگ کی انتخابی مہم میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس لئے مجیب سیاسی قوت کے نشے میں سرشار تھے۔ دوسری جانب یہ بھی درست ہے کہ اس اکثریت کے ساتھ مجیب الرحمٰن ایک طرح سے کوئی آزاد انسان نہیں تھے۔ ان میں نسبتاً کم اکثریت کے ساتھ مذاکرات کرنے کی کوئی لچک اور استعداد باقی نہیں رہی تھی۔ اس دوسرے نقطہ نظر کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ دسمبر 1970ء اور 7 جنوری 1971ء کے درمیان جنرل یحییٰ خان اور مجیب الرحمٰن کی ڈھاکہ میں ملاقات بھی صورتحال کو بہتر بنانے میں ممد ثابت نہ ہو سکی۔ بہر حال مجیب نے اس وقت ایک جلسہ عام منعقد کیا اس کا مقصد قوت کا مظاہرہ تھا یا نہیں مگر اس میں پارٹی کے ارکان نے ان پر مکمل اعتماد اور وفاداری کا اظہار کیا بشرطیکہ وہ چھ نکات پر قائم رہیں یا ان پر پارٹی نے دباؤ ڈالا کہ وہ پروگرام کو جاری رکھنے کو یقینی بنائیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر اس وقت پارٹی کے کسی بھی رکن کی غیر موجودگی کے باعث (جس نے کوئی کردار ادا کیا ہو) کسی اطمینان بخش نتیجہ

پر پہنچنا بہت مشکل ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں کے درمیان فرق بہت کم ہے۔ صورتحال یہ تھی کہ عوامی لیگ قطعی طور پر ایک ایسی صورتحال کی پابند تھی جہاں اس کے چھ نکاتی پروگرام سے پہلو تہی یا مفر مشکل تھا۔ انتخابی نتائج اور 3 جنوری 1971ء کے جلسہ عام کے درمیان جنرل یحییٰ خان کی طرف سے دونوں طرف کے رہنماؤں کو اکٹھا کر کے تبادلہ خیال کرنے کی ظاہراً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر چہ بعد میں جب انہوں نے کوشش کی تو شیخ مجیب الرحمٰن نے سخت رویہ اختیار کیا۔ ایسا کرنا ناگزیر تھا لیکن ایسی کسی کوشش کی کامیابی کے لئے یہ بہت پہلے ہونا ضروری تھا۔ یعنی جلسہ عام سے قبل اگر چہ اس کے لیے مقررہ تاریخ 3 جنوری 1971ء کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ حقیقت میں یہ ملاقات انتخابی نتائج کے چار ہفتے بعد تک نہیں ہو سکی۔

اس سے ہٹ کر چھ نکاتی پروگرام پر مغربی پاکستان کی پارٹیوں کا انتخابات سے قبل اور بعد کی صورتحال پر ردعمل کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ مغربی پاکستان میں کم و بیش تمام جماعتوں نے چھ نکاتی پروگرام کی مخالفت کی۔ یہ کہنا کہ صرف پاکستان پیپلز پارٹی نے مخالفت نہیں کی بڑا طنز ہوگا۔ انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی ہی تھی جو مخالفت میں سب سے زیادہ شور مچانے والی تھی جبکہ دوسروں کی مخالفت کم تھی ہمارے خیال میں یہ کہنا درست ہے کہ جب دوسروں نے چھ نکاتی پروگرام کی مخالفت ترک کر دی تھی ان کا نقطہ نظر عام طور پر انتخابات کے بعد کے زمانے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نقطہ نظر کی مخالفت کرتا تھا۔ یہ ذکر کرنا درست ہوگا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما کا پارٹی کے عام جلسوں میں زیادہ زور چھ نکاتی پروگرام پر نہیں تھا بلکہ انہوں نے اپنی مہم میں زیادہ زور سوشلسٹ پروگرام پر دیا۔ پارٹی کے چیئرمین نے ہمارے روبرو شہادت دیتے ہوئے ان وجوہات کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا۔ اس کے آغاز میں انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ انہوں نے حقیقتاً چھ نکاتی پروگرام کی مخالفت نہیں کی اور یہ بھی کہا کہ چھ نکاتی پروگرام کے مضمرات ایسے تھے کہ جلسہ عام میں بیان نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ عوام سیاسی اور آئینی معاملات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ پڑھے لکھے اور بار کونسلوں جیسے دانشوروں کے نسبتاً چھوٹے اجتماعات میں انہوں نے بار بار اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی کہ چھ نکاتی پروگرام ملک کے مفاد میں نہیں بلکہ اس کا مطلب علیحدگی ہے۔

اس پس منظر میں جنرل یحییٰ خان مشرقی پاکستان گئے۔ ایڈمرل احسن کی شہادت جنرل یحییٰ خان اور ان کی ٹیم کی شیخ مجیب الرحمٰن ساتھ بحث و تبادلہ خیال پر آمادگی پر روشنی ڈالتی

ہے۔ ہم نے اس سے پیشتر اس کا حوالہ دیا ہے جو ہمارے نزدیک چھ نکاتی پروگرام کا مطالعہ نہ کرنے کا موجب ہے۔ 6 جنوری 1971ء کو جنرل یحییٰ کے پرنسپل اسٹاف افسر جنرل پیرزادہ نے مشرقی پاکستان کے گورنر ایڈمرل احسن سے ملاقات کی اور ان سے چھ نکاتی پروگرام کی ایک نقل کے حصول کے لئے کہا تا کہ اگلے روز صدر اس پر مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں سے بات چیت کر سکیں۔ اس موقع پر صدر کی ٹیم کے پاس چھ نکاتی پروگرام کی نقل کا موجود نہ ہونا آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے تاہم ایڈمرل نے خاص طور پر پوچھا کہ کیا چھ نکاتی پروگرام کا تجزیہ کیا جا چکا ہے تا کہ اس کے مضمرات اور خامیوں کا پتہ چل سکے اور صدر مخصوص سوالات کرنے کے قابل ہو سکیں تو جنرل پیرزادہ نے جواب دیا کہ ایسا کوئی تجزیہ نہیں ہوا اور اگلے روز جو کچھ بھی غور و خوض ہونے والا ہے وہ ایک مختصر میٹنگ میں ہوگا' زیادہ تفصیل سے بحث مباحثہ کرنے کے دیگر مواقع ہوں گے۔

چنانچہ دوسرے دن ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں جنرل یحییٰ خان کے علاوہ وہاں پرنسپل اسٹاف افسر اور ایڈمرل احسن موجود تھے۔ عوامی لیگ کی طرف سے شیخ مجیب الرحمٰن' مسٹر تاج الدین' مسٹر نذر الاسلام' مسٹر قمر الزماں' خوندکر مشتاق احمد اور کیپٹن منصور علی تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا چھ نکاتی پروگرام پیش کیا اور بعض سوالوں کے جواب دیئے جو جنرل یحییٰ خان نے اٹھائے اور کہا (یہاں ہم ایڈمرل احسن کی شہادت پیش کرتے ہیں): ''جناب عالی! اب آپ جان گئے ہیں کہ چھ نکاتی پروگرام کیا ہے۔ یہ سوال بہت معنی خیز ہے۔ جنرل یحییٰ خان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ذاتی طور پر انہیں چھ نکاتی پروگرام کے خلاف کوئی اعتراض نہیں مگر مجیب کو مغربی پاکستان کے رہنماؤں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا جس پر شیخ مجیب الرحمٰن نے جواب دیا کہ یقیناً جناب عالی! آپ مہربانی کر کے اسمبلی کا اجلاس ممکنہ طور پر جلد از جلد بلائیں اور میں تجویز کرتا ہوں کہ 15 فروری 1971ء کو بلائیں اور آپ دیکھیں گے کہ میں نہ صرف سادہ بلکہ تقریباً دو تہائی اکثریت حاصل کروں گا۔''

رپورٹس کے بارے میں کوئی بھی شخص کیا قیاس کر سکتا ہے کہ اس سوال کا یقیناً یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکاتی پروگرام کو ترک کر دیں گے' دو تہائی اکثریت کے حوالے کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ کم از کم مغربی پاکستان سے بھی کچھ ووٹ حاصل کر لیں گے۔ جس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوگا کہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ سودے بازی کریں گے بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ وہ کم از کم مغربی پاکستان کے بعض ارکان کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کر سکیں گے۔

ایڈمرل احسن نے اس میٹنگ کی کارروائی بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ انتہائی اکثریت کے ساتھ عوامی لیگ مغربی پاکستان کے مفادات کی پروا کئے بغیر اپنا آئین مسلط کر سکتی ہے تو شیخ مجیب الرحمٰن نے جو جواب دیا وہ بڑا دلچسپ ہے ''نہیں! میں ایک جمہوری آدمی ہوں اور پورے پاکستان کی اکثریت کا رہنما ہوں۔ میں مغربی پاکستان کے مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں صرف مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں بلکہ مجھے عالمی رائے کا بھی خیال رکھنا ہے میں ہر کام جمہوری اصولوں کے مطابق کروں گا اور اس کا آغاز کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ آپ ڈھاکہ اسمبلی کے اجلاس سے تین چار روز قبل آئیں گے میں آپ کو اپنے آئین کا مسودہ دکھاؤں گا۔ اگر آپ کو اس پر اعتراضات ہوئے تو آپ کی خواہشات کو مدنظر رکھوں گا۔ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں صدارتی خطاب کے لئے مسودہ تیار کروں گا۔ میں اسمبلی میں جمہوریت بحال کرنے کی آپ کی کوششوں پر شکریہ ادا کروں گا اور پھر ہم ایک جمہوری پارلیمنٹ کے تمام عمل کا جائزہ لیں گے۔ ہم سبجیکٹ کمیٹیاں بنائیں گے۔ مسائل پر بحث ہوگی اور قابل قبول فارمولے اسمبلیوں سے باہر اور اندر تیار کریں گے۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ ایک بڑا اہم بیان ہے اگر اس جواب کو اس کی ظاہری صورت میں دیکھا جائے تو شیخ مجیب الرحمٰن اسمبلی کے اجلاس سے قبل تبادلہ خیال کی بات نہیں کر رہے تھے۔ پارلیمانی امور کے سلسلے میں ایوان کے اندر اور لابی میں ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول کے بارے میں سوچ رہے تھے وہ مغربی پاکستان کے ساتھ مفاہمت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے چھ نکاتی پروگرام پر اٹل رہنے کا سوچ رہے تھے۔ چھ نکاتی پروگرام میں ایسا کیا تھا جس میں مغربی پاکستان کے مفادات کا خیال رکھا جاتا۔ ایک وفاقی نظام جس میں مرکز کا مشکل سے کوئی کردار ہوتا۔ اس میں مشرقی پاکستان کے مفادات کا مغربی پاکستان کے خلاف یا اس کے برعکس کوئی ضرورت نہیں بنتی۔ درحقیقت چھ نکاتی پروگرام کے تحت جو آئین بنتا اس میں مرکزی اسمبلی کو بھی مشکل سے ہی کوئی کردار ادا کرنے کا موقع ملتا۔ مغربی پاکستان کی خواہشات کا اس نقطہ نظر سے خیال رکھنے کا مطلب جو مرکز کے حق میں تھا جو اگرچہ بہت زیادہ مضبوط نہیں لیکن کم سے کم کچھ زیادہ ہی تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان

کے وجود کو ایک ملک کی حیثیت سے یقینی بنانا۔ برائے نام نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اور اس کے لئے شیخ مجیب نے پہلے چھ نکاتی پروگرام کے بارے میں کہا تھا اور اسے ایوان میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ منظور کروانے کی اہلیت کا بھی۔

آئین کی تدوین کے سلسلے میں کچھ مزید بحث مباحثہ بھی ہوا اور آخر میں شیخ مجیب نے کہا۔ جناب عالی میری پارٹی آپ کو پاکستان کا آئندہ منتخب صدر بنانا چاہتی ہے اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ اس کے اہل ہیں کیونکہ آپ نے ملک میں جمہوریت بحال کی ہے۔ صدر نے جواب دیا کہ وہ ایک سپاہی ہیں اور یا تو وہ بیرک میں واپس جائیں گے یا پھر گھر۔ اسی اجلاس میں جنرل یحییٰ خان نے عوامی لیگ کو پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ وہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی ہے اس پر شیخ مجیب الرحمٰن نے پھر دہرایا کہ وہ یقیناً اس جماعت کا اور مغربی پاکستان کی دوسری جماعتوں کا بھی تعاون چاہیں گے اور کہا کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان اس حد تک خود مختاری نہیں چاہتا جس حد تک مشرقی پاکستان لیکن اس کے لئے بھی وہ ہر قسم کی مدد دینے کے لئے تیار ہیں اور مغربی پاکستان کے رہنما جو بھی انتظامات کرنا چاہیں گے وہ ان میں مداخلت نہیں کریں گے۔

یہ آخری فقرہ معنی خیز ہے اور ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اگر بیان کو محتاط انداز سے سمجھا جائے کہ "مغربی پاکستان اس حد تک خود مختاری نہیں چاہتا جس حد تک مشرقی پاکستان" تو اس کا واحد مطلب یہ ہوگا کہ مرکز کا مشرقی پاکستان کے مقابلہ میں مغربی پاکستان میں زیادہ سے زیادہ عمل دخل ہوتا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان مرکز میں اپنی اکثریت کے باعث تمام معاملات میں جو مغربی پاکستان سے متعلق مرکز کے دائرہ اختیار میں ہیں فیصلہ کن آواز رکھتا ہے وہ مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کے اس قسم کے معاملات میں کسی قسم کی رائے کہ مشاورتی رائے دینے کے حق سے بھی انکار کر سکتا ہے۔ یہ وفاق کا ایک قابل ذکر نظریہ ہے۔ مرکز میں عوامی لیگ کی اکثریت کے ساتھ اور اگرچہ سیاسی الحاق عام طور پر علاقائی بنیادوں پر ہوتا ہے مشرقی پاکستان کا مرکز میں مستقل اکثریت کو یقینی بنانا اہم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق مشرقی خطہ کے تعلق سے اس حد تک مرکزی اقتدار کے حصول کو ممکن نہیں سمجھتا جتنا کہ اسے بلاشک وشبہ مغربی خطے میں حاصل ہے۔ دوسری جانب جواب کا آخری حصہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ مغرب کے پاس ممکن ہے اس قسم کے آئینی انتظامات ہوں جو وہ چاہتا ہو۔ بالفاظ دیگر یہ اشارہ

تھا کہ مغربی پاکستان کے صوبے ممکن ہے صورت حال کے تناظر میں ایک سب فیڈریشن بنائیں لیکن اس کا مطلب حقیقت میں کچھ نہیں مغربی پاکستان کے صوبے سب فیڈریشن میں حقیقی یونٹ نہیں ہوں گے وہ مغربی پاکستان میں وفاق کے یونٹ ہوں گے جس کی فیڈریشن مشرقی پاکستان کے ساتھ مل کر کنفیڈریشن بنائے گی۔

تاہم خوشگوار ماحول میں یہ میٹنگ ختم ہوئی اور دوسرے روز ڈھاکہ ایئر پورٹ پر جنرل یحییٰ خان کے اس حوالے نے مزید تقویت بخشی کہ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کے آئندہ وزیراعظم ہوں گے۔ انہوں نے صدارت کی پیشکش کے معاملے کو اپنے دل میں کیا محسوس کیا اس کی کسی دوسرے مناسب موقع پر ذکر کیا جائے گا۔ سوائے یہ کہنے کے کہ ذہنی طور پر ہم پوری شہادت سے درگزر کرتے ہیں کہ جنرل یحییٰ خان حتمی ارادہ کئے ہوئے تھے کہ بجائے گھر جانے کے وہ بیرک میں واپس جائیں گے۔

ڈھاکہ سے صدر کراچی آئے اور 17 جنوری 1971ء کو جنرل حمید اور جنرل پیرزادہ کے ہمراہ مسٹر بھٹو سے ملاقات کے لئے لاڑکانہ گئے کہا جاتا ہے کہ جنرل حمید وہاں صرف شکار کی غرض سے گئے تھے اور جنرل پیرزادہ کی موجودگی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ وہ جنرل یحییٰ خان کے پرنسپل اسٹاف افسر تھے۔ الزام عائد کیا گیا اور اس کی تردید بھی کی گئی کہ فوج کے چوٹی کے جرنیلوں اور مسٹر بھٹو کے درمیان یہ ملاقات بڑی بدبختی کا پیش خیمہ تھی جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کو انتخاب جیتنے کی بنا پر اقتدار سے باہر کرنے کی سازش کی گئی۔ ہم اس میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھتے۔ یہ یقیناً ہو سکتا ہے کہ جنرل حمید حقیقتاً شکار کی غرض سے گئے ہوں اور یہ بھی درست ہو سکتا ہے کہ یہ محض سیاست ہوتا کہ اپنی موجودگی سے گریز کیا جا سکے۔ بھٹو اور جنرل یحییٰ خان کے درمیان اس وقت کی ملاقات سیاسی معلوم ہوتی ہے اور ضروری بھی تھی کیونکہ مؤخرالذکر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ جو ملاقات ہوئی اس میں صرف جنرل پیرزادہ یا سات دیگر جرنیل شامل ہوتے تو بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مسٹر بھٹو بہر حال فوج کے اعلیٰ عہدیدار سے مل رہے تھے۔

بھٹو کا موقف

اس ملاقات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ انہیں شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کرنے کے لئے کچھ وقت دیا جائے۔ ورنہ قومی اسمبلی میں شیخ مجیب الرحمٰن جو اپنی اکثریت کے بل پر چھ نکاتی پروگرام پر اڑے ہوئے ہیں ایسا آئین لانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کا مقصد پاکستان کی وحدت کا خاتمہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی چاہا کہ رائے عامہ کو ہموار کر سکیں تا کہ ان کی پارٹی اس قابل ہو سکے کہ چھ نکات کو اس شرط پر قبول کرنے گے لئے عوام کو تیار کرے کہ پاکستان کی وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جنرل یحییٰ کے ساتھ اس ملاقات میں مسٹر بھٹو نے اسمبلی کا اجلاس بلانے کی تجویز نہیں پیش کی بلکہ مناسب وقت چاہا اور اس کا اشارہ بھی دیا کہ وہ مارچ کے آخر تک ہو۔ جنرل یحییٰ خان کم و بیش اس سے متفق تھے۔ بعد ازاں مسٹر بھٹو پارٹی کے بعض ارکان کے ساتھ ڈھاکہ گئے جہاں 27 جنوری 1971ء کو وہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے۔

اس موقعہ پر جو گفتگو ہوئی اس کے لئے ہمارے پاس صرف مسٹر بھٹو اور ان کے بعض رفقاء کی شہادت موجود ہے اور شیخ مجیب الرحمٰن یا ان کی پارٹی کے دیگر ارکان کی شہادت کا موقع موجود نہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے بتایا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ان کی بات چیت کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن کا لہجہ کسی قدر سخت تھا اور چھ نکاتی پروگرام سے ہٹنے سے انہوں نے قطعی انکار کر دیا اور کسی بھی قسم کے استدلال کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ 15 فروری کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے پر بضد تھے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اور پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں بتایا کہ پارٹی کو بعض رعایات کے ساتھ چھ نکاتی پروگرام کو قبول کرنے کے لئے جس میں پاکستان کی بقا کی ضمانت ہو۔ اس کے لئے مغرب (مغربی پاکستان) میں رائے ہموار کرنے کے لئے کنویسنگ کی ضرورت ہے۔ شیخ مجیب نے اس مشکل کا اعتراف کیا لیکن قومی اسمبلی کے اجلاس کو 15 فروری سے مؤخر کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوئے۔ لہٰذا مسٹر بھٹو اپنے مشن میں ناکام ہوئے۔ لیکن انہوں نے اس کا اعلان پبلک میں نہیں کیا اور وہ ڈھاکہ میں کسی مصالحت کے بغیر

ہونے والی گفتگو پر خاموشی اختیار کی۔

اس کے بعد وہ جنرل یحییٰ خان سے راولپنڈی میں 11 فروری کو ملے اور انہیں اپنے مذاکرات کے نتائج سے آگاہ کیا۔ مسٹر بھٹو یہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا اسمبلی کے اجلاس کے التوا اور شیخ مجیب الرحمٰن کے فوری اجلاس بلانے کے مطالبہ میں جو اختلاف تھا صدر اس میں درمیانی راستہ نکال سکتے تھے اور دونوں فریقوں کو ایک ایسی تاریخ کا اعلان کر کے مطمئن کر سکتے تھے جس میں اتنا وقفہ مل سکے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو وہ وقت مل جاتا جو وہ چاہتی تھی۔ مسٹر بھٹو نے مزید کہا کہ انہوں نے جنرل یحییٰ خان پر واضح تاثر چھوڑا اور وہ ان سے متفق تھے کہ اسمبلی کا اجلاس مارچ 1971ء کے آخر میں بلایا جائے: تاہم جنرل یحییٰ نے مناسب خیال کیا اور اعلان کر دیا کہ اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو ہوگا۔

اس دوران مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کا اجلاس جلد بلانے کے لئے احتجاج شروع ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا اور اس میں عوامی لیگ کی انتخابی مہم کے دوران حکومت کی عدم مداخلت نے عوام کو مزید جرأت دلائی اور جب تک جنرل یحییٰ خان نے تاریخ کا اعلان کیا صورتحال مزید ابتر ہو گئی۔ 13 فروری کو یہ احساس بڑھ گیا کہ اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

بائیکاٹ کا اعلان

15 فروری کو اسمبلی کے اجلاس کا 3 مارچ کو ہونے کے اعلان کے چند دن بعد مسٹر بھٹو نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس بلائی۔ 3 مارچ کا اعلان ان کے لئے قطعی حیرت کا باعث تھا کیونکہ صرف دو روز قبل وہ جنرل یحییٰ خان سے ملاقات کر چکے تھے اور یہ تاثر دیا گیا تھا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس مارچ 1971ء کے آخر میں بلایا جائے گا۔ پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنی پارٹی کی پوزیشن ان خطوط پر بیان کی اور اعلان کیا کہ ان کی پارٹی 3 مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کرے گی جب تک کہ ان کے نقطہ نظر کو سنا نہ جائے اور اگر یہ مناسب ہو تو عوامی لیگ اسے منظور کرے۔ انہوں نے ہمارے روبرو یہ بیان کیا کہ نہ تو اس وقت اور نہ بعد میں کبھی قومی اسمبلی کا بائیکاٹ کرنے کا کہا۔ وہ عوامی لیگ سے چھ نکات پر صرف یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ وہ بھی مصالحانہ روش اپنائے۔ عوامی لیگ اور جنرل یحییٰ کے درمیان 7 جنوری

1971ء کو ہونے والی گفتگو سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے یہ گفتگو جس کی جنرل یحییٰ خان نے تصدیق کی اور 28 جون 1971ء کو نشر ہوئی۔ ہم نے خیال کیا کہ اس قسم کی یقین دہانی عوامی لیگ سے حاصل کرنا مشکل نہ ہوتا لیکن یہ ہوا کہ 15 فروری کے بعد سے پاکستان پیپلز پارٹی مسلسل کہتی رہی کہ عوامی لیگ سے مذاکرات کے لئے وقت دیا جائے اور یہ کہ اگر اس کی یقین دہانی نہیں کرائی جاتی تو ان کے لئے 3 مارچ کو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنا ممکن نہ ہوگا۔ 21 فروری کو پارٹی کے ایک کنونشن میں حلف لیا گیا کہ ارکان اسمبلی پارٹی کے فیصلوں کی پابندی کریں گے اور 3 مارچ کو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی جائے گی۔

بھٹو دھمکیوں پر اتر آئے

بالآخر 28 فروری 1971ء کو مسٹر بھٹو نے اس بات سے قطعی لاعلمی ظاہر کی کہ جنرل یحییٰ خان نے 22 فروری کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور 28 فروری کو شیخ مجیب الرحمٰن کو مطلع بھی کر دیا۔ لاہور میں ایک پر ہجوم جلسہ عام سے خطاب کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ نہ تو ان کی پارٹی ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرے گی نہ کسی کو مغربی پاکستان سے اس میں شرکت کی اجازت دے گی۔ انہوں نے دیگر پارٹیوں کو متنبہ کیا کہ اگر ان کے کسی رکن نے جانے کا فیصلہ کیا تو وہ ایسا یکطرفہ ٹکٹ پر کرے گا کیونکہ اسے مغربی پاکستان واپس آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اور یہ کہ ملک میں خیبر سے کراچی تک آگ لگا دی جائے گی۔ یہ درست ہے کہ اس اجلاس میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے متبادل تجاویز بھی پیش کیں کہ آئین کی تیاری کے لئے 120 دن کا مقرر کردہ وقت جو لیگل فریم ورک آرڈر میں متعین کیا گیا ہے اسے ختم کر دیا جائے لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جنرل یحییٰ خان اسے قبول نہیں کریں گے۔ مسٹر بھٹو کا رویہ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے 19 فروری 1971ء کو پریس کانفرنس میں دیا۔ ''ہم چھ نکاتی پروگرام کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لئے میلوں آگے گئے ہیں ہم نے مشرقی پاکستان کے دوستوں سے کہا کہ وہ کم از کم ہمارے نقطۂ نظر کی گنجائش کے لئے ایک انچ تو پیچھے ہٹیں''۔

13 فروری کو جب جنرل یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلایا اور یکم مارچ کو جب انہوں نے اسے ملتوی کیا کہ مغربی پاکستان میں دیگر سیاسی سرگرمیاں اور زیادہ حساس قسم کی

سرگرمیاں جاری رہیں ہمیں قومی سلامتی کونسل کے نمائشی سیکریٹری جنرل، جنرل عمر کے حوالے کا موقع ملا ہے جو حقیقتاً الیکشن کی مہم میں خفیہ طور پر فنڈز جمع کرنے اور تقسیم کرنے میں ظاہر ہے۔ جنرل یحییٰ خان اپنے سیاسی منصوبے کے تحت مشغول تھے۔ مختلف گواہوں کی شہادت واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس وقت وہ مغربی پاکستان کے بعض سیاستدانوں کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر آمادہ کرنے یا یہ مطالبہ کروانے پر مامور تھے کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ اس غرض سے جو لوگ ملاقات کے لئے آئے ان میں مسٹر دولتانہ اور خان عبدالقیوم خان شامل تھے۔ دیگر جن میں جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی شامل تھے نے ہمیں بتایا کہ جنرل یحییٰ خان اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مثال کے طور پر مولانا شاہ احمد نورانی واقعی ڈھاکہ گئے تھے پاکستان پیپلز پارٹی اس امر کا اعتراف کرتی ہے کہ اس کا یہ کہنا کہ دیگر کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ نہیں گئے۔ چونکہ التوا کا اعلان یکم مارچ کو ہو چکا تھا لہٰذا اس کے بعد جانا قطعی بے کار ہوتا۔ لیکن ہمارے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم جنرل یحییٰ یا جنرل عمر کی تردید کو دیگر شہادتوں کے مقابلے میں قبول کرتے۔ ہمارے خیال میں یہ واضح ہے کہ جنرل یحییٰ خان اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان کے ہاتھ مغربی پاکستان کے سیاستدانوں نے باندھ دیئے ہیں جو اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اگر یہ 3 مارچ کو منعقد ہوا۔

ایک پارٹی کو دوسری سے لڑانے کا کھیل

تاہم یہ کہنا کہ جنرل یحییٰ اور مسٹر بھٹو ایک دوسرے کے قریبی رابطہ میں تھے درست نہیں۔ ہم جنرل یحییٰ اور شیخ مجیب کے درمیان ملاقات کا حال تقریباً تفصیل سے بیان کر چکے ہیں جو جنوری کے آغاز میں ہوئی اور جنرل یحییٰ کی لاڑکانہ میں بھٹو سے ملاقات کا حال بھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا یہ بھی خیال تھا کہ حقیقت میں جنرل یحییٰ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے اس الزام کی تائید میں جو حقیقت بیان کی گئی کہ اس میں صدر کا یہ کہنا کہ انہیں چھ نکاتی پروگرام میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی اور پھر ڈھاکہ ائیرپورٹ پر یہ اعلان کہ شیخ مجیب الرحمٰن ملک کے آئندہ وزیراعظم ہوں گے اور اس کے علاوہ نجی طور پر کرسی صدارت پر متمکن رہنے کی پیشکش قبول کرنا وغیرہ۔ ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ اب تک جنرل یحییٰ خان مسٹر بھٹو یا شیخ

مجیب الرحمٰن کے ساتھ کسی دیگر چھوٹی پارٹی سے کم تعاون کر رہے تھے۔ وہ ایک پارٹی کو دوسری پارٹی کے خلاف لڑانے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اس کارروائی سے انہیں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس سے کہیں زیادہ جتنی شیخ مجیب کو پولنگ میں ہوئی۔ لیکن اس کا بالآخر جو نتیجہ جو نکلا اس سے پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے جو ایک افسوسناک واقعہ ہے۔ انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا اور جب اس میں تاخیر ہوئی تو کشیدگی بڑھنے لگی۔ 13 فروری کو قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو بلانے کے اعلان سے کشیدگی میں کمی ہوئی لیکن اس کے بعد یکم مارچ کو اس کے التوا سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ مغربی پاکستان نے اس اعلان کو حتمی گردانتے ہوئے کہ دیکھا جائے گا جو کچھ بھی ہو مجیب کو انتخابی نتائج کے ثمرات سے بہرہ مند نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس پر مشرقی پاکستان نے تشدد کا ردعمل دکھایا اور ڈھاکہ میں فسادات پھوٹ پڑے۔ فوج کو صورت حال سنبھالنے کے لئے طلب کر لیا گیا اور کچھ کارروائی کرنے کے بعد 48 گھنٹوں میں واپس بیرکوں میں بھیج دیا گیا اس کے بعد 25 مارچ 1971ء تک پھر فوجی کارروائی کی گئی اس وقت تک کسی سرکاری ایجنسی مثلاً پولیس یا پیرا ملٹری فورس یا ایسٹ پاکستان رائفلز پر امن و امان قائم کرنے کے لئے بھروسہ کرنا فضول تھا۔ اس تشدد کی لہر میں احساس اجاگر ہوا کہ بنگالی قومیت کی عسکری حیثیت کو بڑھاوا ملا۔ حالات پر قابو پانا ضروری تھا مگر صرف باقاعدہ مسلح دستوں سے یکم مارچ کے بعد تشدد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تحریک جلوسوں اور احتجاج تک ہی نہیں رہی بلکہ ان جلوسوں کی لوٹ مار ایک معمول بن گئی۔ تاجروں اور دکانداروں نے ہڑتالوں کے دوران اپنی دکانیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر انہیں بند کرنے پر مجبور کیا گیا اور ان دکانداروں کو اپنے مال سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری اور زیادتیوں کی وارداتیں معمول بن گئیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج محض تماشائی رہی اور ایک موقع وہ بھی آیا کہ فوج کو عملی طور پر بیرکوں میں بند کر دیا گیا اور وہ نہ تو سپلائی حاصل کر سکتے تھے نہ باہر نکل سکتے تھے۔

ہمارے سامنے یہ سوال بار بار اٹھایا گیا ہے اور جس سے ہمارا ذہن پریشان ہوا ہے وہ یہ کہ کس طرح کوئی حکومت امن و امان اور لوگوں کے جان و مال' آزادی کی حفاظت کے فرض کی ادائیگی سے کسی بہانے سے منہ موڑ سکتی ہے اور پھر بھی وہ خود کو حکومت کہلاتی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی جو توضیح کی گئی ہے وہ ایک مخصوص صورتحال کا اظہار کرتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مقامی

انتظامیہ یعنی مارشل لا انتظامیہ اور گورنر کو پنڈی سے کوئی بھی کارروائی کرنے سے روکا گیا تھا اور کسی بھی صورت میں مرکز کی واضح اجازت کے بغیر کسی بھی لیڈر کو گرفتار نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہ وہ وضاحت تھی کہ کیوں فوج کو 2 تاریخ کو ڈھاکہ طلب کیا گیا اور کچھ کارروائی کرنے کے بعد بیرکوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ اس امتناع کے پس پشت جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یحیٰی خاں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ مذاکرات کا ہر دروازہ کھلا رکھنا چاہتے تھے اور ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ شیخ ناراض ہو جائے اور وہ مذاکرات سے انکار کر دے۔ ہم اس وضاحت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے مقامی حکومت اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتی یہ مداخلت اور سیاسی تحریک کے امتناع سے باز رہنا ہے اور دوسرے کو تشدد کی اجازت دینے کے مترادف ہے۔ پہلی بات میں تو حکومت کی جانب سے عوام کی سیاسی خواہشات میں مداخلت کے انکار کا تاثر ملتا ہے دوسرے نمبر پر یہ حکومت کی لازمی کارکردگی اور اس کے بنیادی فرائض سے شرمناک پہلو تہی ہے در حقیقت حکومت کی جانب سے اس قسم کی عدم کارکردگی کے دو سنگین نتائج برآمد ہوئے۔

پہلے مرحلے میں جلد اور ٹھوس کارروائی کے لئے یہ ضروری تھا کہ ابتدا میں کم سے کم طاقت کا استعمال کیا جاتا جو کہ بعد میں کیا گیا اس سے سودمند اثرات مرتب ہوتے۔ مشرقی پاکستان میں متعین ایک سینئر فوجی افسر نے ہمیں بتایا کہ 7 مارچ 1971ء سے ایک روز قبل عوامی لیگ کی ایک اہم میٹنگ ہونے والی تھی جس کا ہمیں تذکرہ کرنا چاہئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بتایا گیا کہ حکومت پرامن سیاسی میٹنگ میں مداخلت نہیں کرے گی خواہ اس میں کتنا ہی سخت لہجہ استعمال کیا جائے لیکن اگر تشدد کی کوشش کی گئی یا ممکنہ یک طرفہ اعلان آزادی کیا گیا تو پھر سختی سے نمٹا جائے گا اور اس (فوجی افسر) کے مطابق اس وارننگ کا مطلوبہ اثر ہوا۔

دوسرے یہ کہ اس عدم توجہی سے عوام کا جذبہ وفاداری مجروح ہوا جو دوسری صورت میں علیحدگی کے بارے میں عوامی لیگ کی کوششوں کی مزاحمت کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ یقین نہیں کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت چہ جائے کہ اس کی پوری آبادی علیحدگی چاہتی تھی لیکن جب حکومت شہریوں کے تحفظ سے متعلق اپنے بنیادی فرض کی ادائیگی میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ کیا سوچے۔ کیا ان کو یہ سوچنے پر موردالزام قرار دیا جا سکتا ہے کہ حکومت سامان سمیٹ کر جانے کی تیاریاں کر رہی ہے؟ کیا حکومت تب بھی یہ توقع کر سکتی تھی کہ لوگ اس کے وفادار رہیں گے؟ حکومت کی

اس بے عملی سے عوام کا نہ صرف حکومت پر سے اعتماد کمزور ہوا بلکہ حکومت ان لوگوں کی حمایت سے بھی محروم ہو گئی جو نہ صرف ایک پاکستان کے حامی تھے بلکہ اس کے لئے قربانیاں دینے کو بھی تیار تھے۔ اس طرح وہ یا تو خوف کی وجہ سے مجیب کے ساتھ ہو گئے یا پھر ذہنی طور پر ان کی حمایت کرنے لگے۔

مصالحت کی کوشش پر گورنر فارغ

اس نکتہ پر ایڈمرل احسن کی توجیہہ یہ تھی کہ جب یکم مارچ کو التواء کا اعلان ہوا تو انہوں نے فوری طور پر صدر کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ جنرل یعقوب نے بھی ان کے خیال کی تائید کی کہ سیاسی حل سے ہی مسئلہ سلجھ سکتا ہے لیکن دوسرا واحد متبادل حل فوجی کارروائی تھا اور اس بھرپور آپریشن سے سیاسی مذاکرات کا دروازہ حتمی طور پر بند ہو گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اگر مجیب الرحمٰن کو راہ راست پر لانے کی تمام امیدیں ختم ہو جاتیں تب فوجی کارروائی کی جاتی اور تشدد کو روکنے' عوامی لیگ کی طرف سے لوگوں کو روزمرہ کے کاروبار کو زبردستی بند کرانے پر مجبور کرنے پر یہ کارروائی محدود پیمانے پر کی جاتی اور پرامن مظاہروں کو روکنے کی کوشش سے احتراز کیا جاتا لیکن یہ نہ تو ایڈمرل احسن اور نہ جنرل یعقوب کے لئے قابل عمل تھا۔ اس لئے ایڈمرل نے راولپنڈی فون کر کے صدر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ جنرل پیرزادہ سے رابطہ قائم کر سکے جنہوں نے انہیں کراچی فون کرنے کا مشورہ دیا جہاں صدر کا قیام تھا کراچی میں بھی وہ صرف جنرل عمر سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جنہوں نے بتایا کہ صدر مصروف ہیں لیکن وہ صدر تک ان کا پیغام پہنچا سکتے ہیں پھر انہوں نے جنرل حمید سے بات کی جنہوں نے سیاسی صورت حال کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی جب ان سے جنرل یعقوب سے بات کرنے کا کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد ایڈمرل احسن کو بتایا گیا کہ انہیں فارغ کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے چارج جنرل یعقوب کے حوالے کیا اور 4 مارچ کو ڈھاکہ سے روانہ ہو گئے۔

یکم مارچ کے بعد فوجی کارروائی کے امکان کے بارے میں جنرل یعقوب کا خیال تھا کہ یہ کارروائی محدود پیمانے پر کی جائے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ان کی یہ سوچ وہی تھی جس انداز میں ایڈمرل احسن نے سوچا تھا انہوں نے بھی سیاسی حل کے لئے کہا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ

صدر کو فوری طور پر ڈھاکہ آنا چاہئے انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ سیاسی حمایت کے بغیر کوئی بھی حکومت صورت حال پر قابو نہیں پا سکتی اور اس بات پر زور دیا کہ اس طرح کی حکومت صدر کی منظوری اور حکم سے ہی قائم ہو سکتی ہے حالانکہ انہوں نے یہ بات کھل کر نہیں کہی لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ مجیب یا ان کے نامزد رکن کی سربراہی میں صوبائی حکومت کا قیام فوری طور پر عمل میں لایا جائے لیکن یہ مشورہ بھی مسترد کر دیا گیا اور انہوں نے 4 مارچ کو فون پر استعفیٰ دے دیا اور 5 مارچ کو اشارتاً یہ اعلان کیا کہ وہ چارج میجر جنرل خادم حسین راجہ کے حوالے کر رہے ہیں جس پر ان سے کہا گیا کہ وہ اپنا جانشین آنے تک انتظار کریں۔ 7 مارچ کو لیفٹیننٹ جنرل (اب جنرل) ٹکا خان کی آمد پر وہ ڈھاکہ سے روانہ ہو گئے۔

ایک سو بیس دن پر اصرار

اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ راولپنڈی سے کسی قسم کا حتمی حکم جاری نہیں ہوا تھا کہ جس سے ایڈمرل احسن یا جنرل یعقوب کو یکم مارچ کے بعد ہنگامے اور تشدد کو روکنے کیلئے کسی قسم کی کارروائی نہ کرنے کے لیے کہا گیا ہو۔ یہ سچ ہے کہ احسن یکم مارچ کو مستعفی ہو گئے تھے اور اس طرح وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس کے بعد وہ کارروائی کریں یا نہ کریں لیکن ہم نے دیکھا کہ ان کے خیالات وہی تھے جن سے متاثر ہو کر جنرل یعقوب نے بھی کارروائی سے گریز کیا یہ درست ہے کہ مقامی حکام سے کہا گیا تھا کہ مذاکرات کے لئے دروازے کھلے رکھیں اور اعلیٰ سیاسی لیڈروں کو اجازت کے بغیر گرفتار نہ کریں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امن وامان قائم رکھنے کے لئے کارروائی نہ کی جائے جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ دوسرے سینئر افسر کو (اگرچہ اسکے عہدہ کم تھا اور جنرل یعقوب کے زیر کمان تھا) 7 مارچ کو مداخلت کرنے سے نہ روکا گیا لہٰذا ہم اس بات پر متفق نہیں ہو سکتے کہ جنرل یعقوب کو صدر نے اپنے عام فرائض کی ادائیگی سے روکا یا وہ اپنے اس خیال میں درست تھے کہ اگر کارروائی کی گئی اور اس پیمانے پر کی گئی تو خانہ جنگی کا خطرہ ہے۔ باوجود اس کے ہم اس شبہ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ راولپنڈی میں حکام اس عجیب و غریب بے عملی میں مبتلا تھے اگرچہ جنرل یحییٰ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جنرل یعقوب نے بزدلی دکھائی ہے اس لئے ان کی جگہ جنرل ٹکا خان کو بھیجا گیا تھا اور مؤخر الذکر نے بھی 25 مارچ تک اسی پالیسی پر عمل کیا اس کے بعد ہی بھرپور فوجی کارروائی شروع ہوئی۔

جنرل یحییٰ کا دعویٰ تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے رویہ کے پیش نظر اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے میں انہیں کوئی نکتہ نظر نہیں آیا جہاں مغربی پاکستان سے ایک بھی ممبر بمشکل اجلاس میں شریک ہوتا اس لئے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اجلاس کے التواء کا اعلان کریں تاہم پاکستان پیپلز پارٹی نے اسمبلی کے اجلاس کے التوا کو واحد راستہ کے طور پر پیش نہیں کیا تھا اس نے دو متبادل تجویزیں پیش کی تھیں یا تو اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا جائے یا پھر 120 دن کی مدت ختم کی جائے یا پھر اس کی مدت میں اضافہ کیا جائے۔ جنرل یحییٰ آخر الذکر کو بحال کر سکتے تھے لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر 120 دن کی مدت کی شق ابتدا سے ہی ان کے لئے مقدس رہی اور انہوں نے نرمی نہ کرنے کا اعتراف کیا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان کے پاس اسمبلی کے التوا کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا تو جنرل نئی تاریخ مقرر کر سکتے تھے اور انہیں ایسا کرنا چاہئے تھا۔ انہیں مشرقی پاکستان سے متواتر یہ مشورے مل رہے تھے کہ اسمبلی کا التوا اور خاص طور سے غیر معینہ مدت کے لئے التوا کا خراب اثر پڑے گا۔

یکم مارچ کو اسمبلی کے التوا کے اعلان کے بعد یہ ظاہر ہے کہ جنرل یحییٰ کو اپنی پہلی فرصت میں مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے لئے فوری قدم اٹھانا چاہئے تھا اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں کچھ پہلے کے واقعات کا حوالہ دینا چاہئے جس کی وجہ سے یحییٰ خان اسمبلی کے التواء کے اعلان کے بعد کسی قریبی تاریخ میں دورہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ فروری 1971ء کے پہلے ہفتے میں صدر نے ڈھاکہ کو ایک پیغام ارسال کیا تھا جس میں مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کو راولپنڈی آنے کی دعوت دی تھی۔ گورنر احسن نے یہ پیغام مجیب الرحمٰن کو پہنچا دیا لیکن مجیب الرحمٰن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ انہوں نے اپنی پارٹی کے ایم این اے اور ایم پی ایز کی کانفرنس طلب کی ہے گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یعقوب کی طرف سے شیخ مجیب الرحمٰن کو جانے کے لیے آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی اور ان پر یہ بھی واضح کیا گیا کہ صدارتی دعوت نامہ ہمیشہ فرمان کا درجہ رکھتا ہے جس سے انکار شائستگی کے منافی ہے اور اس سے صدر کے وقار کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں سیاسی مسائل کے دوستانہ حل کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے: تاہم مجیب الرحمٰن نے قطعی انکار کر دیا اور اس کشیدگی میں یقینی طور پر اضافہ ہوا کیونکہ اس وقت تک اسمبلی کے اجلاس کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی۔

تاہم چند روز بعد صدر کی جانب سے ایک تار موصول ہوا جس کا متن مندرجہ ذیل

ہے۔

''مجیب الرحمٰن سے کہہ دیا جائے کہ راولپنڈی آنے کے لئے میری دعوت کو مسترد کرنے سے میں بہت زیادہ غیر مطمئن ہوں اگر وہ جلد از جلد راولپنڈی آنے کا انتظام نہیں کرتے تو اس سے جو سخت نتائج برآمد ہوں گے اس کی مکمل ذمے داری خود ان پر عائد ہوگی''۔

ہم اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مجیب الرحمٰن کے لئے سیاسی اور شائستہ رویئے کے اعتبار سے راولپنڈی آنا مناسب تھا اور یہ کہ انکار کرنے سے بے شک صدر کا وقار مجروح ہوا لیکن تار کے مندرجات اور جو لہجہ اختیار کیا گیا وہ نہ صرف غیر مدبرانہ تھا بلکہ وہ وقار اور سوجھ بوجھ کے بھی منافی تھا جو مملکت کے سربراہ کے لئے ضروری ہے۔ گورنر احسن سے کہا گیا کہ وہ اس تار کو مجیب الرحمٰن کو پڑھ کر سنائیں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی موجودگی میں اس کے حوالے کریں۔ گورنر جو ابتدا سے ہی شیخ سے سیاسی تصفیے پر زور دیتے رہے تھے اور ان پر مجیب کی جانب نرم رویہ اختیار کرنے کا شبہ کیا جانے لگا تھا ان کے احساسات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ راولپنڈی سے انتہائی جذباتی انداز میں رابطہ قائم کرتے رہے اور انہیں بتایا کہ اس سے صرف مجیب کے غصہ میں اضافہ ہوگا آخرکار بالکل آخری وقت میں انہیں یہ ہدایت موصول ہوئی کہ اس پیغام کو روک دیا جائے۔

22 فروری 1971ء کو صدر نے گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کا اجلاس طلب کیا جس میں اعلیٰ فوجی اور سول افسران نے بھی شرکت کی اس طرح کے اجلاس یحییٰ حکومت ہر ماہ طلب کیا کرتی تھی۔ اس اجلاس میں بھی حسب معمول صدر نے صورت حال کا جائزہ اور شیخ مجیب الرحمٰن کے غیر مصالحانہ اور سخت رویہ کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس صورت حال میں اسمبلی کوئی کارآمد مقصد حاصل نہیں کر سکے گی۔ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب ہی وہ شخص تھے جنہوں نے صدر سے اتفاق کرنے والوں کی بجائے بہت حد تک اختلافی باتیں کیں لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ مشرقی پاکستان سے پیدا ہونے والے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی اس میں اس بازو سے وہ نہ صرف افسر بلکہ اس علاقے سے حکومت کے اعلیٰ ترین نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے خیالات کو زیادہ احترام کے ساتھ سنا جانا چاہئے تھا: تاہم صدر ان دونوں کو جنرل حمید گل اور جنرل پیرزادہ کے ساتھ علیحدگی میں لے گئے اور وہاں انہیں اسمبلی کے

التوا کے بارے میں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ ایڈمرل احسن نے اس اجلاس سے جو تاثر حاصل کیا اس کے بارے میں بتایا کہ اس اجلاس میں آئین کی تیاری کے لئے 120 دن کی جو مدت مقرر کی گئی ہے بعض وجوہات کی بنا پر اس میں کمی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کسی بھی صورت میں اس شق کو نرم کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ انتہائی ضروری تھا کہ اس اجلاس کے بجائے تمام اختلافات اسمبلی کے اجلاس سے قبل طے کرتے جاتے تھے۔ صدر کو واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ اس طرح کے اعلان سے پہلے سے بھڑکے ہوئے جذبات میں مزید اضافہ ہوگا یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ صدر نے اسمبلی کو یکم مارچ کو ملتوی کیا لیکن انہوں نے یہ فیصلہ کم از کم 22 فروری کو ہی کر لیا تھا۔

یکم مارچ کو اسمبلی اس واحد مقصد کے حصول کے لئے ملتوی کی گئی تھی کہ اجلاس سے قبل مذاکرات ہوں اور مسٹر بھٹو اور مجیب الرحمٰن کے درمیان ایک طرح کا تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ صدر کو ان دونوں حضرات سے فوری ملاقات پر غور کرنا چاہئے تھا تاکہ مصالحت کو یقینی بنایا جا سکے۔ مسٹر بھٹو کم از کم اس وقت تک جنرل یحییٰ یا شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے کے لئے آمادہ نہیں تھے اس لئے جنرل یحییٰ کو شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کرنی چاہئے تھی، لیکن کم از کم 4 مارچ تک انہیں ایسا کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششوں کے باوجود صدر نے قطعی انداز میں کہہ دیا کہ وہ ڈھاکہ جانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صرف یہ رعایت دے سکتے ہیں کہ اسمبلی کے لئے کسی نئی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسمبلی کے اجلاس کے لئے نئی تاریخ کے اعلان کا وہ اثر نہیں ہوا جو اسمبلی کے التوا کے وقت نئی تاریخ مقرر کرنے کے اعلان سے ہوتا اور جب نئی تاریخ کا اعلان کیا گیا تو شیخ مجیب الرحمٰن نے فوری ردعمل کے طور پر حسب ذیل چار مطالبات پیش کر دیئے تاکہ عوامی لیگ اجلاس میں شرکت کرنے یا نہ کرنے پر غور کر سکے۔

1- مارشل لا کا فوری خاتمہ۔

2- فوجیوں کی اپنی بیرکوں میں فوری واپسی۔

3- انسانی جانوں کا تحفظ۔

4- عوام کے منتخب نمائندوں کو قومی اسمبلی کے اجلاس سے قبل اقتدار کی فوری منتقلی۔

جب ہم نے جنرل یحییٰ خان سے یہ پوچھا کہ آیا انہوں نے اسمبلی اجلاس کے غیر معینہ مدت تک التوا کو غیر مناسب نہیں سمجھا تو انہوں نے کہا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں ایسا

کرنے کا ملزم کیوں گردانا جا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے یکم مارچ کو اسمبلی ملتوی کی تھی اور 6 مارچ 1971ء کو اسمبلی کے لئے 25 مارچ کی تاریخ مقرر کی تھی۔ یہ تبصرہ غیر ضروری ہے۔

اس کے بعد جنرل یحییٰ خان نے رہنماؤں کی دس مارچ کو ایک کانفرنس بلائی، شیخ مجیب نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا اس کے بعد یحییٰ خان نے اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ 25 مقرر کی۔ جنرل یحییٰ خان 15 مارچ کو ڈھاکہ پہنچے اور اسی روز شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے ان کے ہمراہ ان کے تمام مشیر نہیں آئے تھے اس کے بعد جو مذاکرات ہوئے ان کی پیچیدگی سب کے لئے باعث دلچسپی ہے۔ جنرل یحییٰ خان نے مختلف پارٹیوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنرل یحییٰ خان ان پارٹیوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کر رہے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ برسر اقتدار ہوں اور وہ انتقال اقتدار کے لئے پارٹیوں سے مذاکرات کر رہے ہوں۔ بہر حال شیخ مجیب الرحمٰن خود اور مسٹر زیڈ۔ اے۔ بھٹو بھی سوائے ایک موقع کے ایک دوسرے سے نہیں ملے نہ وہ بیک وقت صدر سے ملے۔ مذاکرات کا پہلا دور اس وقت شروع ہوا جب شیخ مجیب الرحمٰن 15 مارچ 1971ء کو جنرل یحییٰ خان سے ملے۔

اس دوران امن و امان کی صورت حال حکام کے قابو سے قطعی باہر ہو گئی اور مرکزی حکومت مفلوج ہو گئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن بتدریج حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے ہدایات جاری کرنے کا سلسلہ شروع کیا جن میں اولین 7 مارچ 1971ء کو جاری کی گئی۔ اس میں ایک ہفتے کے پروگرام کا اعلان کیا گیا جسے عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کا نام دیا گیا جسے مارچ سے شروع کر کے مقاصد کے حصول تک جاری رکھنے کا اعلان تھا جس کا مطلب مارشل لا کا خاتمہ اور منتخب نمائندوں کو انتقال اقتدار کا حصول تھا اور یہاں اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

1- کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔

2- سیکریٹریٹ سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر، اعلیٰ عدالتیں اور دیگر عدالتیں پورے بنگلہ دیش میں ہڑتال میں شامل ہوں گی۔

3- ریلوے اور بندرگاہیں کام کرتی رہیں گی مگر ریلوے کارکن اور بندرگاہ کے کارکن اگر ریلوے اور بندرگاہوں کی فوجیوں کی نقل و حرکت کو عوام کے خلاف استعمال کرنے کے لئے استعمال کیا جائے تو ہرگز تعاون نہ کریں۔

4- ریڈیو ٹیلی وژن اور اخبارات ہمارے بیانات کا مکمل متن دیں گے اور عوامی تحریک کی خبروں کو کسی قیمت پر چھپایا نہیں جائے گا ورنہ بنگالی کارکن تعاون نہیں کریں گے۔

5- صرف مقامی اور بین الاقوامی ٹرنک ٹیلیفون کام کریں گے۔

6- تمام تعلیمی ادارے بند رہیں گے۔

7- مربی پاکستان بینکوں کے ذریعے رقم نہیں بھیجی جاسکتی سٹیٹ بنک کے ذریعے بھی نہیں جاسکتی۔

8- تمام عمارتوں پر سیاہ پرچم ہر روز لہرائے جائیں گے۔

9- مکمل ہڑتال کا کسی بھی لمحے اعلان کیا جاسکتا ہے جس کا انحصار صورت حال پر ہے۔

10- ہر یونین' محلہ' تھانہ' سب ڈویژن اور ضلع میں مقامی عوامی لیگ یونٹ کی قیادت میں سرنام پریشد قائم کیا جائے گا۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہدایت جاری ہوتی رہی جس کا مقصد صوبے میں مع سرکاری دفاتر اداروں پر مکمل کنٹرول رکھنا تھا۔ عام طور پر سرکاری ایجنسیوں بشمول عدالتوں کو کام کرنے سے روک دیا گیا مگر اس میں محدود استثنیٰ رکھا گیا تا کہ انتہائی ضروری کام کئے جاسکیں بینکوں کے اوقات کار کو کم کر دیا گیا۔ صوبہ اور بیرونی دنیا کے درمیان لین دین خاص طور پر مغربی پاکستان سے مکمل طور پر ممنوع کر دیا گیا یہاں تک کہ ذاتی کھاتوں کو بھی بڑی محدود حد تک آپریٹ کرنے کی اجازت دی گئی۔ صوبائی ٹیکسوں کی ادائیگی اور مرکزی ٹیکسوں کی ادائیگی جاری رکھی گئی مگر مرکزی ٹیکس کو مرکزی حکومت کے پاس جمع کرانے کی بجائے ایسٹرن مرکنٹائل بینک لمیٹڈ اور ایسٹرن بینکنگ کارپوریشن لمیٹڈ کے خصوصی اکاؤنٹ میں جمع کرانے کی ہدایت کی گئی۔

شیخ کی ہدایات پر عمل کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے حکومت کی جگہ لے لی۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوا کہ ایک ایسی حکومت جس میں شہریوں کے جان و مال' آزادی' عزت محفوظ ہو اس کی جگہ قائم ہوگئی ہے۔ مظاہرے اور ہڑتالیں جاری رہیں۔ پرامن طریقوں سے نہیں بلکہ تشدد آمیز۔ عوام عام طور پر اور پارٹی کے کارکن قتل' لوٹ مار اور املاک کی تباہی میں مصروف ہو گئے۔ متعدد شہادتیں جن میں مشرقی پاکستان میں جو حکومت میں ذمے دار عہدوں پر یا زندگی میں بہتر پوزیشن کے رکھنے والے شامل (مثال کے طور پر گواہ 680 -159) نے بیان

کیا کہ گولہ بارود اور ہتھیار اسمگل ہو کر آتے تھے اور پہلے پہل تھوڑی تعداد میں خفیہ طور پر حاصل کئے جاتے تھے لیکن بعد ازاں کھلے عام بہت بڑی تعداد میں' جو لوگ ہڑتال کی کال پر اپنی دکانیں بند کرنے سے انکار کرتے انہیں سزا دی جاتی۔ یہاں تک کہ قتل کر دیا جاتا۔ عام طور پر اگرچہ شیخ مجیب الرحمٰن پورے طور پر حاوی تھے باغیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور بے انتہا ظلم و تشدد غیر بنگالیوں پر کیا گیا۔

انتقال اقتدار کی شرائط

صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ملاقات کے پہلے دور کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن کی تجاویز یہ تھیں۔

1- مارشل فوراً اٹھایا جائے۔

2- قومی اسمبلی بحیثیت آئین ساز اسمبلی اور قانون ساز ادارے کے طور پر کام شروع کر دے۔

3- اقتدار فوری طور پر قومی اور صوبائی سطح پر منتقل کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہمارے پاس واحد شہادت جنرل یحیٰی خان کی ہے جن کا بیان کسی حد تک الجھا ہوا ہے بہر حال کسی بھی صورت میں صدر کے مشیر اور عوامی لیگ والوں کے ساتھ 17 مارچ کی ملاقات میں یہ تجاویز زیر غور تھیں جو مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کے ساتھ خاص طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ اتفاق رائے سے جاری کی گئیں۔ جنرل یحیٰی خان سوائے مارشل لا اٹھانے کے باقی باتوں پر رضامند نظر آتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مارشل لا اٹھانے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا کیونکہ مارشل لا اس وقت اقتدار کا واحد ذریعہ تھا۔ ہم اس دلیل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مارشل لا خود جنرل یحیٰی خان نے نافذ کیا تھا اور اسی شخصیت کی جانب سے اعلان کرنے کا مطلب اسمبلی کی دو بڑی جماعتوں کی رضامندی قرار دیا جاتا جو آئین سازی کی دلیل ہے اور اس کے ساتھ وہ اسمبلی جو فوری طور پر کام شروع کرتی اس کے پاس یقیناً کم از کم قانونی اتھارٹی موجود تھی۔

ہم واقعات کا بیان پھر کرتے ہیں۔ دونوں جانب کے مشیروں نے ایک دوسرے سے ملاقاتیں جاری رکھیں یہاں تک کہ 20 مارچ کو انہوں نے یہ ملاقات جنرل یحیٰی خان اور شیخ

مجیب الرحمٰن کی موجودگی میں اس وقت کی جب یہ سوال زیر بحث آیا۔ صدر کی جانب سے ان تجاویز پر عملدرآمد مارشل لا ریگولیشن کے تحت کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک حتمی اعلان پر اتفاق رائے ہوگیا اور مشیروں کو اس اعلان کی زبان اور دیگر عوامل پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے ملاقات جاری رکھنے کا کہا گیا۔ اس ملاقات میں یہ بھی طے ہوا کہ قومی اسمبلی کی دو کمیٹیاں جن میں سے ایک مشرقی پاکستان کے ارکان پر مشتمل ہوگی اور دوسری مغربی پاکستان کے ارکان پر قائم کی جائیں۔ 21 مارچ کو صدر کے پرنسپل اسٹاف افسر جنرل پیرزادہ نے کرنل حسن کو بتایا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اب چاہتے ہیں کہ صوبائی حکومتیں قائم کی جائیں اور جنرل یحییٰ مرکز میں بحیثیت صدر قائم رہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی دوران ان کے اور جنرل یحییٰ کے درمیان ایک اور ملاقات ہوئی اور اس میں یہ تجاویز زیر بحث آئیں۔

1- مارشل فوراً اٹھایا جائے۔

2- اقتدار پانچوں صوبوں کو منتقل کیا جائے۔

3- مرکز میں فی الحال انتقال اقتدار نہ کیا جائے۔

4- قومی اسمبلی میں دو کمیٹیاں بنائی جائیں ہر ونگ کے لئے ایک۔

5- یہ کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہو اس کے بعد مکمل طور پر اور ان دونوں کمیٹیوں کی رپورٹ کے مطابق آئین تیار کیا جائے یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب تک قومی اسمبلی کا اجلاس مکمل طور پر نہیں ہوتا مشرقی پاکستان کو چھ نکات کی بنیاد پر خودمختاری حاصل رہے گی مگر مغرب پر اب بھی 1962ء کے آئین کے تحت اقتدار کی تقسیم کے مطابق حکومت کی جائے گی۔

ان تجاویز پر جنرل یحییٰ خان پاکستان پیپلز پارٹی کے اتفاق کی شرط پر رضامند ہو گئے اور اگر ممکن ہوا تو مغرب کی تمام دیگر پارٹیوں کے اتفاق رائے سے۔ مسٹر بھٹو کو 19 تاریخ کو اس سلسلے میں ایک پیغام بھجوایا گیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن ان سے گفتگو کرنے پر تیار ہیں اور یہ کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے جلد از جلد ڈھاکہ پہنچیں۔

مذاکرات کی ناکامی اور آرمی ایکشن

مسٹر بھٹو 21 کو بعد دوپہر ڈھاکہ پہنچے اور اسی شام ساڑھے سات بجے صدر سے ملاقات کی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے مطابق تجاویز ایسی تھیں کہ انہیں قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنیادی طور پر اس لئے کہ دو سیکشنوں میں اسمبلی کے اجلاس کا خیال قطع نظر عملی نتائج کے جو اس سے برآمد ہوتے اصولی طور پر کنفیڈریشن کے نظریہ کا حامل تھا۔ اگرچہ حقیقی معنوں میں دو الگ الگ ملکوں کا نہیں تھا۔ اس رات مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور اگلے روز صبح وہ ایوان صدر جنرل یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے گئے۔ اور ایسا ہوا کہ مسٹر بھٹو مقررہ وقت سے چند منٹ پیشتر پہنچے جب کہ شیخ مجیب الرحمٰن ٹھیک وقت پر پہنچے۔ اس موقع پر ممکن تھا کہ ان دونوں میں چند الفاظ کا تبادلہ ہوتا جس میں ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا جاتا قبل اس کے کہ انہیں صدر کے پاس لے جایا جاتا ان تین افراد میں سے جو اس میٹنگ میں حاضر تھے۔ دو نے مسٹر بھٹو اور جنرل یحییٰ خان نے ہمارے روبرو گواہ کی حیثیت سے وضاحت کی اور دونوں نے اس امر پر اتفاق کیا کہ اس موقع پر شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر بھٹو کے درمیان قطعی کوئی بات نہیں ہوئی۔ عوامی لیگوں نے ڈھاکہ ایئر پورٹ پر مسٹر بھٹو سے جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے اس پر معذرت نہیں کی حالانکہ عوامی لیگ نے مسٹر بھٹو کی سیکورٹی کے تمام انتظامات سنبھال رکھے تھے گویا وہ ان کے مہمان تھے۔ افسوس کہ اس واقعے کو مسٹر بھٹو نے یہ کہہ کر درگزر کر دیا کہ یہ بات کوئی اتنی اہم نہیں تھی اور اصل بات جو وزن رکھتی ہے وہ یہ کہ جلد اور باہمی اتفاق سے کسی حل پر پہنچا جائے۔ مسٹر مجیب الرحمٰن کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے صدر کی جانب رخ کر کے پوچھا کہ کیا عوامی لیگ کی تجاویز کی توثیق کر دی گئی ہے؟ اور مؤخر الذکر نے یہ کہا کہ یہ ضروری ہے کہ مسٹر بھٹو بھی اس کے لئے رضامند ہوں جن کو انہوں نے اس غرض کے لئے بلایا ہے۔ شیخ مجیب

الرحمٰن نے یہ رویہ اختیار کیا کہ تجاویز جنرل یحییٰ کو پہنچادی گئی ہیں اور اب یہ ان پر ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کو قائل کریں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اس تمام عرصہ میں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا؛ تاہم اس بات پر مصر رہے کہ جنرل یحییٰ خان ان کے اور مسٹر بھٹو کے درمیان بات چیت کا رابطہ بنیں۔

یحییٰ خاں کی رائے

دونوں پھر صدر سے رخصت ہوئے بڑے شائستہ اور خوش خلقی سے؛ تاہم صدر کافی متجسس رہے۔ اس موقع پر کمرے میں ملٹری سیکرٹری جنرل محمد اسحٰق صدر کے بحریہ کے اے ڈی سی اور جنرل محمد عمر بھی موجود تھے۔ شیخ نے اپنے ساتھیوں سے جانے کے لئے کہا کیونکہ وہ مسٹر بھٹو سے علیحدگی میں بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسٹر بھٹو کو بتایا کہ صورت حال بڑی گمبھیر ہو چکی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس سے نکلنے کے لئے مسٹر بھٹو ان کی مدد کریں۔ ان کو یہ بھی خوف تھا کہ ممکن ہے کہ کمرے میں خفیہ آلات نصب ہوں اس لئے وہ دونوں برآمدے میں چلے گئے اور پورٹیکو میں صدر کے سیلون کی پشت پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے وہ جنرل یحییٰ خان کو نظر آتے تھے جنہوں نے بعد میں یہ جملہ کہا کہ "دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنی مون منا رہے تھے" ان دونوں رہنماؤں کے درمیان بات چیت کا خلاصہ یہ تھا کہ مجیب الرحمٰن نے اس امر پر اصرار کیا کہ آغاز میں دو کمیٹیاں تشکیل دی جائیں اور چونکہ قومی اسمبلی کے بحیثیت ایک ادارہ کا اجلاس قطعی ناممکن ہے اسے غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا جائے۔ مسٹر بھٹو نے جواب دیا کہ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ میں خود ایوان سے باہر مذاکرات کے لئے اور اسمبلی کے اجلاس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے کے لئے کہتا رہا ہوں اور اب یہ کہ شیخ مجیب الرحمٰن خود قومی اسمبلی کے اجلاس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے تجاویز پر غور کرنے کا وعدہ کیا مگر کہا کہ ان کی حتمی رائے یہ ہے کہ یہ تجاویز جو بھی حتمی صورت اختیار کریں ان کو قومی اسمبلی سے ضرور منظور کروانا ہوگا خواہ یہ قرارداد کی صورت میں صدر کو اعلان جاری کرنے کا اختیار دینے کے لئے ہوں۔ تاہم مجیب الرحمٰن اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اسمبلی کا اجلاس مختصر عرصے کے لئے بھی نہیں ہوگا اور یہ بات واضح طور پر معاملہ کی اصل روح سے متصادم تھی کہ بالآخر آئینی انتظامات کیا ہوں گے۔ مسٹر بھٹو اور مجیب الرحمٰن کے درمیان آیا قومی اسمبلی کا اجلاس پہلے موقع پر ہو یا نہ ہو واضح اختلاف پایا جاتا تھا۔ یہ مجیب الرحمٰن اور مسٹر زیڈ۔ اے بھٹو کی آخری اور ایک ہی ملاقات تھی

ان مذاکرات کے دوران اور ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ان کی پہلی ملاقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تھا کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ واحد حقیقی ملاقات تھی جو دونوں کے درمیان ہوئی۔

بے مقصد مذاکرات

آئندہ تین روز میں صدر کے مشیروں کی جن میں مسٹر جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلس مشیر قانون، ایم۔ ایم۔ احمد۔ اقتصادی مشیر، پرنسپل اسٹاف افسر جنرل پیرزادہ اور جج ایڈووکیٹ جنرل کے محکمہ کے کرنل حسن اور پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے ساتھ الگ الگ بحث و تمحیص جاری رہی۔ ان میٹنگوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہے۔ انہیں مذاکرات کہنا درست نہیں یہ کسی ایک یا دوسری اسکیم پر عملدرآمد پر تبادلۂ خیال تک محدود تھیں اور یہ کسی بھی نقطہ نظر سے قطعی غیر اطمینان بخش تھیں۔ ایک سے زیادہ مواقع پر ایسا ہوا کہ صدر کی ٹیم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو اس دوران کسی نکتہ پر بحث شروع ہوئی جس پر عوامی لیگ کے نمائندے یہ کہتے کہ یہ نکتہ صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان طے ہو چکا ہے۔ چونکہ صدر اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان تبادلہ خیال کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہے اس لئے یہ بڑا مشکل ہے بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش بے کار ہے کہ کون درست تھا اور یہ صرف اس تمام غیر اطمینان بخش طریقہ کو محض نمایاں کرنا ہوگا جس سے یہ مذاکرات ہوئے۔

مجیب الرحمٰن کو جنرل یحییٰ کی پیش کش

اس کے علاوہ صدر اور مغربی پاکستان کے دوسرے رہنماؤں کے درمیان بھی بات چیت ہوئی مثال کے طور پر خان عبدالولی خان، میاں ممتاز محمد دولتانہ، سردار شوکت حیات خان، مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی کے ساتھ اور ان کے اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان بھی بات چیت ہوئی جبکہ یہ رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بلاشبہ زیادہ دوستانہ جذبات رکھتے تھے اور کسی حد تک ان کی تجاویز سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب بھی کنفیڈریشن کے نظریہ کو قبول کرنے کی حد تک نہیں جا سکتے تھے جس کا واضح مطلب علیحدگی ہوتا۔ تمام متعلقہ افراد کے مشترکہ اجلاس کی عدم موجودگی میں یہ بات واضح نہیں کہ کون سی تجویز کس طرف سے آئی۔ مثال کے طور پر جنرل یحییٰ خان نے دو کمیٹیوں کی بات کی۔ یہ شیخ مجیب الرحمٰن کی

طرف سے آئی۔ بلکہ خان ولی خان نے انکشاف کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ یہ آئیڈیا خود جنرل یحییٰ کی طرف سے آیا تھا' خان ولی خان کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے شیخ مجیب سے بات کی تو وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے مجھے جنرل یحییٰ خان کا ایک خط دکھایا جس میں جنرل یحییٰ نے شیخ مجیب کو حل کی پیشکش کی تھی جو خاصا اطمینان بخش تھا اور چھ نکاتی پروگرام سے مزید آگے تھا اور یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ اس قسم کا حل مکمل علیحدگی پر منتج ہوتا۔ جنرل یحییٰ خان نے بہرحال واضح الفاظ میں اس بات سے انکار کیا کہ انہوں نے ایسا کوئی خط لکھا اور ہم نے ایسی کوئی دستاویز نہیں دیکھی۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن کی شہادت کی عدم موجودگی میں ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے کہ ایسا کوئی خط موجود ہے یا خان ولی خان کو دکھایا جانے والا خط اصلی تھا۔

سب سے زیادہ ضروری یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اب اس بات کی پڑتال کا کوئی ذریعہ نہیں کہ صحیح بات کیا ہے اس وقت صورت حال اس انداز میں ظہور پذیر ہوئی کہ متعلقہ لوگوں میں سے کسی کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی پڑتال کر سکے۔ یہ کہنا کہ اس نکتے یا اس قسم کے نکتے کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی حسن ظن ہوگا ہمیں بہرحال یہ احساس ہے کہ جنرل یحییٰ نے ایک ایسی گیم کھیلی جس لئے کسی واضح فیصلہ پر نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔

بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا گیا

عوامی لیگ کے لیڈران اور صدر کے مشیروں کے درمیان 23 اور 24 مارچ کو مشاورت کافی دیر تک جاری رہی اور اس دوران عوامی لیگ کی پوزیشن قدرے خراب ہو گئی۔ اس میں وہ چاہتے تھے کہ قومی اسمبلی کے دو علیحدہ علیحدہ آئینی کونشنز منعقد ہوں' ایک مغربی پاکستان کی قومی اسمبلی کا اور دوسرا مشرقی پاکستان کی اسمبلی کا۔ چنانچہ پہلی دفعہ لفظ پاکستان کنفیڈریشن کا استعمال کیا گیا۔ ایسی صورت میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی خاص اختیارات نہ رہتے۔ 24 مارچ کی شام کو مسٹر تاج الدین احمد جنرل سیکرٹری عوامی لیگ نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا کہ ہم نے جنرل یحییٰ خان کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے اور اب یہ کہ بات چیت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ آخری تجویز تیار کی گئی تھی جو عوامی لیگ نے دی تھی جو کہ اس باب کے ضمیمے سے واضح ہے۔ اسی اثناء میں 23 مارچ کو یعنی اس دن جو پاکستانیوں

کے لئے ایک عظیم دن ہے اور جو کہ قرارداد پاکستان کی یاد میں منایا جاتا ہے اور جسے پاکستان بننے کی بنیاد کہا جا سکتا ہے اس دن بجائے پاکستانی جھنڈا لہرانے کے عمارتوں پر عام مکانوں پر اور شیخ مجیب الرحمٰن نے خود اپنی رہائش گاہ پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا۔

24 اور 25 مارچ کو مسٹر بھٹو صدر سے ملے تا کہ ان سے مل کر عوامی لیگ کی تجاویز پر غور کیا جا سکے۔ 25 مارچ کی شام کو پی پی پی کے مشیران کو صدر کی ٹیم نے عوامی لیگ کی حتمی تجاویز سے مطلع کیا۔ آدھی رات کو 25 اور 26 مارچ کو ڈھاکہ میں خوفناک قسم کی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ فوج کی کارروائی جس کا سب کو پیشگی اندازہ تھا شروع ہو چکی تھی اور جو کچھ بھی ہوا وہ انتہائی تشویشناک تھا۔ جنرل یحییٰ خان پہلے ہی ڈھاکہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ شام کو بتایا گیا کہ صدر سے رابطہ نہیں ہو سکا کیونکہ وہ ایسٹرن کمانڈ کی عمارت میں کسی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک وہ کراچی جا چکے تھے۔ اس طریقے کا کوئی بھی ایکشن پہلے سے تیاری کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں کچھ باتیں خفیہ طور پر طے کر لی گئی تھیں۔ یعنی اس سلسلے میں تیاری پہلے سے کر لی گئی تھی اور یہ تجویز تھی کہ صلاح و مشورے مارچ کے درمیان سے شروع کر کے اس تاریخ تک ختم کر دیئے جائیں۔ جنرل یحییٰ خان اور اس کے فوجی رفقاء کا یہ نظریہ تھا کہ عوامی لیگ کی آواز کو سختی سے دبا دیا جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جنرل یحییٰ قطعاً سنجیدہ نہیں تھے کہ اختیارات منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیئے جائیں' خاص طور پر مشرقی پاکستان میں۔

مشرقی پاکستان میں قتل عام

ہمارے پاس بہت سے ایسے شواہد ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ رپورٹ بالکل صحیح سمت میں تھی اور ہم آگے چل کر اس کی وضاحت بھی کریں گے لیکن ایک ایسا بھی خیال تھا کہ یہ تمام کارروائی ناکام ہو جائے تا کہ دو ہفتے تک کچھ بھی نہ کیا جا سکے۔ مشرقی پاکستان کے حالات اس قسم کے تھے کہ جنرل کو بہت ہی مخلصانہ طریقے سے اپنا ہم خیال بنایا جا سکتا تھا لیکن اگر حالات حتمی طریقے سے ختم ہو جاتے تو یہ بے وقوفی ہوتی۔ ڈھاکہ ایک ایسا شہر تھا جہاں پر مسلح محافظ کے بغیر جانا ناممکن تھا۔ خاص کر حکومت پاکستان کے کسی اہلکار کے لئے یا مغربی پاکستان کے آدمی کے لئے۔ عوام عام طور پر ان باتوں کو مان رہے تھے جو شیخ مجیب الرحمٰن کہہ رہے تھے حالانکہ ابھی تک ان کی پوزیشن واضح نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سرکاری احکامات

صادر کر رہے ہیں جو کہ عام حالات میں ایک حکومت ہی دے سکتی ہے۔ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لئے بہت کچھ ہے کہ عوامی لیگ 26 مارچ 71ء کو تین بجے صبح کچھ گڑ بڑ کرنا چاہتی تھی اور یہ قدرتی امر تھا کیونکہ جنرل یحییٰ خان نے 25 مارچ کی شام کو بات چیت کو مفید بنانے اور اس سلسلے میں مزید کوئی حل نکالنے کے لئے کہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ حکومت ملنے والی معلومات پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی تھی اگرچہ بہت سے تربیت یافتہ ادارے ایسے تھے (صوبے میں) اور مقامی ایجنٹ بھی تھے مگر ان سے یہ معلومات حاصل کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ان سب کے علاوہ زبان کا بھی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ یہ بہت ہی افسوسناک بات تھی کہ 25 سال گزرنے کے بعد بھی رسل و رسائل کی حالت بہت خراب تھی۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ لیڈروں میں صرف ایک اہم لیڈر یعنی شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا اور ان کے خیال میں جو صورتحال سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اس نے رضاکارانہ طور پر گرفتاری دی۔ بجائے اس کے کہ پاکستانی فوج اسے خود تلاش کر کے گرفتار کرتی۔ یہ درست ہے کہ بعد میں ڈاکٹر کمال بھی گرفتار ہوئے لیکن کم از کم اس رات وہ روپوش ہو گئے تھے اور ان کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ یہ سمجھا گیا تھا کہ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ لیڈروں کی گرفتاری کے لئے جن لوگوں کو بھرتی کیا گیا تھا وہ ان کے چہروں سے آشنا نہیں تھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وضاحت بہت کمزور ہے۔ ایک امکانی منصوبہ بندی جیسا کہ ہم جانتے ہیں پہلے ہی کر لی گئی تھی اور یقیناً ان لوگوں کی گرفتاری اس منصوبہ بندی کا ایک لازمی حصہ تھی۔ ان حالات میں یہ بہت مشکل تھا کہ مخصوص افراد کو ان میں سے ہر ایک کی گرفتاری کا ٹاسک سونپا جاتا اور یہ لوگ ان لیڈروں کے چہروں سے بآسانی شناسا ہو سکتے تھے جو کم از کم 10 برسوں سے مستقل ایوان صدر آ رہے تھے۔ ایک وضاحت یہ کی گئی ہے کہ اس مدت کے دوران عوامی لیگ کے لوگ اپنی رہائش گاہیں ہر رات بدلتے رہتے تھے اور اس لئے یہ آسان نہیں تھا کہ یہ سراغ لگایا جا سکے کہ وہ رات کو کہاں تھے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مجیب الرحمٰن اور پھر ڈاکٹر کمال حسین دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ پاکستانی فوج کے مقابلے میں انٹیلی جنس کے ذرائع جو عوامی لیگ کے پاس تھے وہ زیادہ بہتر تھے اور یہی وجہ تھی کہ رات کو کارروائی کرنے کا سوچا گیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ 25 کو مذاکرات ٹوٹ گئے۔ یہ دانستہ تھے یا نادانستہ اس وقت ہم اس کا فیصلہ نہیں کر رہے اور یہ حقیقت ہے کہ جو فوجی کارروائی کی گئی جسے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں وہ محض احتیاطی نہیں بلکہ اپنی نوعیت میں تعزیری تھی۔ اس قسم کی کارروائی میں بہت تشدد ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانی

جانوں کا ضائع ہونا اور املاک کا تباہ ہونا لازمی ہے۔ لیکن ایک طرف یہ بیان دیا گیا کہ مزید کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف یہ الزام لگایا ہے کہ کارروائی ظالمانہ اور انتقامی تھی۔ صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضروری ہے کہ چند حقائق کو ذہن میں رکھا جائے۔ فوجی کارروائی سے کئی ہفتے پہلے نہ صرف بڑے پیمانے پر افراتفری پھیلی ہوئی تھی مگر فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ خاموش رہے۔ فوج کو الگ تھلگ کر دیا گیا یہاں تک کہ اسے کھانے کی فراہمی بھی بند ہو گئی' انہیں گالیاں بھی دی گئیں' ان پر تھوکا گیا اور انہیں یحییٰ کے کتے کہا گیا۔ اس مدت کے دوران عوامی لیگ کے حامیوں بالخصوص مکتی باہنی نے ان لوگوں کو قتل کیا اور لوٹ مار کی جو ایک پاکستان کے حامی یا مارشل لا انتظامیہ کے وفادار سمجھے جاتے تھے۔ مگر فوج کو اچانک نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ صورتحال کو قابو میں لانے کے لئے کارروائی کا حکم دیا گیا۔ فوج سے یہ توقع رکھی جا سکتی تھی کہ وہ کارروائی کرے گی وہ کسی حد تک انتقامی ہو گی جیسے کسی خونخوار جانور کو جو زنجیروں میں بندھا ہوا اور بھوکا ہو اسے اچانک کھول دیا جائے۔ سرکاری مؤقف یہ تھا کہ جو کارروائی کی گئی اسے ضرورت کے مطابق رکھا گیا اور چھوٹے پیمانے پر کی گئی تھی۔ دوسری جانب بیرونی دنیا ظلم و زیادتیوں' خوفناک اور دہشت ناک کہانیاں سن رہی تھی۔ ہم مثال کے طور پر بتاتے ہیں کہ جب فوج کو شبہ ہوتا کہ کوئی تخریب کار کسی خاص گاؤں میں ہے اسے قتل کرنے کے لئے پورے گاؤں کو مشین گنوں کی باڑھ پر رکھ کر اور اس کے باشندوں کو بلالحاظ عمر و جنس قتل کر دیا گیا۔ اس وقت فوج میں خدمت انجام دینے والے افسران سمیت بہت سے گواہوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔

ہوسناکی کی داستانیں

ہمیں ثبوت کے طور پر مثالیں دیتے ہوئے بتایا گیا کہ مرد و خواتین کے بڑے بڑے گروہوں کو لایا جاتا اور ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ واقعات مسلسل ہوئے۔ فوجی اور افسران معزز لوگوں کے گھروں پر جاتے اور ان کی جوان بیٹیوں کو زبردستی لاتے اور اپنی ہوس مٹانے کے بعد ان کو قتل کر دیا جاتا۔

یہ آج ناممکن ہے کہ سچ کو جاننے کے لئے مختصر ترین تشخیص کی جائے؛ تاہم متعدد ایسی دلیلیں ہیں جو ہماری اس طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ اس طرح کے کثیر واقعات ہوئے تھے اور یہ سب واقعات ان سے بڑے تھے جو کہ بعد میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بغیر

کسی اشتعال کے انتقامی اقدامات اور سفاکیوں کے واقعات بڑی تعداد میں رونما ہوئے۔

26۔ مارچ کی صبح کو غیر ملکی رپورٹرز کو زبردستی ڈھاکہ چھوڑنے کا حکم دیا گیا اور اس سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ حکام وہاں پر ان واقعات کے عینی گواہوں کی موجودگی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس حکم کی یہ وضاحت پیش کی گئی کہ یہ غیر ملکی نمائندوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لئے دیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ وضاحت جنرل یحییٰ نے ہمارے سامنے پیش کی تھی۔ انہوں نے بیان دیا کہ انہیں بہت بعد میں غیر ملکی نمائندگان نے بتایا کہ یہ ان کی معمول کی ڈیوٹی کا حصہ ہے کہ وہ خطرہ مول لے کر اپنی خبریں مرتب کرتے ہیں۔ جنرل یحییٰ کہتے ہیں کہ وہ غیر ملکی نمائندگان کے اس رویئے سے آگاہ نہیں تھے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ جنرل یحییٰ جیسا فوجی جو کئی جنگی محاذوں پر لڑ چکا ہو اس کی یہ وضاحت بھولپن نظر آتی ہے۔ یقینی طور پر جنرل یحییٰ اپنے سابقہ جنگی تجربے کی بناء پر جانتے تھے کہ جنگی نامہ نگار اکثر و بیشتر فوجیوں سے زیادہ خطرہ مول لیتے ہیں۔

اس سے بھی بدتر یہ واقعہ ہوا کہ جب غیر ملکی میڈیا نے اس قسم کے یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے واقعات کا الزام لگایا تو اس وقت بھی پاکستانی حکام نے کسی قسم کا کوئی بھی بیان وغیرہ نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کے 4 ماہ بعد پاکستانی حکام کی جانب سے جاری ہونے والے وائٹ پیپرز میں مکتی باہنیوں کی جانب سے کی گی سفاکیوں کو تو شمار کیا گیا تھا؛ تاہم اس میں اس کے اپنے فوجیوں کی جانب سے کی گئی قتل و غارت گری کا کوئی ذکر نہ تھا۔

مشرقی پاکستان میں 30 ہزار افراد قتل ہوئے

جنرل ٹکا خان نے جو کہ 7 اپریل کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے ہمارے سامنے بیان دیا کہ مقتولین کی تعداد غالباً 15 ہزار تھی؛ تاہم ہمیں بتایا گیا کہ بعد میں ایک اخباری انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ تعداد 30 ہزار بتائی تھی۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ آرمی کی معمول کی کارروائیوں سے متعلق جو خبریں مشرقی پاکستان سے موصول ہوتی تھیں وہ بہت ہی مشتبہ ہوتی تھیں کیونکہ راولپنڈی اور مشرقی کمانڈ سے آئے ہوئے افسران ہمیشہ ان کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے۔ ہمیں ایک فوجی افسر نے بتایا کہ اکثر و بیشتر یہ ہوتا کہ ایک گروہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا اور کمانڈرز کو یہ رپورٹ کی جاتی کہ یہ لوگ مطلوبہ آدمی کی گرفتاری پر مسلح مزاحمت کر رہے تھے۔ حالانکہ ان لاشوں کے پاس سے کسی بھی قسم کا کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوتا

تھا۔ حکام کی جانب سے لوگوں کے قتل کی تعداد اور بغیر کسی ثبوت کے حتمی اعلان کی عدم موجودگی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انتقامی کارروائیوں اور ہوسناکی کے واقعات 25 مارچ سے رونما ہوئے۔ اگرچہ ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم ایسے واقعات کی حقیقی تعداد کی تصدیق کر سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پالیسی کے طور پر جو کچھ بھی ہوا مجاز حکام نے ایسے اقدامات کو روکنے کے لئے کیا تھا جبکہ دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ ایسی ہدایات جاری کرنا ضروری ہو گیا تھا جس سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے جن کے بارے میں شکایات جنرل کمانڈر اور ایسٹرن کمانڈ کے پاس پہنچ رہی تھیں۔

لوٹ مار

متعدد ایسے معاملات بھی ہمارے علم میں لائے گئے تھے جہاں اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوس کی تکمیل اور فوائد حاصل کرنے والوں کے ساتھ سختی کے ساتھ نمٹا گیا۔ لوٹ مار کے متعدد واقعات ایسے تھے جن میں بعض بڑے پیمانے پر ہوتے اور وہ منظر عام پر بھی آتے۔ خاص طور پر ایک کیس ایسا بھی تھا کہ جس میں بریگیڈیئر کے عہدے تک کے افراد ملوث تھے۔ اس میں دو سے ڈھائی کروڑ روپیہ کے کرنسی نوٹ لوٹے گئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان افراد کو بری کر دیا گیا تھا۔ بہر حال ہم یہ قرار نہیں دے رہے ہیں کہ ان کو غلط طور پر بری کیا گیا تھا۔ اس کیس کی تیاری کا مکمل جائزہ لئے بغیر ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے تھے لیکن یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جرم وقوع پذیر ہوا تھا اور اس کے ساتھ اس کے ذمہ داروں کو بغیر سزا دیئے چھوڑ دیا گیا یا ان کا سراغ نہیں لگایا گیا۔ ڈھاکہ میں مارچ کے مذاکرات کی تفصیلات سے جن کو ہم اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے یہ ظاہر ہو گیا کہ بالآخر جس بات پر اختلاف تھا وہ اقتدار کی منتقلی کے طریقہ کار کے علاوہ کسی قابل ذکر معاملے پر نہیں تھا۔ ہم اس افسوسناک مرحلے پر کیسے پہنچے جس کے نتیجے میں جنگ کی ہولناک تباہی پھر ملک کے ایک حصہ کے الگ ہونے کا المیہ رونما ہوا۔ علیحدگی کا ذمہ دار کون تھا اور کس حد تک ذمہ دار تھا۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کا یقین نہ ہو تب بھی بلاشبہ ان نتائج کا اندیشہ اس لیگل فریم ورک آرڈر کی شقوں اور حکام کی سوچ میں فطری طور پر موجود تھا انہی شقوں کو مقدم رکھا گیا اور پیروی کی گئی۔ ہم اس آرڈر میں ایسی ووٹنگ کے طریقہ کار کی کسی شرط کو جان بوجھ کر ختم کرنے اور جنرل یحییٰ کی جانب سے 6 نکاتی پروگرام کے

مطالب اور اس سوال سے کہ آیا یہ لیگل فریم ورک آرڈر کی شرائط سے متصادم تو نہیں جو ملکی سلامتی اور یکجہتی کی ضمانت تھیں واضح اور مکمل لاپروائی کا حوالہ دیتے ہیں۔ بلاشبہ ہم اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ جنرل یحییٰ 6 نکات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے یا سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اگر ہم یہ تصور کر لیں تو ہم اس بات کو قبول نہیں کر سکتے کہ وہ ایک سیدھے سادھے سپاہی تھے جو قانون سے ناواقف تھے اور اس لئے 6 نکاتی پروگرام کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھے حالانکہ انہیں ہمہ وقت پروفیسر جی ڈبلیو چوہدری کی رہنمائی حاصل تھی۔ (چوہدری یحییٰ خاں کے دور میں وزیر تھے)۔

حماقت اور ہٹ دھرمی

انہوں نے خود 26 مارچ 1971ء کو اس بات کو دہرایا کہ جو لوگ ملک کی سلامتی کی طرف سے پریشان ہیں ان کے لئے لیگل فریم ورک آرڈر ایک کافی ضمانت ہے۔ اس لئے ہم اگر یقینی نہیں تو اس شک کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پروگرام کے مضمرات سے بے خبر ہوتے ہوئے اور اقتدار کی منتقلی کی غیر خوشگوار تبدیلی کو چھوڑتے ہوئے اس بنیاد پر کہ وہ لیگل فریم ورک آرڈر کی خلاف ورزی میں ایک دستاویز کی توثیق نہیں کر سکے یہ کہ بالآخر ان کا اقتدار سے محروم ہونا ان کے اپنے اقدامات کا متعین نتیجہ تھا؛ تاہم ہم نے ان معاملات پر رپورٹ کے دوسرے حصوں میں اظہار خیال کیا ہے اور اس پر مزید اظہار خیال کرنا ضروری نہیں ہے۔ انتخابات کے نتائج سے پیدا ہونے والی صورتحال میں جنرل یحییٰ خان نے کیا کیا؟ اگر ان کے پاس اس وقت تک یہ یقین کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں تھی کہ 6 نکاتی پروگرام اپنے مقصد میں گمراہ کن یا نتیجے میں تباہ کن ہے تو ان کو جتنا جلدی ممکن ہوتا قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لینا چاہئے تھا۔ اگر انہوں نے یہ سوچا تھا کہ ایک ابتدائی سمجھوتہ یا عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے درمیان کم از کم مشورہ ضروری تھا تو ان دونوں کو جلد ایک اجلاس میں بلایا ہوتا۔ انہوں نے ان دونوں باتوں میں کسی پر عمل نہیں کیا اور صرف 6 جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ملاقات کے لئے انہوں نے ڈھاکہ کا دورہ کیا جس کے بعد انہوں نے 17 جنوری کو مسٹر بھٹو سے ملاقات کی۔ ڈھاکہ کا اجلاس جیسا کہ ہم نے دیکھا باہمی ہم آہنگی پر ختم ہوا۔ صدر نے 6 نکاتی پروگرام میں کوئی غلط بات نہیں محسوس کی اور اعلان کیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن آئندہ وزیراعظم ہوں گے یہ درست ہے کہ انہوں نے شیخ مجیب کو خبردار کیا تھا کہ ان کو مغربی پاکستانی لیڈروں کو ساتھ لے کر

چلنا ہوگا۔ جس کے لئے شیخ مجیب نے عندیہ دیا کہ وہ ایسا کرے گا یہ بات محسوس کرنے کے لئے ہے کہ اس سلسلے میں نہ ہی پیپلز پارٹی اور نہ ہی مسٹر بھٹو کا نام لے کر ذکر کیا گیا چونکہ صدر نے چھ نکات میں کوئی غلط بات محسوس نہیں کی تھی اس لئے شیخ مجیب نے مسٹر بھٹو سے ملاقات کرنے کا کیوں کہا تھا۔ بہر حال ان کے لئے یہ کیوں ضروری نہیں تھا کہ فوری طور پر اسمبلی کا اجلاس بلاتے۔ مجیب الرحمٰن کو کچھ بھی نہیں کہا گیا اور کم از کم شیخ مجیب نے اسمبلی کے اجلاس یا اس کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے مسٹر بھٹو سے ملاقات کی ضرورت کے بارے میں کہا تھا۔ مغربی پاکستان کے چند ہی لوگوں کی طرح یحییٰ خان ہر وقت حالات سے باخبر تھے۔ ان (یحییٰ خان) کو وہاں اپنے نمائندے مسلسل یہ مشورہ دے رہے تھے کہ اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے سے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت میں اضافہ ہو رہا ہے اور یکم مارچ کے بعد جب اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا تو صورتحال پوری طرح حکومت کے قابو سے باہر ہو گئی اور مجیب نے عملاً متوازی حکومت قائم کر دی اس پس منظر کے ساتھ جنرل یحییٰ خان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر ایک قابل قبول حل کے لئے مذاکرات کامیاب نہیں ہوئے تو مجیب کے متبادل صرف یہ تھا کہ فوجی کارروائی کی جائے اور علیحدگی روکنے کے لئے لازماً یہ خطرہ مول لینا پڑتا۔ فوجی ایکشن کا متبادل صرف اسی وقت اصل متبادل ہو سکتا تھا جب اس کا مقصد سیاسی مذاکرات کے لئے سازگار حالات کو بحال کرنا ہوتا۔ اگر مقصد یہ ہوتا تو ہماری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی کہ پھر حالات کو 25 مارچ تک کیوں بڑھنے دیا گیا۔ اس لئے عوامی لیگ کے ساتھ مذاکرات کرنے اور مجیب کے ساتھ بات چیت کرنے سے بالکل انکار جبکہ وہ مغربی پاکستان میں 25 مارچ کے بعد قیدی کی حیثیت سے موجود تھا۔ واضح طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ فوجی ایکشن کا یہ مقصد نہیں تھا۔ اگر بعد میں بھارت کی طرف سے کھلی مداخلت کا خیال نہ بھی ہوتا (اور ایسا خیال نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی) تو یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو طاقت کے بل پر کتنا طویل عرصہ اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے؟

وہ تلے ہوئے تھے

ایک معنی میں بات چیت ناکام ہوگئی تھی کیونکہ ایک مقام ایسا آیا جب مخالفت کرنے والے گروہ نے تسلیم کرلیا کہ وہ کوئی حل تلاش کرنے میں ناکام ہوگیا۔ جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ سے 25 مارچ کی شام کو روانہ ہوئے لیکن اس بات کا اعلان نہ کیا گیا کہ وہ وہاں سے اس تاریخ کو روانہ ہونے والے ہیں اگرچہ ان کے فوجی مشیروں کا حلقہ ان کے پروگرام سے واقف ہوگا مگر ان کے سیاسی ساتھی بھی ان کے ارادے سے واقف نہیں تھے اور وہ عوامی لیگ کی ٹیم کے ساتھ مختلف معاملات پر بات چیت کی خاطر ملاقات کا پروگرام بنا رہے تھے جو مذاکرات کے دوران پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً مسٹر جسٹس کارنیلیس نے اپنے تحریری بیان میں کہا کہ "24 ماچ کی سہ پہر کو عوامی لیگ کی ٹیم کے ساتھ ملاقات کے اختتام پر پرسنل شاف افسر نے مجھے بتایا کہ صدر کے احکامات یہ تھے کہ مغربی پاکستان کے جو اعلیٰ حکام ڈھاکہ میں تھے وہ دوسرے دن یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ میں ڈاکٹر کمال حسین کے ساتھ اگلے دن ملاقات کے لئے وقت طے کرچکا تھا تاکہ آئین میں ترمیم کے لئے ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ پرسنل سٹاف افسر نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو ڈاکٹر کمال حسین سے ملاقات کرسکتا ہوں لیکن یہ ملاقات میری اپنی ذمہ داری پر ہوگی۔ اگلی سہ پہر روانگی کے انتظامات کرنے کے لئے کم وقت کی بنا پر اور عوامی لیگ کے کسی بھی لیڈر کے ساتھ ملاقات کے لئے رابطہ رکھنے میں مشکلات کی وجہ سے میں نے مجوزہ ملاقات کے بارے میں کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن ایک بج کر 30 منٹ کی پرواز سے کراچی روانہ ہوگیا۔ روانگی سے قبل کے وقفے میں میرا پرسنل شاف افسر یا کرنل حسین سے کوئی رابطہ نہ ہوا اور میں نے صدر سے بھی کوئی ملاقات نہیں کی۔ مجھے لاہور میں 26 مارچ کی شام کو صدر کی نشری تقریر سے معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ایکشن لیا گیا۔ مجھ سے تقریر کے سلسلے میں اور عوامی لیگ پر پابندی لگانے کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ تاہم اس عرصہ میں 25 مارچ کی رات کو فوجی ایکشن لینے کا پروگرام تیار کیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ ہنگامی منصوبے کے طور پر پہلے سے موجود تھا اور سمجھ میں بھی آتا ہے لیکن مارچ میں جنرل یحییٰ خان کے دورے کے دوران اس پر

عملدرآمد کے کسی تاریخ کا مقرر کرنے اور فی الواقع اس مقررہ دن کو اس منصوبے پر عملدرآمد کرنے سے جب کہ مذاکرات رسمی معنوں میں ناکام نہیں ہوئے تھے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذاکرات کو اس تاریخ تک طول دیا جارہا تھا جب ہم نے جنرل یحییٰ خان سے پوچھا کہ جنرل ٹکا خان نے 7 مارچ کے بعد امن وامان بحال کرنے کے لئے اقدامات کیوں نہیں کئے تو ان کا جواب بڑا شاندار تھا کہ "جنرل ٹکا خان میری ڈھاکہ آمد کا انتظار کررہے تھے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نتیجے سے بچنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جہاں تک جنرل یحییٰ خان کا تعلق ہے ان کا ارادہ نہیں تھا کہ مارچ کے مذاکرات کسی حل کی صورت میں ختم ہوتے۔ وہ فوجی اور سیاسی دونوں حالات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس موقع پر یا بعد کے کسی مرحلے پر اقتدار عوام کو منتقل نہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

1969ء کی گول میز کانفرنس اور 1971ء کے ڈھاکہ مذاکرات میں بعض قابل ذکر باتیں ایک جیسی ہیں۔ دونوں کا اختتام 25 مارچ کو ہوا۔ پہلے والی اگرچہ بظاہر کامیاب ہوئی تاہم اس کے فیصلوں پر عملدرآمد کے لئے اقدامات کو حتمی شکل نہ دی جاسکی جبکہ بعد والی اقتدار کی منتقلی کے طریقوں کے نکتے پر ناکام ہوئی۔ دونوں میں ناکامی کی واحد وجہ مجیب کے چھ نکات تھے۔

اس سلسلے میں اب ہم شیخ مجیب الرحمٰن کے کردار کا جائزہ لیں گے۔ پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا مجیب الرحمٰن ابتدا ہی سے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے پر تلے ہوئے تھے یا وہ محض ایک ایسا آئین چاہتے تھے جو کنفیڈریشن کا انداز رکھتا ہو؟ ہم نے اپنی اس رپورٹ میں جہاں بھی ان چھ نکاتی پروگرام اور ان کے عملی اطلاق کا جائزہ لیا ہے اس کے بعد ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے سوائے اس کے کہ اس کا مطلب کم از کم کنفیڈریشن ہی تھا اگر حادثاتی یا واقعاتی طور پر علیحدگی نہ ہو تو۔ علاوہ اس کے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکاتی پروگرام پر عملدرآمد شروع کردیا تھا۔ ایک حتمی فیصلے کے طور پر نہیں بلکہ ابتدائی اقدامات کے طور پر تاکہ وہ اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرسکیں جن سے وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ مشرقی پاکستان کے مفاد کو بہتر طریقے سے بذریعہ بات چیت اجاگر یا حاصل کرسکیں۔ اس بات کو نظر انداز کردیں کہ چھ نکاتی پروگرام کوئی آسمانی صحیفہ نہیں تھا کہ اس پر بات چیت نہ ہوسکتی ہو۔ ہم کو اس بات پر ضرور زور دینا چاہیے اور جو ثابت بھی ہے کہ الیکشن سے پہلے (مجیب الرحمٰن) نے کونسل مسلم لیگ اور

جماعت اسلامی کو (مشرقی پاکستان میں) کچھ نشستوں کی پیشکش کی تھی جبکہ اس کے باوجود بھی اسے ہر صورت میں مشرقی پاکستان میں اکثریت حاصل ہو سکتی تھی لیکن قومی اسمبلی میں اسے واضح اکثریت حاصل نہ ہوتی۔

مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے کردار

یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آئی ہے کہ وہ اپنی اکثریت کے ذریعے چھ نکاتی پروگرام کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں وہ اپنی پارٹی کے ممبران کے دباؤ میں بھی نہیں آئے۔ یہ بات بخوبی واضح کرتی ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے کم از کم اس وقت تک علیحدگی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی مرکز کو وہ اتنا کمزور کرنا چاہتے تھے کہ ملک کا اتحاد برائے نام رہ جائے۔ ان کی یہ پیشکش بہر حال قبول نہیں کی گئی اور نتیجے کے طور پر اس نے مشرقی پاکستان میں تمام نشستیں جیت لیں سوائے دو نشستوں کے جس کے نتیجے کے طور پر ایک دوسرے مفہوم میں وہ اپنی پارٹی کے قیدی بن کر رہ گئے اور اس قابل نہ رہے کہ اپنی پارٹی کے انتہا پسند گروپ کے مطالبات کو رد کر سکیں جن کا انہیں 7 مارچ 1971ء کو سامنا کرنا پڑا۔ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی پارٹی کے دباؤ سے فرار حاصل کرنے کے لئے انہوں نے خود کو گرفتار کرا دیا۔ علاوہ ازیں ہم یہ سوچتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن ایک بہتر مدبر ثابت ہوتے، بجائے اس کے جو کچھ انہوں نے کیا اور عموی طور پر پاکستان اور خاص طور پر مشرقی پاکستان کے عوام کو جمہوریت کے بہتر نتائج فراہم کرتے یعنی امن اور سکون، اور ایک خوشحال زندگی۔ ان کو ایک سنہری موقع دیا گیا تھا۔ وہ متحدہ پاکستان کے وزیر اعظم بن سکتے تھے حالانکہ اس سے مشرقی پاکستان کو اس پیمانے پر آزادی نہ مل پاتی جو کہ چھ نکاتی پروگرام کے ذریعے حاصل ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لئے زیادہ آزادی کی ضرورت تھی۔ اس قسم کے سیٹ اپ میں مسٹر بھٹو مرکز میں اپنا حصہ مانگنے کی پوزیشن میں نہ ہوتے اور اپنے سیاسی وجود کو قائم رکھنے کے لئے اگر شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے ایسا ضروری ہوتا کہ وہ کچھ نمائندے مغربی پاکستان سے اپنے ساتھ شامل کر لیں تو یہاں ان کی کوئی کمی نہ تھی اور وہ کسی بھی پارٹی سے اتحاد کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ 7 جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن، جنرل یحییٰ خان کو یہ یقین دہانی کرا رہے تھے کہ وہ واضح طور پر دو تہائی اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ وہ پیپلز پارٹی سے

کسی قسم کا اتحاد قائم کریں گے۔ یعنی یہ بات واضح تھی کہ وہ پیپلز پارٹی سے اتحاد کر لیں گے۔ تاہم وہ کسی چھوٹی پارٹی سے اتحاد کر کے اپنی پارٹی کی حیثیت برقرار اور واضح رکھنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں مشرقی پاکستان اور مرکز میں وہ اس حیثیت میں ہوتے کہ مشرقی پاکستان کے حالات کو بہتر بنا دیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اپنے چھ نکات کو آئین کا حصہ بنا کر کیا زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے اور مشرقی پاکستان کے لئے کیا بہتر کام کر سکتے تھے حالانکہ وزیر اعظم بننے کی صورت میں وہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مشکلات اور مسائل کو زیادہ بہتر طور پر حل کر سکتے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جنرل یحییٰ خان کا رویہ کیا تھا اور انہوں نے شیخ مجیب کو کس طرح اشتعال دلایا ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر مجیب الرحمٰن ایسے آئین پر متفق ہو جاتے جو مغربی پاکستان کے لئے بھی قابل قبول ہوتا تو یہ ملک کے لئے زیادہ بہتر ہوتا اور وہ ایک متحدہ پاکستان کے سربراہ ہوتے۔

اب یہاں ذوالفقار علی بھٹو، چیئرمین پیپلز پارٹی کا کردار سامنے آتا ہے جو کہ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر تھے اور جنہیں ملک کی سیاست میں خاص حیثیت حاصل تھی اور جن پر ایک خاص ذمہ داری تھی کہ وہ ملک کا آئین بنائیں اور ملک کی بقا اور استحکام کو برقرار رکھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ یہ مطالبہ کرنے میں پوری طرح حق بجانب تھے کہ نیشنل اسمبلی کا اجلاس جو کہ 3 مارچ 1971ء کو ہونا طے پایا تھا اسے ملتوی کر دیا جائے اور کیا وہ اس مطالبے میں بھی حق بجانب تھے کہ عوامی لیگ ان سے اتحاد قائم کرے اور یہ کہ انہوں نے ملک میں دو طاقتوں کی جو تھیوری پیش کی تھی وہ کس حد تک صحیح تھی اور آخری بات یہ کہ انہوں نے ڈھاکہ مذاکرات کے دوران اس ذہانت اور مثبت حکمت عملی سے کام کیوں نہ لیا جس کے نتیجے میں 25 مارچ 1971ء کو فوجی ایکشن شروع کر دیا گیا۔ یہ بات عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ پیپلز پارٹی نے دوران الیکشن مجیب الرحمٰن (عوامی لیگ) کے چھ نکات کو اپنی انتخابی مہم کا اہم ایشو نہیں بنایا تھا لیکن کمیشن کے روبرو بھٹو کی جانب سے کہا گیا کہ انہوں نے مغربی پاکستان میں دانشوروں کے ایک اجتماع میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ان چھ نکات میں علیحدگی کے جراثیم موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا واقعی کہا ہو؛ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق ہے اس نے اس سلسلے میں (چھ نکاتی پروگرام کے خلاف) نہ تو کوئی مہم چلائی اور نہ ہی عوامی میٹنگ میں ان کے خلاف کچھ کہا۔ ایسی صورت میں کمیشن اس دلیل کو زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا جو کہ انہوں نے الیکشن اور اسمبلی کے اجلاس کے بعد پیش کی ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ بھٹو کس

جمہوری اور پارلیمانی اصول کے تحت عوامی لیگ کی قیادت سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ اسمبلی کے اجلاس میں اس معاملے پر مفاہمت کرتے ہوئے چھ نکاتی پروگرام میں کچھ کمی کر دیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عوامی لیگ نے بھاری اکثریت کے ساتھ چھ نکاتی پروگرام پر مشرقی پاکستانی عوام کی حمایت حاصل کی تھی ان سے یہ توقع کم ہی کی جا سکتی تھی کہ وہ ان نکات سے بغیر کسی بحث مباحثے اور کچھ لو کچھ دو کے عمل کے بغیر انحراف کریں۔ یہی بات پیپلز پارٹی کے اس مطالبے اور اصرار کے متعلق کہی جا سکتی ہے جس کے مطابق کوئی آئین ان کی شمولیت اور منظوری کے بغیر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ حالانکہ شیخ مجیب الرحمٰن کو نیشنل اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل تھی اور انہیں یقین تھا کہ وہ مغربی پاکستان کی دوسری اقلیتی پارٹیوں کی حمایت بھی حاصل کر لیں گے جبکہ اصل صورتحال یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے صرف 2 صوبوں یعنی پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی تھی تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیگ جس نے پورے پاکستان کی نیشنل اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کی تھی' آئین نہیں بنا سکتی۔ ان تمام باتوں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پیپلز پارٹی' عوامی لیگ سے یہ مطالبہ کرنے میں قطعاً حق بجانب نہ تھی کہ وہ چھ نکات سے دستبردار ہو جائیں یا پھر ان میں تبدیلی کر لیں یا یہ کہ پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان میں عوامی رائے ہموار کرنے اور انہیں چھ نکاتی پروگرام کے حق میں ہموار کرنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا؛ تاہم یہ بات درست نہیں۔ زیادہ بہتر راستہ پیپلز پارٹی کے لئے یہ تھا کہ وہ نیشنل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرتی اور اپنے نظریات اور نکات کی اجلاس میں بیٹھ کر وضاحت اور وکالت کرتی!

مشرقی پاکستان کا ردِ عمل

ہم اس نظریئے کی بھی حمایت نہیں کر سکتے کہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین ان مسائل کو اور اس گہرے ردِ عمل کو سمجھنے سے قاصر رہے جو کہ مشرقی پاکستان میں اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے اور تاریخ کو آگے بڑھانے سے پیدا ہوئے۔ انہوں نے کمیشن کے سامنے واضح طور پر یہ اعتراف کیا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس صورت میں سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کریں گے۔ مسٹر بھٹو نے مشرقی پاکستان میں اپنی پارٹی قائم کرنے کی معمولی سی بھی کوشش نہیں کی اور ان کے پاس وہاں کے بارے میں خبر رسانی کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا اور ذرائع ابلاغ' جن پر حکومت کا کنٹرول تھا ان کے ذریعے بہت کم حقائق باہر کی دنیا تک پہنچ پاتے تھے۔ بیرونی ممالک کے لوگ حقیقی صورتحال سے بالکل ناواقف تھے اس بات سے قطع نظر کہ جب وہ (بھٹو) جنوری 71ء میں مجیب الرحمٰن سے گفت وشنید کے لئے ڈھاکہ گئے تو انہوں نے ذاتی طور پر وہاں موجود کشیدگی کا اندازہ لگایا ہوگا جو کہ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے یا اسے مؤخر کرنے کی صورت میں وہاں کے عوام میں پائی جاتی تھی۔

مسٹر بھٹو کو اس امر کا اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی کہ اجلاس کے انعقاد میں تاخیر کا عنصر مشرقی پاکستان کے عوام میں ایک دانستہ غلطی کے تاثر کو ابھار رہا تھا اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ فوجی حکومت انتخابات کے نتائج کے مطابق اکثریتی آبادی والے صوبے کو جان بوجھ کر اقتدار میں حصہ نہیں دے رہی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھٹو صاحب قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر اصرار کر کے مشرقی پاکستان کے مزاج کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ مغربی پاکستان میں چھوٹی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی کو ان کی جانب سے دی جانے والی دھمکیاں بھی غلط اور ناقابل فہم ثابت ہوئیں۔ اگرچہ بھٹو صاحب نے 28 فروری 1971ء کو 120 یوم کی مدت کی حد کی شرط کو ختم کرنے کی متبادل تجویز پیش کی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ہمارے مذکورہ بالا بیان کے منافی نہیں کیونکہ بھٹو صاحب کسی نہ کسی صورت میں اس امر سے آگاہ تھے کہ جنرل یحییٰ لیگل فریم ورک آرڈر میں مذکور مدت کی شرط کو معتبر تصور

کرتا تھا۔ بھٹو صاحب نے یہ نکتہ پہلے کبھی نہیں اٹھایا تھا اور اس بات کا یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ اس پر سنجیدگی سے توجہ کیوں نہ کی گئی اور اگر اس بات کا یقین بھی کر لیا جائے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے ایسی کوئی تجویز پیش کی تھی تو پھر اس سے قبل اسے بھٹو صاحب نے صدر کو کیوں نہیں پیش کیا اور 28 فروری 1971ء سے قبل کی جانے والی متعدد پریس کانفرنسوں اور دیگر مواقع پر کیوں پیش نہیں کیا گیا۔ بھٹو صاحب کی جانب سے آئین سازی پر اتفاق رائے کا مطالبہ دراصل دو اکثریتوں کے نظریے کی ترجمانی کرتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی یہ نظریہ بھی پیپلز پارٹی کے اس مطالبے کی بنیاد تھا جس میں مرکز میں ایک کثیر الجماعتی مخلوط حکومت کا قیام شامل تھا۔ جنرل یحییٰ نے بھی اس مطالبے کی حمایت کرتے ہوئے شیخ مجیب کو اسے قبول کرنے کا کہا تھا۔ ہم اس مطالبے پر ہونے والی تنقید اور مخالفت سے بخوبی آگاہ ہیں جس میں اس امر کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ ایک جمہوری پارلیمانی نظم میں حکومت سازی کا حق اکثریتی جماعت کو حاصل ہوتا ہے لیکن اکثریتی جماعت خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو حکومت سے منسلک ہونے پر اصرار نہیں کر سکتی۔ ناقدین نے بھٹو صاحب کے شیخ مجیب الرحمٰن کو مخاطب کر کے کہے جانے والے جملے ''ہم یہاں تم وہاں'' کی سخت مذمت کی ہے۔ جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو حکومت کرنی چاہیے۔

بھٹو کنفیڈریشن چاہتے تھے

وسط مارچ 1971ء میں بھٹو صاحب نے کراچی میں ہونے والی ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اس جملے کو غلط طور پر پیش کیا گیا تھا جبکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت میں مغربی پاکستان سے ہم اور مشرقی پاکستان سے آپ شامل ہوں گے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں علیحدہ حکومتیں قائم ہوں لیکن بھٹو صاحب کے جملے پر مکمل غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دراصل کنفیڈریشن کی طرز پر ملک کے دونوں حصوں میں علیحدہ اور خود مختار حکومتیں قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے یہ ریمارکس 14 مارچ کو ایک سیاسی اجتماع میں دیئے تھے۔ بلکہ یہ دراصل اس وقت قومی اسمبلی کے اجلاس کے انعقاد میں تاخیر سے پیدا ہونے والی سیاسی صورتحال میں شیخ مجیب الرحمٰن سے کیا گیا مطالبہ تھا۔ یہ صورتحال عوامی

لیگ نے ہی پیدا کی تھی۔ مارچ 1971ء تک درحقیقت عوامی لیگ اسلام آباد کی مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ کمیشن کے روبرو بھٹو صاحب نے کہا کہ انہوں نے یہ مطالبہ اس وقت اس لئے کیا تھا کیونکہ تب اکثریتی جماعت ملک میں فیڈریشن کی بجائے کنفیڈریشن کے قیام کی خواہشمند تھی۔ انہوں نے کہا کہ دراصل یکم مارچ 1971ء سے ہی شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے 6 نکات پر کسی مصالحت سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس کا رویہ ایک علیحدہ مملکت کے سربراہ جیسا ہو گیا تھا لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ 14 مارچ 1971ء کو بھٹو صاحب کی جانب سے دیئے جانے والے ریمارکس دراصل کنفیڈریشن کے نظریے کو مسترد کرنے کی بجائے اس کو قبول کرنے کے مترادف تھے۔ بہرحال ہم یہاں یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ بھٹو صاحب کے ریمارکس پیپلز پارٹی کی جانب سے دیئے گئے کسی نئے سیاسی نظریے کی بجائے محض جذباتی نوعیت کے تھے جن کا اظہار اس وقت کی سیاسی صورتحال کے مطابق ہوا تھا۔ تاہم اس وقت ان باتوں سے بہت زیادہ غلط فہمی پیدا ہوئی جہاں تک مارچ 1971ء کے نازک عرصے میں بھٹو صاحب کے عوامی لیگ کے ساتھ مذاکرات کے دوران کے کردار کا تعلق ہے تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ بھٹو صاحب اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان براہ راست کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حقائق کے ادراک اور تجزیئے کے بعد ہم یہ بات پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ مذاکرات کا خاتمہ اقتدار کی منتقلی میں کسی بنیادی اختلاف کے باعث نہیں ہوا تھا بلکہ اس ضمن میں کسی طریقہ کار کو اختیار کرنے میں اختلاف کے باعث ہوا تھا۔ یہ امر بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ جب پرآشوب حالات میں بالآخر دسمبر 1971ء میں بھٹو صاحب کو اقتدار دیا گیا تو یہ جنرل یحییٰ خان کی جانب سے جاری کردہ ایک سادہ حکمنامے کے تحت ہوا تھا اس طرح اگر اسے اس نگاہ سے دیکھا جائے تو اس سے جنرل یحییٰ خان کے مشیروں اور سیاسی رہنماؤں کی افسوسناک اور عقل سے خالی حکمت عملی کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ڈھاکہ میں سیاسی مذاکرات میں شریک تھے اور اقتدار کی منتقلی کے بارے میں کسی بات پر رضامند نہ ہو سکے حالانکہ ان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے تھا کہ ان کی ناکامی سے پاکستان ٹوٹ سکتا تھا۔ بہرحال ہم یہاں انصاف سے یہ بات کہیں گے کہ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے درمیان مذاکرات کا کوئی باقاعدہ یا رسمی طور پر خاتمہ نہیں ہوا تھا بلکہ یہ صورتحال دراصل جنرل یحییٰ خان کی جانب سے مذاکرات کے اچانک خاتمے اور 25 مارچ 1971ء کی شام کو اس کی ڈھاکہ سے اچانک خفیہ روانگی کے باعث ہوا تھا۔ یہ محض خام خیالی۔ وہم یا قیاس

آرائی ہے کہ اگر بھٹو صاحب جو مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈر تھے مذاکرات کے خاتمے سے قبل شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ براہ راست مذاکرات کے لئے کوئی مؤثر سبیل کرتے تو کوئی نتیجہ خیز صورتحال برآمد ہو سکتی تھی۔

مبہم بیان بازی

26 مارچ 1971ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں ہونے والے مذاکرات کی ناکامی کی وجوہات بتائی تھیں اور اس موقع پر جلد از جلد عوامی نمائندوں کو اقتدار سونپنے کے عہد کا اعادہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حالات کے مطابق نئے اقدامات کرنے کے عزم کا اظہار بھی کیا تھا۔ اپنے خطاب میں انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے قابل سزا غیر قانونی اقدامات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ملک کے پیچیدہ آئین سے پیدا ہونے والی صورتحال اور مسئلے کے حل کی خاطر شیخ مجیب کی غیر قانونی حرکتوں کو برداشت کر رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے رویئے اور کردار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے عوامی لیگ اور ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی صرف مشرقی پاکستان تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ مغربی پاکستان میں بھی یہ پابندیاں عائد تھیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اپنے خطاب میں انہوں نے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ آیا سیاسی سرگرمیوں پر پابندی سے عوامی لیگ کے وہ رہنما جو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں کامیاب ہوئے تھے منتخب ارکان رہ سکیں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے اگر وہ اپنی نشستیں کھو بیٹھتے تو پھر مشرقی پاکستان میں نئی اسمبلی کے قیام کے لئے نئے انتخابات کا انعقاد ناگزیر ہو جاتا۔ نشری خطاب میں آئینی پیچیدگی کے حل کے سلسلے میں کئے جانے والے نئے اقدامات کے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں دیا گیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت سے 20 نومبر 1971ء تک جب بھارت کے ساتھ جنگ شروع ہوئی عوامی لیگ کے ساتھ کوئی سیاسی مذاکرات کا امکان آخر کیوں پیدا نہیں ہو سکا۔ 26 مارچ 1971ء کو ملٹری ایکشن کا آغاز ہوا اور قطع نظر اس امر کے کہ یہ کتنا ضروری اور کتنے بڑے پیمانے پر تھا لیکن اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہئے کہ یہ محض ایک عارضی حل سے زائد کچھ نہیں تھا اور یہ صرف کامیابی کی صورت میں ہی مؤثر قرار دیا جا سکتا تھا کہ اگر امن

و امان بحال ہو جاتا اور قانون کی حکمرانی ہوتی اور اس دوران مسئلے کے سیاسی حل کے لئے مذاکرات کا راستہ اختیار کیا جاتا۔ جو لوگ اقتدار میں تھے اگرچہ اسے آخری حل نہیں سمجھتے تھے لیکن اس بات کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ فوجی حکومت اسے واقعی آخری حل ہی سمجھ رہی تھی۔ جہاں تک بدامنی اور تشدد وغیرہ کا ذکر ہے تو ہمیں بتایا گیا ہے کہ ملٹری ایکشن بہت کامیاب اور نتیجہ خیز رہا اور خاص طور پر وہ سینئر آرمی افسران جن کے بیانات کے بارے میں کوئی شک وشبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بات سامنے آتی ہے کہ فوجی کارروائی کے باعث جون تک صورتحال خاصی بہتر ہو گئی تھی اور توقعات کے مطابق ہی رہی۔ بہر حال اگر ملٹری ایکشن کا مقصد سیاسی صورتحال میں استحکام پیدا کرنے کی خاطر کوئی کارروائی تھا تو پھر شاید یہی ایک انتہائی مناسب اور موزوں وقت تھا کہ جب سیاسی مذاکرات کا راستہ اختیار کیا جاتا اور مسئلے کے سیاسی حل کے لئے کوششوں کا آغاز کیا جاتا۔ 28 جون 1971ء کو اپنے قومی نشری خطاب میں جنرل یحییٰ خان نے ایک بار پھر مشرقی پاکستان کے حالات کو افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی پریشانی اور مایوسی کا موجب قرار دیا تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا کہ اس کے مقاصد میں جمہوریت کی بحالی اور ملک کے تمام حصوں کو مساوی انصاف کی فراہمی ہے اور اس مقصد کے لئے مشرقی پاکستان کے جائز مطالبات تسلیم کر لئے جانے چاہئیں۔ المختصر یہ کہ یحییٰ خان اور مجیب کے درمیان لوگوں کی یاددہانی کے لئے یہ چیزیں واضح تھیں کہ 26 مارچ کو اس نے اپنے مقاصد واضح اور صاف الفاظ میں بیان کر دیئے تھے۔ وہ اقتدار کی منتقلی چاہتا تھا اس لئے یحییٰ خان نے واضح الفاظ میں یہ کہا کہ نئے انتخابات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نیز اگرچہ عوامی لیگ پر سیاسی جماعت کی حیثیت سے پابندی عائد کی جا چکی ہے لیکن عوامی لیگ کے پلیٹ فارم سے منتخب قرار پانے والے اراکین قومی وصوبائی اسمبلی بدستور قومی وصوبائی اسمبلی کے رکن رہیں گے اور وہ انفرادی حیثیت سے اپنی استحقاقی حیثیت بھی برقرار رکھیں گے۔ یحییٰ خان نے کہا تمام اراکین اسمبلیوں کے رکن برقرار رہیں گے ماسوائے ان کے جو ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے یا پھر انہوں نے کونسل ایکٹ کی صریحاً خلاف ورزی کی اس دوران یحییٰ خان نے ایسے تمام اراکین اسمبلی سے جو کہ لسانی پارٹیوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے کہا کہ وہ آگے بڑھیں اور مشرقی پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کی تعمیر نو کریں۔

ہم یہ بات بھی یہاں واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اراکین قومی وصوبائی اسمبلی کی اسکریننگ پہلے ہی کی جا چکی تھی جس کے نتیجے میں 88 ایم این اے کلیئر کر دیئے گئے تھے لیکن انہیں مشورہ دیا گیا کہ ان اراکین کے باوجود وہ اسمبلی میں کوئی بڑا اپ سیٹ نہیں کر سکتے ایک اندازے کے مطابق نیشنل اسمبلی میں عوامی لیگ کے اراکین پیپلز پارٹی سے بڑھ جائیں گے تاہم وہ مکمل اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ یہ سب کچھ ناممکن نہیں تھا لیکن ہمارے لئے کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے کہ واقعی ایسی صورتحال تھی۔ اسی تقریر کے دوران جنرل نے کہا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نیشنل اسمبلی دستور کی تدوین کا کام سرانجام نہیں دے سکتی اس لئے ان پر دباؤ ہے کہ وہ آئین خود مرتب کریں اس مقصد کے لئے آئین میں ترمیم بھی منظور کرنا پڑے گی۔

سیاسی تصفیہ سے گریز

یحییٰ خان نے تمام پارٹیوں سے وعدہ کیا کہ جب آئین کا مسودہ تیار ہو جائے گا تو ان سے مشاورت ضرور کی جائے گی یہ حیران کن بات تھی کہ جنرل نے لیگل فریم ورک آرڈر خود دینے کا اعلان کیا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ سب سے زیادہ اشتعال انگیز اور حساس مسئلہ ہے۔

وہ اس طرح ہر مسئلے پر ایک نئے معرکے یا مہم جوئی کی دعوت دے رہے تھے۔ ان حالات میں جبکہ مشرقی پاکستان مکمل طور پر عوامی لیگ کے ساتھ اظہار یکجہتی کا مظاہرہ کر چکا تھا وہ ان حالات کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکے کہ کے اس نئے حکم سے درحقیقت وہ اپنے لیگل فریم ورک آرڈر کی ہی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور ایک ماہ کے تاخیری حربوں یا تعطل کے دنوں میں تشدد کے واقعات شروع ہو گئے تھے جس میں پاکستان اور پاکستانی افواج کے کئی بے گناہ افراد کی جان چلی گئی تھی۔ یحییٰ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان کے عوام میں آئین بنانے کی صلاحیت نہیں اور یہ صرف ان کی شخصیت ہے جو کہ انہیں نیا آئین دے سکتی ہے یہ وقت نہیں کہ ان کے اس تصور پر طبع آزمائی کی جائے۔ ہم صرف یہاں اس شخص کی سیاسی سوجھ بوجھ اور صلاحیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جب پاکستان کے عوام اس مشکل اور گمبھیر صورتحال میں تھے اس شخص نے اپنے آپ کو ملک کا اقتدار سنبھالنے کا اہل سمجھا اور 1969ء کے بحران کے بعد اسے ایک سیاسی حکومت گردانا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ جون سے اگست 1971ء کے درمیان مصالحت اور نظر ثانی کے لئے کتنا موزوں وقت تھا اس وقت سیاسی تجزیہ نگار اور حکومت میں شامل لوگ یہ سمجھتے تھے کہ فوجی ایکشن صرف امن قائم کرنے تک صحیح تھا اور اب اس مسئلے کا کوئی سیاسی حل نکل آنا چاہئے۔ جنرل یحییٰ بھی یہی سوچ رکھتے تھے سیاسی مسائل کو کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ سیاسی حل کیا ہے اور فوجی حل کیا ہے کیونکہ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فوج کی قوت کو کیسے استعمال کیا جائے۔ خصوصاً ایک حکومت' یہ یقیناً کسی حکومت کے لئے نیک

شگون نہیں تھا کہ وہ اپنے ہی عوام کے خلاف طاقت کا استعمال کرے۔ہم یہاں یہ دیکھنے سے ہی قاصر ہیں کہ عوامی لیگ کے رہنماؤں کے علاوہ کیا کوئی اور بااختیار شخصیت بھی تھی جو مشرقی پاکستان کے عوام کی جانب سے مذاکرات کرتی کیونکہ یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے نئے انتخابات سے انکار کے بیانات کے باوجود کبھی عوامی لیگ کے ساتھ مذاکرات کرنے میں سنجیدگی سے کوئی کوشش کی ہو۔اس سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں کسی قابل قبول عوامی لیگ کے رہنما کی عدم موجودگی کے باعث مذاکرات کے آغاز میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ عوامی لیگ کے رہنماؤں کی اکثریت اس وقت بیرون ملک فرار ہو چکی تھی یا پھر سرحد عبور کر کے بھارت چلی گئی تھی۔ یہ رہنما بیرون ملک اپنے حقوق کے لئے عالمی رائے عامہ کو ہمنوا بنانے میں مصروف عمل تھے۔ ویسے بھی شیخ مجیب اور ڈاکٹر کمال حسین کے سوا عوامی لیگ کے بیشتر سرکردہ رہنما بھارت جا چکے تھے۔ بہر حال یہ بات خاصی نامناسب اور ناقابل قبول ہے کہ ملک میں کوئی سرکردہ رہنما موجود نہیں تھا۔ شیخ مجیب بذات خود قید میں تھا اور جنرل یحییٰ خان کی صوابدید پر تھا ممکنہ حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ مجیب کو جنرل یحییٰ کے ساتھ مذاکرات کرنے کو کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیخ مجیب مذاکرات سے صاف انکار کر دیتا لیکن ہمیں محض ان نتائج کی توقع نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہاں اس بات کا امکان بھی پایا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے حالات اور افسوسناک صورتحال کے باعث اپنے دیگر ساتھیوں کی عدم موجودگی اور ان کے دباؤ سے آزاد ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان سے بھاری اکثریت سے منتخب ہونے اور سارے پاکستان میں اقتدار کے حصول کی خواہش کی خاطر شیخ مجیب الرحمٰن شاید نرم اور معتدل رویہ اختیار کرتا لیکن ہم یہ واضح کرتے چلیں کہ شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔

دوست ممالک کا انتباہ

یہاں پر ہم باوثوق طور پر یہ کہیں گے کہ جنرل یحییٰ کو باہر کے ملکوں بالخصوص دوست ممالک سے مذاکرات شروع کرنے کے لئے مشورے موصول ہو رہے تھے۔ یہ دوست ممالک جنرل یحییٰ کو صورتحال کی سنگینی اور ہر حال میں کسی نہ کسی طور پر صورتحال کے سیاسی حل کی اہمیت کا برابر احساس دلا رہے تھے کہ خواہ جیسے بھی ہو شیخ مجیب سے بات چیت ضرور کی جائے۔ اگر چہ

جنرل یحییٰ ان بااثر اور دوست غیر ملکی شخصیات کو سیاسی حل پر آمادگی اور رضامندی کا یقین دلا رہا تھا لیکن بہر حال ایک نکتے پر وہ بہت بضد تھا اور وہ یہ کہ شیخ مجیب سے کوئی بات نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے برعکس شیخ مجیب کو غداری کے الزامات پر ملٹری ٹریبونل کے حوالے کیا گیا۔ہم یہاں ایک لمحے کے لئے بھی یہ فیصلہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے کہ آیا قانون کے مطابق شیخ مجیب غداری کا مرتکب ہوا تھا یا نہیں اگر چہ ہم سب جج ہیں اور جرم کی قانونی حیثیت کے بارے میں بڑے حساس ہیں لیکن بالخصوص غداری جیسا جرم بہر حال کسی سیاسی بحران کے حل کے لئے بے معنی حیثیت رکھتا ہے جو کہ اس وقت ملک کو درپیش تھا۔ہم نے کسی صوبے میں ثبوت یا شواہد کے بارے میں استفسار نہیں کیا جس کی تحقیق اور اس پر غور سے ہی بہر حال ہم مناسب طور پر انصاف کر سکیں گے۔لیکن آخر اس مقدمے کا مقصد کیا تھا کیا اس کا مقصد محض شیخ مجیب الرحمٰن کو اس معمول کے طریقے کے مطابق سزا دینا تھا جس کے ذریعے قانون تمام جرائم میں اپنا راستہ اختیار کرتا ہے یا دنیا اور پاکستانی عوام کے سامنے یہ ثابت کرنا تھا کہ مجیب الرحمٰن نہ صرف سیاسی غلطیوں کے مرتکب تھے بلکہ وہ سنگین اور قوم دشمن جرائم میں ملوث تھے؟ اگر اس کا یہ مقصد تھا تو اس مقصد کو ایک ملٹری کورٹ کے سامنے اور وہ بھی بند کمرے میں چلا کر بمشکل حاصل کیا جا سکا اور جس کی کارروائی کے بارے میں عوام کو ذرہ برابر بھی پتہ نہ چل سکا۔ہم اس کا مقابلہ شیخ مجیب الرحمٰن کے لیے اگرتلہ سازش کیس کے مقدمے سے کرتے ہیں جس کی صدارت پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے تین ججوں نے کی اور جس کی پریس میں زبردست تشہیر بھی کی گئی۔اس کے مقابلے میں یہاں عوام اس بات سے بے خبر تھے کہ مقدمہ کب شروع ہوا اور کہاں چلا اور کب ختم ہوا۔ اس حقیقت کی بڑی تشہیر کی گئی کہ مجیب الرحمٰن کو اپنے دفاع کے لئے اپنی مرضی کا ممتاز وکیل حکومت کے اخراجات پر کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔لیکن ہمارے سامنے جو شہادت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں اگر چہ مقدمے کی سماعت کے دوران مجیب الرحمٰن نے کارروائی میں حصہ لیا لیکن بعد میں جب انہیں معلوم ہوا کہ جنرل یحییٰ نے 26 مارچ 1971ء کو قوم سے اپنے نشری خطاب میں کھلم کھلا انہیں غدار قرار دیا تھا اور اعلان کیا کہ انہیں (مجیب الرحمٰن) جرم پر کڑی سزا دی جائے گی تو انہوں نے اپنے آپ کو مقدمے کی کارروائی میں شرکت سے الگ کر لیا۔اس ٹریبونل کے پریذائڈنگ افسر نے ہمارے سامنے گواہی کے دوران بتایا کہ اگر چہ فوجی عدالتوں کی روایت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کے لئے وجوہ بھی تحریر کریں۔اس خاص

مقدے میں جنرل یحیٰ کی خصوصی ہدایت پر ایک تفصیلی فیصلہ تیار کیا گیا تھا جس میں وجوہ موجود تھیں۔ اگرچہ اس فیصلے کا بھی اعلان نہیں کیا گیا۔

سازشی کردار

مشرقی پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ مذاکرات کے دوسرے امکانات بھی تھے۔ مثال کے طور پر عوامی لیگیوں کے ساتھ ہمارے بیرون ملک سفارت خانوں میں سے ایک کے ذریعے رابطے قائم کیے گئے لیکن اس ملاقات کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ اور ہم اس تاثر میں رہے کہ یہاں حکومت کی طرف سے ایسے مذاکرات میں شامل ہونے کے لئے کسی گہری دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ہمیں اسی امکان کے بارے میں بتایا گیا جس سے بھارت کے ساتھ بھی براہ راست مذاکرات کا عندیہ ملتا تھا جس کا مشرقی پاکستان میں بغاوت میں ہاتھ بھی ہوسکتا تھا اور جسے اس وقت چھپانے کے بارے میں مشکل سے ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے اور جس کے مستقبل میں کھل کر مداخلت کرنے کے بارے میں واضح طور پر معلوم تھا۔ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں حکومت پاکستان کے ایک سیکرٹری اس پاکستانی وفد کے سربراہ تھے جس نے بھارتی وفد سے ملاقات کی۔ بھارتی وفد کی سربراہی کابینہ کے ایک وزیر کر رہے تھے۔ دونوں وفود کے عہدوں میں واضح فرق نظر آیا۔ بھارتی وزیر نے سیکرٹری سے رابطہ کر کے بتایا کہ بھارت مختلف معاملات پر بات چیت کے لئے تیار ہے۔ وطن واپس آ کر سیکرٹری نے صدر یحیٰ خان سے ملاقات کی کوشش کی کیونکہ پیغام پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی اور اس وقت حکومت کی صورتحال یہ تھی کہ سیکرٹری صاحب کی صدر کے ساتھ براہ راست کوئی رسائی نہ تھی۔ تاہم ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسی حکومت جس میں کوئی وزیر موجود نہ ہو تو سیکرٹری صاحب کو وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے صدر مملکت تک رسائی میں کوئی مشکل پیش آنی نہیں چاہیے تھی۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ انہیں ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود اپنے انٹرویو کے لئے اجازت نہیں مل سکی۔ انہوں نے کافی کوششوں اور وقت کے زیاں کے بعد جنرل پیرزادہ کے پرنسپل اسٹاف افسر سے ملاقات میں کامیابی حاصل کر لی لیکن حکومت معاملات کو سلجھانے میں ناکام رہی۔ ہم یہاں پر یہ تجویز نہیں کر رہے کہ سیکرٹری کا لایا ہوا پیغام واقعی نتیجہ خیز ثابت ہوتا اور اس میں ناکامی بھارت کا رویہ تبدیل کرنے کی اہم وجہ بن جاتی جس کا بعد میں بھارت کی جانب سے مظاہرہ کیا گیا۔ ہم یہاں پر یہ

تجویز بھی نہیں کرتے کہ عوامی لیگ کے رہنماؤں یا شیخ مجیب کے ساتھ مذاکرات میں اس دوران میں صدر پاکستان نے یہ اعلان کیا کہ وہ نشستیں جو خالی ہوئی ہیں مشرقی پاکستان کے قومی اسمبلی کے ممبران نہ ہونے کی وجہ سے یا جو ممبران صحیح معنوں میں اس کے مستحق نہ تھے تو یہ نظریہ تسلیم شدہ رائے میں ایک قسم کا دھوکہ تھا۔ یہ سوچا جا رہا تھا کہ انتخاب کی کارروائی مشکل ثابت ہوگی جب تک کہ مختلف جماعتیں نشستوں پر تقسیم میں کوئی طریقہ کار نہ بنائیں اور نشستوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ منتخب شدہ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو۔ ایسے انتظام کو باوقار بنانے کی کوشش محض ایک حماقت معلوم ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتیں آپس میں کوئی اتفاق نہیں کر سکیں اور اس سلسلے میں جنرل فرمان علی نے جماعتوں کے درمیان ایک سازشی کا کردار ادا کیا اور صحیح معنوں میں انہوں نے ہی امیدواروں کا انتخاب کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ الیکشن کے سلسلے میں کوئی کام شروع نہیں ہوسکا اور 28 جون کی تقریر تاریخ کا ایک حادثہ معلوم ہوتی ہے۔ عام انتخابات کے پہلے جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا وہ ملک کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا تھا جنرل یحیٰ نے کم وبیش ایک سال کا موقع اس الیکشن کی تیاری کے سلسلے میں فراہم کیا۔ اسی جنرل یحیٰ نے ایسے خیالات کے معاملے میں کچھ بھی نہیں کیا جو ملک کی سالمیت کے خلاف تھے یا جو لیگل فریم ورک آرڈر کے اصولوں کے منافی تھے۔

منتخب افراد کو اپنے امیدوار ہونے کا بھی علم نہیں تھا

جن جماعتوں کے امیدواران مخصوص ضمنی انتخابات میں کامیاب ہو گئے تھے خود ان کے لیڈروں نے ہمارے سامنے بیان دیا کہ یہ الیکشن شرمناک تھے۔ بعد میں ہمیں ان افراد کے بارے میں بتایا کہ جو ان انتخابات میں کامیاب ہو گئے تھے اور جو یہ تک نہیں جانتے تھے کہ وہ امیدوار بھی ہیں جو لوگ اس طریقے سے منتخب ہوئے ہوں ان کے بارے میں یہ سمجھنا کہ انہیں عوام کا اعتماد حاصل ہے اور وہ ان کی جانب سے مذاکرات کرنے کی پوزیشن میں ہیں بے معنی امید کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ فوجی ایکشن کے بعد سیاسی حل کی تلاش کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی اور اس شک کو مزید گہرا کرنے کی بھی وجوہ ہیں کہ ایسا کوئی مقصد بھی تھا۔

یہ کہنا باقی ہے کہ جون 1971ء کی نشری تقریر میں اس امر کے بارے میں کسی وقت -

کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کب سے ہوگا۔ تاہم اس بات پر زور دیا تھا کہ حکومت اقتدار کی منتقلی کے بارے میں سوچنے سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ ملک میں حالات مناسب حد تک معمول پر آ جائیں جو کچھ کہا گیا وہ یہ تھا کہ اقتدار جتنی جلد ممکن ہوا منتقل کیا جائے گا۔ ایک اندازہ کے مطابق چار مہینے کی مدت کی نشاندہی کی گئی تھی اگرچہ صحیح وقت کا انحصار اس وقت کی داخلی اور خارجی صورتحال پر تھا۔

28 نومبر 1969ء کو جنرل یحییٰ خاں کی نشری تقریر

ضمیمہ الف

میرے پیارے ہم وطنو! میں نے پچھلی بار آپ سے 28 جولائی کو خطاب کیا تھا اس وقت سے اب تک ملک کے مختلف شعبوں میں متعدد نئے واقعات رونما ہو چکے ہیں اور میری حکومت نے متعدد خاص اقدامات بھی کئے ہیں تا کہ ملک کو ان بڑے مقاصد کی طرف آگے بڑھایا جائے جن کی میں نے اس نشری تقریر میں نشاندہی کی تھی اس وقت ملک کو بعض سنگین مسائل کا سامنا ہے اور مرکزی وصوبائی کے متعلقہ شعبہ جات' ان مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ سیاسی اور آئینی مسائل سے قطع نظر سب سے زیادہ تشویشناک بات میرے نزدیک یہ ہے کہ جو کم آمدنی والے طبقات کو زیادہ متاثر کرتی ہے اور وہ ہے ہوش ربا مہنگائی اور گرانی۔ بنیادی ضرورت کی اشیاء مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہیں اور یہ نتیجہ ہے کہ اس معاشی اور اقتصادی صورتحال کا جو موجودہ حکومت کو ورثے میں ملی ہے۔ مختصراً میں ان اقدامات کا ذکر کروں گا جو موجودہ حکومت اس اہم مسئلے سے نمٹنے کے لئے کر رہی ہے! جہاں تک مشرقی پاکستان میں اناج کی قیمتوں کا سوال ہے ناسازگار حالات کی بناپر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں سترہ لاکھ ٹن اناج کی کمی ہے جس کا ناگزیر اثر اس کی قیمتوں پر پڑ رہا ہے۔ تاہم حکومت اس کمی پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے! پانچ لاکھ ٹن گندم اور چاول مغربی پاکستان سے روانہ کیا جا رہا ہے اور تقریباً دس لاکھ ٹن گندم امدادی پروگرام پی ایل 480 کے تحت فوری طور پر امریکہ سے درآمد کرنے کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ تین لاکھ پچاس ہزار ٹن گندم اور چاول' مختلف پروگراموں کے تحت برما' جاپان' مغربی جرمنی' کینیڈا' آسٹریلیا اور

فرانس سے درآمد کرنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں اناج کی قیمتوں میں خاصی حد تک کمی واقع ہو رہی ہے۔ دونوں صوبوں میں کھانے کے تیل کی مقدار میں بھی اضافے کے لئے ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ہم قیمتوں کی صورتحال کا برابر جائزہ لیتے رہیں گے۔ یہ معاشی مسائل اس سنگین چیلنج کا ایک حصہ ہیں جو غربت اور جہالت کے خاتمے کے لیے اس حکومت کو درپیش ہے۔ ہماری ضروریات ہر شعبے اور سمت میں برابر بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ہماری آبادی میں ہر سال چالیس لاکھ نفوس کا اضافہ ہوتا ہے ہمارے شہری علاقوں میں بھی مسلسل توسیع ہوتی جا رہی ہے۔ عوامی سہولتوں اور سماجی خدمات کے شعبوں پر بھی خاصا دباؤ ہے چنانچہ محدود وسائل کے باوجود ہمیں ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے عوام کی زندگی کو بامعنی بنانا ہے اور ان کے حالات زندگی کو مزید بہتر بنانا ہے جس کے لئے ایک طے شدہ اور منظم قومی جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ جس دوسرے موضوع پر میں بات کرنا چاہتا ہوں وہ سرکاری اداروں میں پایا جانے والا کرپشن اور بدعنوانی ہے! حکومت کی جانب سے کی جانے والی تحقیقات سے سرکاری افسران میں سنگین نوعیت کی بدعنوانیوں' سرکاری حیثیت کے ناجائز استعمال اور ناجائز کاموں کے ثبوت ملے ہیں۔ ان تمام افسران اور اہلکاروں کے خلاف الزامات کا بغور جائزہ لینے کے بعد مارشل لا کے تحت ضروری تادیبی اقدامات کئے جائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس سے دیگر متعلقہ لوگوں کو عبرت حاصل ہوگی۔ افسران کو چاہئے کہ وہ دل و جان سے اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کرتے رہیں۔ میں اس سے پیشتر بھی اس امر کی جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی تشکیل دوں گا جو ملک میں سول سروسز کے ڈھانچے کی از سر نو تنظیم کرے گی۔ آپ کو جان کر خوشی ہوگی کہ ایسی کمیٹی کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ جس کی تمام تر تفصیلات اور دائرہ کار کے بارے میں دیگر معلومات پریس کو جاری کی جا چکی ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اس طرح ملک کو ایک صاف ستھری اور مؤثر انتظامیہ میسر آ سکے گی۔ جیسا کہ آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ مرکز میں وزراء کونسل کے قیام اور صوبوں میں گورنروں کے تقرر کے بعد مارشل لا کا کوئی تعلق روزمرہ کے سول انتظامی معاملات سے باقی نہیں رہا۔ تاہم یہ انتظامیہ کی نہ صرف یہ کہ پشت پناہی کرتا رہے گا بلکہ ضرورت پڑی تو ضروری مدد اور تعاون بھی فراہم کرے گا۔ آپ میں سے بہت سوں کے لئے مارشل لا کا اس طرح پس منظر میں چلے جانا مایوسی کا باعث

ہوگا تاہم میرا بنیادی مقصد چونکہ ہمیشہ سے سول حکومت کی بحالی رہا ہے اس لئے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اب محنت، تعلیم اور زرعی اصلاحات کے بارے میں کچھ باتیں! تاجر اور مزدور کے تعلقات کے حوالے سے ایک نیا آرڈیننس جاری کر دیا گیا ہے جس کی رو سے اجتماعی سودے کاری کو بحال کر دیا گیا ہے جسے مزدور اور آجر صنعتی پیداوار کے بہترین مفادات میں استعمال کریں گے۔ میں دونوں فریقوں پر زور دوں گا کہ وہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائیں کہ اس آرڈیننس کو باہمی مفاد کے ساتھ ساتھ قومی مفاد کے لئے بھی استعمال کیا جائے گا۔

جہاں تک تعلیمی اصلاحات کا تعلق ہے میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت جلد وزراء کونسل اس سلسلے میں اپنے حتمی فیصلے کا اعلان کر دے گی۔ اب میں ان سیاسی اور آئینی مسائل کی طرف آتا ہوں جو اس ملک کو درپیش ہیں' اپنے پچھلے خطاب میں' میں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ملک کے سیاسی لیڈر مستقبل کے آئین کو درپیش چند بڑے مسائل پر اتفاق رائے کا مظاہرہ کریں گے تاہم مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔ ہمیں ان کی دشواریوں اور مجبوریوں کا پورا احساس ہے اور میں نے انفرادی طور پر ان سیاسی لیڈروں سے مذاکرات بھی کئے ہیں تاکہ آئین کو درپیش مسائل حل کئے جا سکیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ آئین سازی کے معاملے پر کوئی اتفاق رائے نہیں کر سکے؛ تاہم میں اس سلسلے میں ان سب کے خیالات اور نظریات سے بخوبی آگاہ ہو چکا ہوں۔ اس ملک کی انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے میرا بنیادی مطمح نظر یہ رہا ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے لیکن یہ مقصد ایک لیگل فریم ورک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو فی الوقت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہونے کی حیثیت سے اس معاملے میں پیش رفت کروں۔ میں نے اس مسئلے پر خاصا غور و خوض کیا ہے اور چار ایسے امکانی طریقہ ہیں' جن کی بنیاد پر لیگل فریم ورک تشکیل دیا جا سکتا ہے جس کے تحت عام انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ پہلا متبادل طریقہ یہ ہے کہ ایک منتخب شدہ آئینی کونشن کے ذریعے نئے آئین کی تشکیل کرنے کے بعد اس کونشن کو تحلیل کر دیا جائے دوسرا متبادل یہ ہے کہ 1956ء کے آئین پر نظر ثانی کی جائے لیکن اس طریقے کی ملک کے دونوں صوبوں میں بڑے پیمانے پر مخالفت موجود ہے کیونکہ اب اس آئین کے کچھ نکات مثلاً ون یونٹ اور پیریٹی (مساوات) عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہیں! تیسرا متبادل یہ ہے کہ آئین کی تشکیل کرنے کے

بعد اس پر پورے ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے۔ چوتھا اور آخری متبادل یہ ہے کہ متعدد سیاسی لیڈروں اور جماعتوں سے باہمی مشاورت کے بعد قومی انتخاب کے لئے ایک لیگل فریم ورک وضع کیا جائے جو عارضی نوعیت کا حامل ہو۔

میں نے محتاط انداز سے غور و فکر کرنے کے بعد اس چوتھے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے قومی اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد کے لئے لیگل فریم ورک وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ میں جولائی میں اپنے خطاب میں تذکرہ کر چکا تھا۔ اس طرح مجھ پر یہ عیاں ہو گیا کہ ایک قوم کی حیثیت سے آئینی میدان میں ہمیں جن تین اہم مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں پہلا مسئلہ ون یونٹ دوسرا مسئلہ ایک آدمی ایک ووٹ بمقابلہ پیریٹی اور تیسرا مسئلہ مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کا ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے ملک میں ہونے والے آئینی مباحث سے میں یہ بات سمجھ سکتا تھا کہ ان آئینی مسائل میں سے پہلے دو مسائل کو عام انتخابات سے قبل حل کیا جانا ضروری ہے کیونکہ ان کا تعلق انتخابات کی اساس اور قومی اسمبلی کی تشکیل سے ہے۔

جہاں تک دیگر آئینی مسائل جیسا کہ پارلیمانی' وفاقی طرز حکومت' براہ راست بالغ رائے دہی' شہریوں کے بنیادی حقوق اور عدالتوں کے ذریعے ان کا نفاذ' عدلیہ کی آزادی اور آئین کے محافظ کے طور پر اس کا کردار اور آئین کا اسلامی کردار جس سے وہ آئیڈیالوجی محفوظ ہونی چاہیے جس سے پاکستان تخلیق پایا۔ ان امور پر کوئی عدم اتفاق نہیں اور تصفیے کے لئے ان پر غور ہو سکتا ہے۔

تین بنیادی مسائل سے متعلق جن کا میں نے حوالہ دیا آرا منقسم تھیں۔ میں نے اپنے گزشتہ خطاب میں یہ واضح کر دیا تھا کہ یہ کسی طور الیکشن ایشوز نہیں ہوں گے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ان مسائل کے حوالے سے اختلافات کم ہونا شروع ہو گئے ہیں جو ایک اچھی علامت ہے۔

اگرچہ رسمی آل پارٹی میٹنگز نہیں ہوئی ہیں لیکن بیشتر سیاسی جماعتیں پارٹی اجلاس اور پریس دونوں کو دیئے گئے بیانات کے ذریعے اب اپنی سوچ میں ان مسائل کے بہت قریب آ گئی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں کے دوروں کے دوران بھی مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ ان مسائل پر مختلف طبقات اور لوگوں کے گروپوں کے درمیان بمشکل ہی کوئی اختلاف ہو گا جس سے میرے ابتدائی ردعمل کو مزید تقویت حاصل ہوئی کہ یہ امور انتخابی ایشوز نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ گفتگو کے قدرتی عمل اور سنجیدہ فکر کے ذریعے ہم ان مسائل کے حل کے سلسلے میں بہت قریب ہیں اور

اگر انتخابات کے دور میں ان مسائل کو دوبارہ اٹھایا گیا تو یہ بڑے نقصان کا سبب ہوگا۔ ان مسائل سے جذباتی بنیادوں پر غیر ضروری تلخیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور یہ پرامن منتقلی اقتدار میں تاخیر کا سبب ہو سکتا ہے۔ میں اب اس کا خلاصہ پیش کروں گا جسے میں ان تین اہم مسائل پر عمومی طور پر قابل قبول خیالات تصور کرتا تھا۔

ون یونٹ کے سوال پر یہ عمومی خواہش سامنے آئی کہ پورے مغربی پاکستان کے لئے ون یونٹ کے موجودہ انتظام بجائے صوبے بحال کئے جائیں۔

ایک آدمی ایک ووٹ کے سوال پر بھی ملک کے طول وعرض میں یہ بات تسلیم کی جارہی تھی کہ کسی بھی جمہوری طرز حکومت کے لئے یہ بنیادی ضرورت ہے اور ایسا نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی حصے میں بھی ہونا چاہئے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جارہا تھا کہ ہمیں اپنی نمائندگی کے لئے اسی طریقے کو بنیاد بنانا چاہئے۔

ون یونٹ ختم کردیا جائے گا

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ون یونٹ کا مسئلہ اور نمائندگی کا نظام طے ہوجائے تو انتخابات کا انعقاد ہوسکتا ہے اور ملک کے آئین کو حتمی شکل دینے کے لئے ایک مشینری قائم ہوسکتی ہے اس لئے میں نے حسب ذیل خطوط پر ان دو مسائل کو حل کرنے کا فیصلہ کیا۔

ون یونٹ ختم کردیا جائے گا اور صوبے قائم کئے جائیں گے میں یہاں اس بات کا اضافہ بھی کروں گا کہ ون یونٹ کو ایگزیکٹو آرڈرز کے تحت تخلیق کیا گیا تھا جس کی منظوری صوبائی قانون ساز اداروں اور دوسری مجلس قانون ساز نے بھی دی تھی۔ 1957ء میں مغربی پاکستان کے قانون ساز ادارے نے ون یونٹ کے خاتمے کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر 1958ء میں مارشل لا نافذ نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ ون یونٹ کا خاتمہ بہت پہلے ہوچکا ہوتا۔ میں آپ کو یہاں یہ یاددلادوں کہ جب پاکستان قائم ہوا تھا تو یہ ون یونٹ کی بنیاد پر نہیں بنا تھا۔ بلکہ یہ مغربی حصے کے مختلف صوبوں کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔

مشرقی اور مغربی پاکستانی دونوں کے عوام تقریباً متفقہ طور پر ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ کررہے تھے اس لئے میرے فیصلے کی بنیاد عوامی خواہش پر ہے۔

ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول

اسی طرح عوام کی امنگوں کا احترام کرتے ہوئے میں نے ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول کو تسلیم کرلیا اور یہ جمہوری اصول مستقبل کی قومی اسمبلی کے لئے ہونے والے انتخابات کی بنیاد ہوگا۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات سے متعلق آپ میرے جولائی کے نشریاتی خطاب کو یاد کریں۔ میں نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو بڑے قومی مسائل پر فیصلوں کے عمل میں بھرپور نمائندگی حاصل نہیں۔

پھر میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ریاستی امور پر مطمئن نہ ہونے میں حق بجانب ہیں۔ اس لئے ہمیں اس پوزیشن کو ختم کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہوگی کہ ملک کی سلامتی اور قومی اتحاد کو برقرار رکھ کر پاکستان کے دونوں حصوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان تعلقات کا ایک اہم پہلو آج پاکستان کا مالیاتی اور اقتصادی شعبہ ہے۔ فیڈریشن کا مفہوم نہ صرف قانون سازی کے اختیارات کی تقسیم بلکہ مالیاتی اختیارات کی تقسیم بھی ہوتا ہے۔ اس مسئلے سے اس انداز سے نمٹا جائے گا کہ اس سے صوبوں کی ضروریات اور مطالبات کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر پوری قوم کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام کو اپنے اقتصادی ذرائع اور ڈویلپمنٹ پر اس وقت تک کنٹرول ہونا چاہئے جب تک کہ وہ مرکز میں قومی حکومت کی کارکردگی کو متاثر نہیں کرتا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ تاریخ' ثقافت اور روحانی ورثے کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

اس لئے اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم پاکستان میں صوبوں اور مرکز کے درمیان اطمینان بخش تعلقات کا وضع کرنے کے اہل نہ ہوں۔ تاہم دونوں صوبوں کے عوام مساوی اور قابل احترام شراکت دار کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔

اب میں آپ کو اس ٹائم ٹیبل کی تفصیلات سے آگاہ کروں گا جس پر ہمیں عوام کے

منتخب نمائندوں کو اختیارات منتقل کرنے کے لئے کام کرنا چاہئے۔ پہلے یہ کہ انتخابات کے انعقاد کے لئے عبوری لیگل فریم ورک 31 مارچ 1970ء تک تیار ہو جائے گا۔ اگلی بات یہ کہ چیف الیکشن کمشنر پہلے ہی یہ اعلان کر چکے ہیں کہ انتخابی فہرستیں جون 1970ء تک تیار ہو جائیں گی۔

انتخابی فہرستوں کی تیاری کے ساتھ ہی الیکشن کمشنر لیگل فریم ورک کی دفعات کے مطابق مرکزی اور صوبائی انتخابات کے لئے دونوں کی حلقہ بندی کے تعین میں مصروف ہو جائے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں حلقہ بندی کے تعین کو اعتراضات کی سماعت کے بعد ہی حتمی شکل دی جائے گی بشرطیکہ لوگوں کی طرف سے اعتراضات آئیں۔ اس لئے اس مقصد کے لئے بھی کچھ وقت دینا ہوگا۔

مزید براں مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں حصوں میں انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں یکم جون سے ستمبر کے اختتام تک موسم کی وجہ سے مشکلات بھی ہوں گی۔ اس لئے میں نے ملک میں 5 اکتوبر 1970ء کو عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ صوبائی انتخابات اس وقت کرائے جائیں گے جب قومی اسمبلی اپنے ہدف آئین کی تیاری کے کام کو مکمل کرے گی۔ قومی اسمبلی کو اپنے پہلے اجلاس کے بعد سے یہ کام 120 دن میں مکمل کرنا ہوگا۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر قومی اسمبلی یہ مخصوص مدت گزرنے سے پہلے اپنے کام کو حتمی شکل دے سکے۔ اگر اس مخصوص مدت کے اختتام تک اسمبلی یہ کام مکمل نہیں کر سکی تو قومی اسمبلی کو توڑ دیا جائے گا اور قوم کو ایک بار پھر انتخابات کے عمل سے گزرنا ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ وقوع پذیر نہ ہو۔ اس لئے میں مستقبل کے منتخب نمائندوں پر زور دوں گا کہ وہ اس مقصد کو بھرپور احساس ذمہ داری اور حب الوطنی کے ساتھ حاصل کریں۔

امن وامان برقرار رکھنے کا عزم

جہاں تک قومی اسمبلی میں ووٹنگ کے طریقہ کار کا تعلق ہے تو اس بات کو سراہا جانا ضروری ہے کہ اسمبلی بنیادی آئینی مسائل طے کرے گی۔ آئین مقدس دستاویز ہے۔ اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کا معاہدہ ہے۔ اس کا کسی عام قانون کے ساتھ موازنہ نہیں ہو سکتا اس لئے یہ ضروری ہے کہ ووٹنگ کا طریقہ کار اسمبلی خود وضع کرے جو پاکستان کے تمام علاقوں کے نمائندوں کے لئے منصفانہ اور صاف ستھرا ہونا چاہئے۔ جب اسمبلی اپنا یہ کام پورا کر لے اور اس کا تشکیل کردہ آئین منظور ہو جائے تو اسے پاکستانی آئین کی حیثیت دے دی جائے اس طرح نئی حکومت کے قیام کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔ تاہم ان تمام سرگرمیوں اور کارکردگی کے دوران مارشل لا کو اعلیٰ ترین قانون کی حیثیت حاصل رہے گی تاکہ پرامن انتقال اقتدار کے پروگرام کو ضروری تائید اور حمایت فراہم کرتے ہوئے عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار سونپ دیا جائے۔

میرے عزیز ہم وطنو! میں ایک مرتبہ پھر آپ سے کہوں گا کہ ہم اپنی قومی زندگی کے انتہائی مشکل اور کٹھن دور سے گزر رہے ہیں چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس حقیقت کا قرار واقعی ادراک کرتے ہوئے سنجیدہ، بامقصد اور حب الوطنی پرمبنی رویے کا ثبوت دے۔ آیئے ہم سب مل کر اپنے ذاتی مفادات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ عہد کریں کہ ہم اپنی بساط بھر پوری کوشش کریں گے کہ قوم کو مضبوط اور خوشحال بنائیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے آپ کے سامنے ایک پروگرام رکھ دیا ہے جس کے بارے میں پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے عوام اسے شرف قبولیت بخشیں گے کیونکہ یہ پروگرام پاکستان کے مفادات کے عین مطابق ہے۔ مجھے اپنے عوام پر کامل یقین اور اعتماد ہے مجھے اپنے ملک کی تقدیر پر بھی پورا بھروسہ ہے جو ایک نظریئے کی بنیاد پر قائم ہوا اور جس کے لئے دس لاکھ مسلمانوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی تھی۔ تحریک پاکستان کی اصل بنیاد جمہوریت ہی تھی اور میری مخلصانہ خواہش ہے کہ ہم ان جمہوری اصولوں کو کبھی فراموش نہ کریں۔ آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق یکم جنوری 1970ء سے پورے ملک میں

سیاسی سرگرمیاں مکمل طور پر بحال کر دی جائیں گی اور ان سرگرمیوں کو ممنوع قرار دینے والا مارشل لا ضابطہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں جمہوریت کی بحالی کے راستے میں کسی بھی رکاوٹ کو قطعاً برداشت نہیں کروں گا۔ کوئی بھی فرد یا گروہ جو امن و امان کا مسئلہ پیدا کرے گا یا تشدد آمیز حرکتوں میں ملوث پایا جائے گا حکومت اس سے سختی کے ساتھ نمٹے گی کیونکہ جمہوریت صبر و برداشت اور رواداری کا سبق دیتی ہے نہ کہ تشدد اور جارحیت کا چنانچہ تمام سیاسی سرگرمیوں کو اخلاقی دائروں کے اندر رہنا ہوگا جس کے سلسلے میں جلد ہی ہدایات جاری کر دی جائیں گی۔ آیئے ہم سب آگے بڑھیں اور پر امن انتقال اقتدار کے اس عمل کو کامیاب بنائیں۔

نئے آئین کے بارے میں عوامی لیگ کی تجاویز

ہرگاہ کہ 25 مارچ 1969ء کے اعلان مارشل لا کے تحت تمام اختیارات میں نے یعنی جنرل آغا محمد یحییٰ خان (ہلال پاکستان۔ ہلال جرأت) نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے سنبھال لئے تھے جس کے بعد صدر پاکستان کا عہدہ بھی میرے پاس تھا۔ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کی غرض سے انتخاب منعقد کیے گئے تھے؛ تاہم اس مقصد کے لئے ملک میں ایسی فضا قائم ہونا ضروری تھی جس میں پاکستان کے لئے جلد از جلد ایک آئین تشکیل دیا جا سکے؛ جس کے لئے مارشل لا اٹھایا جانا ضروری ہے۔ لہٰذا میں جنرل آغا محمد یحییٰ خان یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان سے مارشل لا اٹھا لیا گیا ہے اور 25 مارچ 1969ء کا یہ اعلان دونوں صوبوں میں اس وقت سے فوری طور پر منسوخ تصور کیا جائے گا جب دونوں صوبائی گورنر اپنے اپنے عہدوں کا حلف اٹھا لیں گے اور کسی بھی صورت میں آج کے بعد سات یوم کے اندر اندر پورے ملک میں یہ اعلان منسوخ سمجھا جائے گا۔

1- یہ اعلان تمام سابقہ قوانین پر فوقیت رکھتا ہے چنانچہ یہ اعلان اور اس کے تحت دیے جانے والے تمام احکامات دیگر قوانین میں موجود برعکس صورتحال کے باوجود مؤثر اور نافذ العمل رہیں گے۔

2- تعریف۔ اس اعلان میں تاوقتیکہ موضوع اور سیاق و سباق میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے الفاظ کی تعریف اور مفہوم یہ لیا جائے گا۔

(الف) ''مرکز'' کا مطلب ہے ''جمہوریہ''

(ب) مرکزی حکومت کا مطلب ہے جمہوریہ کی انتظامی حکومت۔

(ج) ''وفاق کے زیر انتظام علاقے'' اس سے مراد وہ علاقے لئے جائیں گے جو پراونس آف ویسٹ پاکستان (ڈس سولیوشن) آرڈر 1970ء میں بیان کئے گئے ہیں۔

(د) ''یوم آغاز'' اسکا مطلب ہے وہ دن جس سے یہ حکم نافذ العمل ہوگا۔

(ہ) عارضی مدت۔ اس کا مطلب ہے وہ مدت جو یوم آغاز لے کر قومی اسمبلی کے تشکیل کردہ آئین کے نفاذ تک جاری رہے گی۔

(و) اسلام آباد دارالحکومتی علاقہ۔ اس کا مطلب ہے وہ علاقہ جو پراونس آف ویسٹ پاکستان (ڈس سولیوشن) آرڈر 1970ء میں بیان کیا گیا ہے۔

(ز) سابقہ آئین۔ اس کا مطلب ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین مجریہ 1962ء۔

3- مارشل لا۔ اس کا مطلب ہے 25 مارچ 1969ء کے اعلان کے تحت نافذ کردہ مارشل لا۔

(ط) مارشل لا اتھارٹی۔ اس سے مراد ہوگا کوئی بھی شخص یا افراد کا گروہ یا کوئی عدالت جسے کسی بھی مارشل لا ضابطے یا مارشل لا آرڈر کے تحت عمل کا اختیار یا اختیار کے استعمال کا حق دیا گیا ہو

(ی) مارشل لا کا دور۔ اس کا مطلب ہے 25 مارچ 1969ء سے شروع ہونے والا اور یوم آغاز سے فوری پیشتر ختم ہونے والا دور۔

(ک) ''قومی اسمبلی'' صدر کے حکم نمبر 2 '1970ء کے تحت منتخب ہونے والی قومی اسمبلی۔

(ل) صدر۔ اس کا مطلب ہے صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

(م) جمہوریہ۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

(ن) شیڈول۔ اس کا مطلب ہے حکم نامے کا نظام الاوقات۔

(ش) ''بنگلہ دیش کا صوبہ'' اس کا مطلب وہ علاقہ ہوگا جو یوم آغاز سے فوری قبل صوبہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔

(ع) مغربی پاکستان کے صوبے۔ ان کا مطلب ہے وہ علاقے جو بالترتیب صوبہ

پنجاب، صوبہ سندھ، صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے ناموں سے یوم آغاز قبل جانے جاتے تھے۔

(ق) صوبائی اسمبلی۔ اس کا مطلب ہے کسی صوبے کی اسمبلی۔

(ت) صوبائی حکومت۔ کسی صوبے کی انتظامی حکومت۔

(ق) صوبائی مجلس قانون ساز۔ کسی صوبے کی مجلس قانون ساز۔

4- اعلان مارشل لا کی منسوخی۔

25 مارچ 1969ء کے اعلان مارشل لا کی منسوخی کے بعد مارشل لا اتھارٹی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اتھارٹی میں عدالتیں اور افراد شامل ہیں جن کو اس اعلان کی رو سے اختیارات ملے تھے۔

5- مارشل لا ضابطوں کی منسوخی اور موجودہ قوانین کا نافذ العمل ہونا۔

(a) تمام مارشل لا ضابطے اور احکامات بشمول عارضی آئینی حکم منسوخ قرار دیئے جاتے ہیں۔

(b) اعلان سے مشروط تمام موجودہ قوانین اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے تاوقتیکہ انہیں مناسب قانون سازی کے ذریعے تبدیل یا منسوخ نہ کر دیا جائے۔

(c) کسی بھی موجودہ قانون کی شقوں کو اس اعلان کی دفعات کے مطابق بنائے جانے کی غرض سے مرکزی قانون سازی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے صدر اور صوبائی گورنر کسی بھی ترمیم تبدیلی یا تنسیخ (جو بھی ضروری ہو) کے مجاز ہوں گے۔

(d) کوئی عدالت یا ٹریبونل جسے موجودہ کسی بھی قانون کے نفاذ کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس وقت تک کسی بھی ترمیم یا تبدیلی کی مجاز نہیں ہوگی تاوقتیکہ وہ اس اعلان کی دفعات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو۔

(e) اس آرٹیکل میں "موجودہ قانون" سے مراد ہے کوئی بھی ایکٹ، آرڈیننس، آرڈر، اصول، ضابطہ، ضمنی قانون، نوٹیفکیشن یا کوئی اور قانونی دستاویز جسے یوم آغاز سے فوراً پیشتر پاکستان کے قانون کی تائید حاصل تھی یا جو قبائلی علاقوں میں بھی قابل نفاذ تھا۔

6- صدر کے اختیارات۔ (عارضی مدت کے دوران)

(1) صدر ملک کا انتظامی سربراہ ہوگا اور اس اعلان کی دفعات کی رو سے وہ تمام اختیارات استعمال کریگا اور وہ سارے کام انجام دے گا جس کا اسے سابقہ آئین یا موجودہ نافذ العمل قانون کے تحت پورا اختیار دیا گیا ہو۔ صدر اپنے کام اور فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جسے بھی مناسب سمجھے اپنا مشیر مقرر کرسکتا ہے

7- صدر مرکزی حکومت کے ان اختیارات کا استعمال کر سکے گا جو اس اعلان کی دفعات سے مشروط ہوں گے۔

(3) صدر کو قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی کی تحلیل کے اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔

(4) عارضی مدت کے دوران صدر آرڈیننس کے نفاذ کی صورت میں قانون سازی کرسکتا ہے جن کا تعلق ان امور اور معاملات سے ہو جو مرکزی قانون ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں آتے ہوں۔

(5) صدر اپنے حکم کے ذریعے ایسی دفعات تشکیل کرسکتا ہے جنہیں وہ ضروری سمجھے تا کہ اس اعلان کی دفعات پر مؤثر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔

(6) صدر نئے انتظامی اقدامات یا دیگر انتظامات کرسکتا ہے تا کہ نئے آئینی نظام کو بروئے کار لایا جاسکے۔

(7) وہ افسران کا تقرر اور تبادلہ بھی کرسکتا ہے تا کہ ملکی امور اور صوبائی معاملات کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا جاسکے۔

(8) صدر ایک "کونسل برائے عملدرآمد" قائم کرے گا جو گیارہ اراکین پر مشتمل ہوگی جن میں سے چھ نمائندے بنگلہ دیشی حکومت، دو حکومت پنجاب اور تین بقایا تینوں صوبوں سے لئے جائیں گے تا کہ ایسے تمام اقدامات بروئے کار لائے جاسکیں جو اس اعلان کی دفعات پر مؤثر عمل درآمد کو یقینی بناتے ہوں۔

آرٹیکل 67 میں ترمیم

سابقہ آئین کے آرٹیکل 67 میں ترمیم کرتے ہوئے درج ذیل نعم البدل تجویز کیا جاتا ہے۔

اپنے عہدے کا چارج لینے سے پیشتر صوبہ بنگلہ دیش کے گورنر کو بنگلہ دیش ہائی کورٹ

کے چیف جسٹس کے روبرو اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبائی گورنروں کو متعلقہ صوبائی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے روبرو اپنے عہدوں کا حلف اٹھانا ہوگا۔

آرٹیکل 70 میں ترمیم

سابق آئین کے آرٹیکل 70 کی جگہ مندرجہ ذیل آرٹیکل لے گا: 70'' بنگلہ دیش (صوبے) اسٹیٹ کے لئے ایک مجلس قانون ساز ہوگی جسے اسٹیٹ لیجسلیچر آف بنگلہ دیش کہا جائے گا اور پنجاب' شمال مغربی صوبہ' سندھ اور بلوچستان کے لئے ایک مجلس قانون ساز ہوگی جسے اس صوبے کی مجلس قانون ساز کہا جائے گا''۔

آرٹیکل 80 میں ترمیم

سابق آئین کے آرٹیکل 80 کی جگہ مندرجہ ذیل آرٹیکل جگہ لے گا'' 80(1) ہر سٹیٹ حکومت میں وزراء کی ایک کابینہ ہوگی جس کی سربراہی وزیر اعلیٰ کرے گا اس کے علاوہ ڈپٹی وزیر بھی ہوں گے جنہیں اس آرٹیکل میں دیئے گئے طریقے کے مطابق مقرر کیا جائے گا۔

(2) ہر اسٹیٹ (صوبے) کے ایگزیکٹو اختیارات اس آئین کے مطابق اس سٹیٹ گورنمنٹ کی اتھارٹی کے ذریعے استعمال کئے جائیں گے۔ یہ اختیارات آئین اور قانون کے مطابق براہ راست یا متعلقہ حکومت کے ماتحت افسران کے ذریعے استعمال کئے جائیں گے۔

(3) اسٹیٹ کی کابینہ اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز کو جوابدہ ہوگی۔

(4)(a) گورنر اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز کے ایسے رکن کو وزیر اعلیٰ مقرر کرے گا جسے مجلس قانون ساز کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگا۔

(b) جب بھی کوئی رکن وزیر اعلیٰ مقرر ہو تو اگر اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز کا اجلاس نہ ہو رہا ہو اور اسے تحلیل بھی نہ کیا گیا ہو تو اس اجلاس کو دو مہینے کی مدت کے اندر طلب کیا جائے گا۔

(5) وزیر اعلیٰ کے مشورے پر گورنر وزراء اور نائب (ڈپٹی) وزراء کا تقرر کرے گا۔

(6) اگر کوئی وزیر چھ ماہ تک مسلسل مجلس قانون ساز کا رکن نہ رہا تو اس مدت کے ختم ہونے پر وہ وزیر یا نائب وزیر نہیں رہے گا اور اسمبلی کے معطل نہ ہونے تک وہ دوبارہ بھی وزیر نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اس اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہو جائے۔

(7) اس آرٹیکل کے ذریعے کابینہ کے اراکین اور نائب وزراء کو اس عرصے کے لئے اپنے عہدوں پر برقرار رہنے کا نااہل قرار نہیں دیا جائے گا جس کے دوران اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز معطل ہو اور نہ ہی اس دوران وزیر یا نائب وزیر کے تقرر کو روکا جا سکے گا۔

(8) شک دور کرنے کے لئے واضح طور پر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ گورنر اپنے اختیارات وزیر اعلیٰ کے مشورے کے مطابق استعمال کرے گا۔

(9) وزیر اعلیٰ کسی وقت بھی گورنر کو استعفیٰ دے کر مستعفی ہو سکتا ہے۔

(10) کوئی بھی وزیر یا نائب وزیر' وزیر اعلیٰ کو استعفیٰ دے کر کہ اسے گورنر کو پیش کر دیا جائے مستعفی ہو سکتا ہے۔

(11) گورنر اگر وزیر اعلیٰ مشورہ دے تو وزیر اعلیٰ کے علاوہ کسی بھی وزیر کا استعفیٰ منظور کر سکتا ہے۔

(12) وزیر اعلیٰ کسی بھی وزیر یا نائب وزیر سے استعفیٰ دینے کی درخواست کر سکتا ہے بشرطیکہ وزیر اعلیٰ کے نزدیک اس کی معقول وجوہ ہوں۔ اگر متعلقہ وزیر اس درخواست پر عمل نہ کرے تو وزیر اعلیٰ کے مشورے پر گورنر اس کا تقرر ختم کر سکتا ہے۔ کوئی بھی وزیر اعلیٰ اسٹیٹ کی مجلس قانون ساز میں اراکین کی اکثریت کی حمایت باقی نہ رہنے پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے مشورے پر گورنر نے مجلس قانون ساز کو معطل نہ کر دیا ہو۔

(14) اگر کسی وقت وزیر اعلیٰ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وزراء اور نائب وزراء نے بھی استعفیٰ دے دیا ہے لیکن وزیر اعلیٰ وزراء اور نائب وزراء اس وقت تک اپنے عہدوں پر کام کرتے رہیں گے جب تک کہ ان کے جانشین ذمہ داری نہیں سنبھال لیتے۔

آرٹیکل 81 میں ترمیم۔

سابق آئین کے آرٹیکل 81 کی جگہ مندرجہ ذیل آرٹیکل لے گا۔

81(1) حکومت کے تمام کام گورنر کے نام سے کئے جائیں گے۔

(2) اسٹیٹ کی حکومتوں کے ایسے قواعد ہوں گے جن کے مطابق احکام اور دوسری دستاویزات پر گورنر کے نام پر عملدرآمد کرایا جائے گا اور ایسے احکام کی قانونی حیثیت کو کسی بھی

عدالت میں اس بنیاد پر چیلنج نہیں کیا جاسکے گا کہ یہ حکم گورنر نے جاری نہیں کیا۔

(3) اسٹیٹ کی حکومت اپنے کام کو تفویض کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے کے لئے قواعد بنائے گی۔

آرٹیکل 84,82 منسوخ' نئے آرٹیکل

سابق آئین کے آرٹیکل 82 اور 84 کو حذف کردیا جائے گا آرٹیکل 86 سے 90 تک میں ترمیم۔ سابق آئین کے آرٹیکل 86 سے 90 کے بجائے مندرجہ ذیل آرٹیکل جگہ لیں گے۔

86 اس حصے میں "مالی بل" کا مطلب ایسا بل ہے جو مندرجہ ذیل تمام معاملات کے یا ان میں سے کسی ایک معاملے کے بارے میں ہو۔

(a) کسی بھی ٹیکس کا نفاذ' ختم کیا جانا' کم کرنا' تبدیل کرنا یا باقاعدہ بنانا۔

(b) اسٹیٹ کی حکومت کی طرف سے کوئی رقم قرض لینا یا کوئی ضمانت دینا یا حکومت کی مالی ذمہ داریوں کے متعلق کسی قانون میں ترمیم کرنا۔

(c) اسٹیٹ کنسولیڈیٹیڈ فنڈ کا تحفظ کرنا اس میں رقم جمع کرانا' اس میں سے رقم ادا کرنا۔

(d) اسٹیٹ کنسولیڈیٹیڈ (مجموعی) فنڈ پر چارج عائد کرنا یا کسی چارج میں تبدیلی کرنا یا اسے ختم کرنا۔

(e) اسٹیٹ کنسولیڈیٹیڈ فنڈ کے لئے رقوم وصول کرنا یا اسٹیٹ پبلک اکاؤنٹ کے لئے وصول کرنا یا ایسی رقم کی تحویل اور جاری کرنا اور۔

(f) ایسا کوئی بھی معاملہ جو مندرجہ بالا ذیلی دفعات کے بارے میں ہو۔

(z) کسی بل کو صرف اس وجہ سے مالی بل نہیں سمجھا جائے گا کہ:

(a) یہ کسی جرمانے یا مالی تعزیر کو عائد کرنے یا اس میں تبدیلی کے بارے میں ہے یا یہ لائسنس فیس یا کسی خدمت کے بدلے میں فیس چارج کے مطالبے یا ادائیگی کے بارے میں ہے۔

(b) یہ کسی مقامی حکومت یا مقامی ادارے کی طرف سے کسی ٹیکس کے نافذ کرنے' ختم

کرنے کم کرنے یا تبدیل کرنے یا باقاعدہ بنانے کے بارے میں ہے۔

(3) ہر مالی بل پر جب یہ گورنر کو دستخط کے لئے پیش کیا جائے ایک سرٹیفکیٹ دیا جائے گا جو تمام مقاصد کے لئے کافی ہوگا اور اسے عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔

87 کوئی ایسا بل یا ترمیم جو آرٹیکل 86 کی کلاز (1) میں دیئے گئے کسی معاملے کے بارے میں ہو یا وہ اگر تشکیل دیا جائے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے تو اس میں اسٹیٹ کی آمدنی سے اخراجات ہوتے ہوں تو اسے مجلس قانون ساز میں اسٹیٹ حکومت کی سفارش کے ساتھ پیش نہیں کیا جائے گا۔

88- ریاستی مقننہ کے ایکٹ کی اتھارٹی کے بغیر ریاست کے مقاصد کے لیے کوئی بھی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔

89-(1) ریاستی حکومت کو حاصل ہونے والے تمام محصولات' کسی قرض کی دوبارہ ادائیگی کے لیے حاصل کے جانے والے قرضہ جات اس مجموعی فنڈ کا حصہ بنیں گے جو ریاست کے مجموعی فنڈ کے نام سے جانا جائے گا۔

90-(1) ریاست کے مجموعی فنڈ کی تحویل' اس فنڈ سے رقوم کی ادائیگی' اس میں رقوم کی واپسی' اس فنڈ میں ریاستی حکومت کے احکام پر حاصل ہونے والی رقم کے علاوہ سرکاری رقوم ان کی ریاست کے پبلک اکاؤنٹ میں ادائیگی اور ایسے فنڈ سے رقوم کی واپسی اور مذکورہ بالا معاملات سے متعلقہ تمام معاملات کو ریاستی مقننہ کے ایکٹ کے ذریعے باضابطہ بنایا جائے گا یا اس حوالے سے جو بھی معاملہ کیا جائے گا اور اس حوالے سے جب تک باضابطہ دفعات نہیں پیش ہوتیں اس وقت تک گورنر ضوابط تشکیل دے گا۔

(2) اس میں جمع کرائی جانے والی تمام رقوم اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والی تمام رقوم۔

(i) کوئی بھی افسر جسے ریاستی حکومت کو حاصل ہونے والی یا ریاستی حکومت سے جاری ہونے والی پبلک منی Public Money کے علاوہ ریاست کے معاملات کے حوالے سے ذمہ داری دی گئی ہو۔

(ii) کسی عدالت نے کسی معاملہ میں کسی اکاؤنٹ میں یا کسی شخص نے حکومت کے معاملات کے سلسلے میں وصول کی ہو تو وہ رقم اسٹیٹ کے پبلک اکاؤنٹ میں جمع کی جائے گی یا اس حوالے سے جو بھی معاملہ ہو۔

(41) درج ذیل نئے آرٹیکل۔ سابق آئین کے آرٹیکل 90 کے فوری بعد 90 اے تا 90 ایف شامل کئے جائیں گے۔

نئے آرٹیکل 90 اے تا 90 ایف کا اضافہ

90-اے (1) ریاستی حکومت ہر مالی سال کے حوالے سے ریاستی مقننہ کے سامنے سالانہ گوشوارے کی شکل میں ریاستی حکومت کے آمدن واخراجات کا تخمینہ پیش کرے گی۔

(2)۔ سالانہ گوشوارہ علیحدہ علیحدہ درج ذیل چیزوں کو ظاہر کرے گا۔

(ا) آئین میں بیان کردہ اخراجات کے لئے مطلوب مطالبہ زر ریاست کے مجموعی فنڈ سے کیا جائے گا اور

(ب) دوسرے مجوزہ اخراجات کے لیے بھی رقم ریاست کے مجموعی فنڈ سے لی جائے گی اور ریونیو اکاؤنٹ کے اخراجات اور دوسرے اخراجات میں فرق کیا جائے گا۔

"90۔بی۔ درج ذیل اخراجات ریاست کے مجموعی فنڈ سے حاصل کئے جائیں گے یا جو بھی صورتحال ہو"۔

(ا) گورنر کو ادا کیا جانے والا مشاہرہ اور گورنر کے دفتر سے متعلق اخراجات کی رقم اور درج ذیل کو ادا کی جانے والی رقم۔

(i) ہائی کورٹ کے جج صاحبان۔

(ii) سٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے ارکان۔

(iii) ریاستی مقننہ کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر۔

(ب) انتظامی اخراجات بشمول ہائی کورٹ کے افسران اور ملازمین کو ادا کیا جانے والا معاوضہ سٹیٹ پبلک کمیشن اور ریاستی مقننہ کا سیکرٹریٹ۔

(ج) قرض کی رقم جو ریاستی حکومت کے ذمے واجب الادا ہو جس میں یہ شامل ہیں سود خورد برد ہونے والے فنڈز بڑھتے ہوئے قرضوں اور ریاست کے مجموعی فنڈ کی سیکورٹی پر قرض کی تلافی کے سلسلے میں رقم کی ادائیگی یا دوبارہ ادائیگی۔

(د) کسی بھی ریاست یا ٹریبونل کی طرف سے ریاست کے خلاف فیصلے کے لیے مطلوبہ رقم۔

(د) ریاست مقننہ کے ایکٹ یا آئین میں بیان کردہ کوئی رقم جو ادا کی جائے۔

آبادی کے تناسب کی بنیاد پر ملازمتیں

90۔سی (1) ریاست کے مجموعی فنڈ سے ادا کی جانے والی رقم جس کا تعلق سالانہ گوشوارے سے ہے پر بحث تو ہو سکتی ہے لیکن ریاستی مقننہ میں اس پر ووٹنگ نہیں ہو سکتی۔

(2) سالانہ گوشوارے یا میزانئے کے جن اخراجات کا تعلق دوسرے اخراجات سے ہے انہیں ریاستی مقننہ میں گرانٹس کی شکل میں پیش کیا جائے گا اور مقننہ کے پاس اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی ایسے مطالبے کو منظور کر سکتی ہے جس میں رقم کی کمی کے لیے کہا گیا ہو۔

(3) ریاستی حکومت کی سفارش کے بغیر گرانٹ کا کوئی مطالبہ پیش نہیں کیا جائے گا۔

"90-ڈی (1) ریاستی مقننہ کی طرف سے محولہ بالا موخر الذکر آرٹیکل کے تحت گرانٹ کے بعد مقننہ میں ایک بل پیش کیا جائے گا کہ ریاست کے مجموعی فنڈ سے تناسب کے لحاظ سے درج ذیل اقدامات کے لیے رقم مہیا کی جائے"۔

(ا)۔ ریاستی اسمبلی کی منظور کردہ گرانٹس۔

(ب) جو اخراجات ریاست کے مشترکہ فنڈ سے کئے جاتے ہیں لیکن ریاستی مقننہ میں گزشتہ مرتبہ پیش کئے جانے والے گوشوارے سے ان اخراجات کی رقم زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔

(2) ریاستی مقننہ میں کسی بل سے متعلق کوئی ایسی ترمیم پیش نہیں کی جائے گی جس کا اثر یہ ہو کہ گرانٹ میں کمی بیشی واقع ہو جائے یا سرے سے گرانٹ کی صورت ہی بدل جائے۔

(3) آئین کی دفعات سے مشروط طور پر ریاست کے مشترکہ فنڈ سے اس رقم کے علاوہ کوئی رقم نہیں لی جائے گی جس کا تناسب اس آرٹیکل کی دفعات سے ہم آہنگ قانون میں پاس کیا گیا ہو۔

"90۔ای۔ مالیاتی سال کے حوالے سے اگر یہ بات سامنے آئے۔

(ا) یہ کہنا کہ اس مالی سال میں اتنی مخصوص رقم فلاں مخصوص سروس پر خرچ کی جائے گی کافی نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات کہنا کافی ہے کہ کسی ایسی نئی سروس پر اخراجات کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر سالانہ گوشوارے میں نہیں کیا گیا تھا یا یہ کہنا کافی نہیں ہے۔

(ب) کہ اس برس فلاں سروس کے لیے جتنی رقم مختص کی گئی تھی اس سے زیادہ خرچ

ہوئی ہے۔

ریاستی حکومت کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ریاست کے مجموعی فنڈ سے اخراجات کر سکے گی۔ چاہے یہ اخراجات آئین میں درج ہوں یا نہ ہوں اور ریاستی حکومت ریاستی مقننہ کے سامنے ضمنی گوشوارہ پیش کرے گی جس میں ان اخراجات کی تفصیل ہوگی جبکہ آرٹیکل 90 اے تا 94 ڈی کی دفعات کا اطلاق مذکورہ بالا گوشواروں پر ہوگا کیونکہ ان کا اطلاق سالانہ گوشوارے پر ہوتا ہے۔

"90۔ ایف (1)۔ اس باب کی مذکورہ بالا دفعات کو متاثر کئے بغیر ریاستی مقننہ کے پاس درج ذیل اختیارات ہوں گے۔

(ا)۔ تخمینہ شدہ اخراجات کے حوالے سے پیشگی ادائیگی مالی سال کے حصے کے طور پر دینا قبل اس کے کہ آرٹیکل 90 سی میں ووٹنگ کے مجوزہ طریقہ کار کی منظوری کا اخراجات کے حوالے سے آرٹیکل 90 ڈی کی دفعات سے باہم مطابقت رکھنے والا بل پاس ہو۔

(ب) ریاست کے وسائل کی غیر متوقع ضرورت کو پورا کرنے کے لیے گرانٹ کی منظوری دینا جب اس طرح کی گرانٹ کی منظوری سالانہ گوشوارے یا بجٹ میں درج تفصیلات کی صورت میں نہ دی جاسکتی ہو۔

(ج) استثنائی طور پر کسی ایسی گرانٹ کی منظوری دینا جو کسی مالی سال کے سالانہ تخمینے میں درج نہ ہو جبکہ ریاستی مقننہ کے پاس یہ اختیار ہوگا جو اسے قانون سے ملا ہوگا کہ وہ جن گرانٹس کی منظوری دے چکی ہے ان کے لیے ریاست کے مجموعی فنڈ سے رقم نکلوا سکتی ہے۔

(2) آرٹیکل 90 سی تا 90 ڈی کی دفعات کلاز (1) کے تحت گرانٹ دینے کے لیے مؤثر ہوں گی یا اس کلاز کے تحت جو بھی قانون بنایا جائے گا اس کے تحت یہ دفعات گرانٹ دینے کے لیے مؤثر ہوں گی کیونکہ سالانہ گوشوارے میں درج اخراجات کے حوالے سے گرانٹ دینے کے بارے میں قانون کو متاثر کرتی ہیں اور ریاست کے مجموعی فنڈ سے اس طرح کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم نکلوانے سے متعلق مقننہ کو اختیار دینے کے لئے قانون بنایا جائے گا۔

آرٹیکل 91 میں ترمیم۔

(1) آرٹیکل 91 کی کلاز (1) کے حوالے سے درج ذیل ترمیم عمل میں لائی جائے

گی۔

(91) بنگلہ دیش کی ریاست کی ایک ہائی کورٹ ہوگی اسی طرح مغربی پاکستان کے ہر صوبے کے لیے علیحدہ علیحدہ ایک ہائی کورٹ ہوگی۔

آرٹیکل 92 میں ترمیم۔

(1) سابق آئین کے آرٹیکل 92 کی کلاز 2 کی ذیلی کلاز (بی) کو حذف کر دیا جائے گا۔

(2) کلاز 2 کی ذیلی کلاز (سی) کو ذیلی کلاز (بی) بنادیا جائے گا۔

(3) آئین کے آرٹیکل 92 کی کلاز 3 حذف کردی جائے گی۔ آرٹیکل 107, 113,114,119,120,121,99,103,104,105 122,108,112 اور 131 کی کلاز 2 کو حذف کردیا جائے گا۔

(4) سابق آئین کے آرٹیکلز 108,112,113,114,99,103 105,107 اور 131 کی کلاز 2 کو حذف کردیا جائے گا۔

آرٹیکل 134 میں ترمیم

سابق آئین کے آرٹیکل 134 کی جگہ درج ذیل آرٹیکل شامل کیا جائے گا۔

"134 مقننہ اگر کسی ایسے معاملہ سے متعلق قانون سازی کرتی ہے اور اس قانون کو نافذ کرتی ہے جس کا اسے اختیار نہیں تو ایسا قانون کالعدم قرار پائے گا۔"

آرٹیکل 137 میں ترمیم

آئین کے آرٹیکل 137 کے بجائے درج ذیل آرٹیکل شامل کیا جائے گا۔ "138۔ مرکزی حکومت کا آئینی فرض ہوگا کہ وہ آبادی کے تناسب کی بنیاد پر تمام وفاقی ملازمتوں بشمول ڈیفنس سروسز میں پاکستان کے تمام لوگوں کی کم سے کم وقت میں شمولیت کو یقینی بنائے"۔

آئین کے آرٹیکل 140 میں ترمیم

آئین کے آرٹیکل 140 کے بجائے درج ذیل آرٹیکل شامل کیا جائے گا۔ "140 ریاست کی ایگزیکٹو اتھارٹی میں اس حد تک اضافہ کیا جاتا ہے کہ وہ ریاست کے مجموعی فنڈ کی ضمانت پر حدود (اگر کوئی ہوں) کے اندر رہتے ہوئے رقوم لے سکتی ہے یا جیسا بھی ریاستی مقننہ کے ایکٹ میں درج ہو اور ایسی ضمانتیں دے کر یہ اتھارٹی قرض لے سکتی ہے جن کی حدود کا تعین کیا گیا ہو۔

اقتدار پر قبضہ کے منصوبے

اس رپورٹ میں جتنی بھی بحث ہوئی ہے اس حوالے سے جنرل یحیٰی کی نیت کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں تحفظات موجود رہے ہیں۔ کیا جنرل یحیٰی نے پوری دیانتداری سے اقتدار قبول کیا تھا' حالانکہ ان کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھا جاتا کہ قانونی اور اخلاقی طور پر ان کے لئے لازم تھا کہ وہ اقتدار کو اپنے قبضے میں لے لیتے تاکہ ملک کو تباہی سے بچاتے اور جس قدر جلدی ممکن ہوتا اقتدار عوام کو منتقل کر دیتے؟ یا کیا انہوں نے مکمل طور پر غیر قانونی طریقے اور بددیانتی سے اقتدار پر قبضہ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی دیانتدارانہ رائے کے مطابق اپنے کام کا آغاز کیا ہو۔ لیکن جب بلاشرکت غیرے مکمل اقتدار ملا تو اس کی بدعنوانی کے ناگزیر اثرات کی وجہ سے ان کا ذہن تبدیل ہو گیا ہو اور انہوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اقتدار کی مسند پر متمکن ہونا مناسب سمجھا ہو۔ اس کے الٹ بہرحال ناممکن ہے۔ اس بات پر یقین کرنا ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے بے لگام خواہشوں کی تکمیل کے لئے اقتدار پر قبضہ کیا اور بعد میں انہوں نے خلوص سے اقتدار کی منتقلی کے متعلق سوچا۔ اسی طرح کسی فرد کی ذہنی حالت کے نتیجے میں پہنچنا اور اس حوالے سے براہ راست شہادت حاصل کرنا بھی مشکل ہے۔ متعدد ایسے واقعات ہمارے سامنے آئے ہیں جو عدالتی عمل میں یحیٰی خان کی ذہنی کیفیت اور ان کے ارادوں کے حوالے سے ٹھوس شواہد مہیا کرتے ہیں جن کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس کا آغاز اس سوال سے کرتے ہیں کہ جنرل یحیٰی خان نے جو مارشل لا لگایا کیا

قانونی اعتبار سے اس کا نفاذ صحیح تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنرل یحیٰی نے فوجی حکومت نافذ کی۔ سپریم کورٹ نے اب فیصلہ دیا ہے کہ اپنے ہی ملک میں فوجی حکمرانی غیر قانونی ہے۔ لیکن جنرل یحیٰی کو اس وجہ سے معاف کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون سے ناواقف تھے۔ جیسا کہ سپریم کورٹ نے اب اس بات کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ دوسو کے کیس (پی ایل ڈی 1958 ء سپریم کورٹ 533) میں قانون کے صحیح نظریے کو پیش کیا گیا تھا لیکن دوسو کیس سے کیا بات سامنے آئی؟ اس کیس نے صرف اس بات کا فیصلہ کیا کہ جب بھی قانونی حکومت کو بزور قوت ختم کیا جاتا ہے اور یہ طاقتور گروہ اقتدار پر متمکن ہو جاتا ہے تو اسے کامیاب انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ کہ نئی اتھارٹی بذات خود طاقت کا منبع ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب فوجی حکمرانی کا کامیابی سے نفاذ ہو جاتا ہے تو ملک کی عدالتیں اسے قانونی اتھارٹی تسلیم کر لیتی ہیں۔ ایسا نہ تو کہا گیا اور نہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ آئین یا قانون قانونی طور پر قائم ہونے والی حکومت کو بزور بازو خاتمے کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ اس مقدمے میں نہ صرف اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ کمانڈر انچیف ملٹری کمانڈر کی حیثیت سے یہ فطری حق رکھتا ہے کہ وہ جب بھی مناسب سمجھے حکومت پر قبضہ کر لے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ جنرل یحیٰی نے آئین کی سربلندی اور برسر اقتدار حکومت کے دفاع جس کی مدد کرنے کا وہ قانونی طور پر ہمیشہ سے پابند تھا' کے فرائض سے بھی انحراف کیا ہے۔

ہم نے پہلے بھی اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ گول میز کانفرنس کے دوران جنرل یحیٰی خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ایک میٹنگ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ یہ میٹنگ ہوئی تھی اور اس بات کو بھی دہرایا جائے گا کہ اس میٹنگ کے بارے میں دو مختلف اور متضاد آراء سامنے آئی تھیں ایک طرف ہمیں یہ بتایا گیا کہ جنرل یحیٰی خان نے اس بات کی مکمل یقین دہانی کرائی کہ کسی بھی صورت میں مارشل لا نہیں لگایا جائے گا جبکہ جنرل یحیٰی خان کا اپنا موقف یہ ہے کہ میٹنگ کا مقصد مجیب الرحمٰن کو یہ باور کرانا تھا کہ کانفرنس کی ناکامی کی صورت میں اگر مارشل لا کا نفاذ ناگزیر نہیں تو اس بات کا خاصا امکان بہرحال موجود ہے۔ کچھ وجوہات جن کا ہم نے ادھر ادھر کہیں حوالہ دیا ہے کی وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اول الذکر وجہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ بیان کردہ آراء کے علاوہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان دونوں آراؤں کے بین بین کوئی سمجھوتہ ہوا تھا۔ جو بھی صورت ہو یہ طے ہے کہ مارشل لا پر بحث ہوئی تھی

اور دونوں طرف کی آراء سے واضح طور پر یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ مارشل لا نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ جنرل یحییٰ خان نے کرنا تھا یا یہ کہ کم از کم جنرل یحییٰ کی رضامندی کے بغیر مارشل لا نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر ایک یہ بات فرض کرتا نظر آتا ہے کہ مارشل لا کا نفاذ کمانڈر انچیف کا حق یا فرض ہوتا ہے یہ حقیقت ہے کہ یہ ملاقات گول میز کانفرنس ختم ہونے سے پہلے ہوئی بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ملاقات گول میز کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس حوالے سے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کمانڈر انچیف صاحب گول میز کانفرنس کی کارروائی میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ اگرچہ ہم نے اس الزام کو اہمیت نہیں دی ہے کہ جنرل یحییٰ نے درحقیقت فیلڈ مارشل ایوب خان کی بیماری کے وقت سے حکومت اور صدر ہاؤس کا کنٹرول سنبھال لیا تھا لیکن جنرل کی دلچسپی اس عمل میں بہت پہلے شروع ہو گئی تھی اور کم از کم اگرتلہ سازش کیس کے مقدمے کا سبب بننے والی مشاورت میں اس کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔

سازش کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ جنرل نے اپنے منتخب قریبی ساتھیوں کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ مل کر مارشل لا کے نفاذ کے منصوبے بنائے۔ جنرل یحییٰ کے ان ساتھیوں میں جنرل گل حسن اور جنرل پیرزادہ شامل تھے۔ مارشل لا ضوابط کا مسودہ اور مارشل لا کے نفاذ کی دوسری ضروری تیاریاں مکمل کی گئی تھیں۔ جب جنرل یحییٰ سے اس بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے تسلیم کیا اور انہوں نے اپنی سوچ کے مطابق جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ کمانڈر انچیف کی ذمہ داری اور فرض ہے کہ جب حالات بگڑ جائیں تو وہ مارشل لا نافذ کر دے۔ جنرل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا یہ اقدام حفاظتی نوعیت کے تھے۔ انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ فوج ہمیشہ ہنگامی حفاظتی نوعیت کے منصوبے تیار رکھتی ہے اور یہ کہ ان منصوبوں کا تسلسل کے ساتھ جائزہ لیا جاتا رہتا ہے اور انہیں اپ ڈیٹ رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسی سسٹم کے تناظر میں مارشل لا کے ہنگامی منصوبے تیار کیے گئے تھے جو درحقیقت 1969ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے نظریے کے بارے میں یہ پختہ رائے رکھتے تھے کہ مارشل لا کا نفاذ فوج کا فرض تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فوج کے پاس اس وقت بھی اس طرح کا ایک منصوبہ ہوگا۔ ہمارے لیے جنرل صاحب کا یہ فرمانا انتہائی ہیبت ناک سوچ کی مانند تھا۔ اگر ہم یہ تصور قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں کہ ایسا کرنا فوج کا حق اور فرض ہے اور دوسو

کیس کا فیصلہ (چاہے غلط ہو یا صحیح) اس طرح کے تصور کی اساس مہیا نہیں کرتا تو اس طرح کی تیاریوں کو ٹھوس واقعاتی شہادتیں سمجھنا چاہئے۔ ملک کی حکومت پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد اور اس حقیقت کے باوجود کہ امن و امان کی صورتحال پر جلد ہی قابو پا لیا گیا تھا لیکن نومبر 1969ء تک جنرل یحییٰ خان نے اپنے ٹائم ٹیبل کا اعلان نہیں کیا تھا۔ حالانکہ انتخابات اکتوبر 1970ء میں منعقد کروائے جانے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت یکم جنوری 1970ء کو دی جانی تھی۔ اس طرح سیاسی نظریات کے پروپیگنڈے کے لئے دس ماہ کا طویل عرصہ دیا گیا جس کے بارے میں جلد ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ مہم پاکستان کے استحکام اور لیگل فریم ورک آرڈر کی دفعات سے متصادم ہے۔ اس طویل مہم کے دوران پاکستان مخالف پروگرام کو دبانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

مارشل لا انتظامیہ کے اندازے غلط ہوئے

سب سے اہم سوچ یہ نظر آئی ہے کہ شہادت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتخابات کے نتائج سے قبل انتظامیہ اس بات کا تصور نہیں کر رہی تھی کہ عوامی لیگ کو اس قدر بھاری اکثریت حاصل ہوگی۔ درحقیقت ایسے نظر آتا ہے کہ ابتدا میں اس بات کا تصور کیا جا رہا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں متعدد چھوٹی چھوٹی پارٹیاں انتخابات میں کامیابی حاصل کریں گی۔ یعنی توقع تھی کہ 8 سے 10 چھوٹی چھوٹی پارٹیاں انتخابات میں قومی سطح پر ابھر کر سامنے آئیں گی۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر نتیجہ ایسا ہی نکلتا تو نہ صرف چھ نکات کی کوئی اہمیت باقی نہ رہتی (کہ ان پر غور کیا جاتا) بلکہ کوئی پارٹی یا کئی پارٹیوں کا اتحاد اقتدار کا جائز حقدار نہ ٹھہرتا۔ علاوہ ازیں جب اس قدر تعداد میں پارٹیاں قومی اسمبلی میں پہنچ جاتیں تو یہ اپنا بنیادی کام یعنی آئین کی تشکیل کا کام سرانجام دینے میں ناکام ہو جاتیں۔ اس صورتحال کے مشاہدے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ 120 دن کی حد کیوں مقرر کی گئی تھی جس کے دوران اسمبلی آئین تشکیل نہ دینے کی وجہ سے تحلیل ہو جاتی۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر یہ پارٹیاں آئین تشکیل دینے میں فیل ہو جاتیں اور اگر آئین تشکیل دینے کے بعد حکومت بنانے کے مسئلہ پر یہ پارٹیاں کسی سمجھوتے پر نہ پہنچتیں تو ایسی صورت میں جنرل یحییٰ (اگر وہ ذہن بنا چکے تھے) کے لئے اقتدار کی مسند پر متمکن رہنا زیادہ آسان ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جنرل یحییٰ صاحب قوم کو بتاتے کہ ان کی انتہائی پرخلوص کوششوں

کے باوجود قوم کے نمائندے ایک مرتبہ پھر ناکام ہو گئے ہیں اس لیے ملک کی حکومت صرف ان کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ اس کی متبادل صورت یہ ہوتی کہ وہ پارٹیوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے اور ایسی صورت میں ان چھوٹی پارٹیوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہوتا کہ وہ ایسے آئین یا انتظامات کو قبول کرلیں جس میں جنرل یحییٰ مؤثر طور پر اقتدار پر قابض رہتے۔ اس طرح کا آئینی ڈیڈلاک پیدا کرنے کے لئے وہ 120 دنوں کی مدت کی حد پر انحصار کرتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس بنیاد پر اس اصول کا تحفظ کرتے کہ جب تک آئین سازی کی مدت کا تعین نہیں کیا جاتا اور اس دوران قانون سازی کے اختیارات کے استعمال پر قدغن نہیں لگائی جاتی جیسا کہ آئین سازی سے واضح ہے تو ایسی صورت میں اسمبلی غیر نمائندہ ادارہ کی صورت اختیار کر جائے گی۔ جنرل یحییٰ خان اپنے اس نقطہ نظر کی تائید کے لئے پہلی آئین ساز اسمبلی کی تاریخ کا حوالہ بھی دے سکتے تھے۔

زبانی جمع خرچ

بلاشبہ یہ ساری باتیں قیاس آرائیاں ہیں اس لیے ہم محض ان قیاس آرائیوں کی بنیاد پر نہیں کہہ سکتے کہ ان کی وجہ سے ایسی صورتحال پیدا ہوئی جس کے متعلق دانستہ طور پر ایسا ہی سوچا گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی کارروائیوں کا ایک سیٹ تیار کیا گیا تھا جن کا واضح طور پر یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اس حقیقت سے ان کے ارادوں کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد مل سکتی ہے اور جب اس عمل میں جنرل عمر کی سیاسی سرگرمی کو اگر شامل کر لیا جائے اور ایسی دوسری سرگرمیوں کو جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انتخابات کے غلط اندازوں کی تشریح لیگل فریم ورک آرڈر سے ہوتی ہے۔ اس طرح چھ نکاتی پروگرام کو اہمیت نہ دینے کے عمل سے بھی اس مفروضے کو مزید تقویت ملتی ہے کہ جنرل یحییٰ خان اپنی سوچ میں مخلص نہیں تھے۔

بہرحال انتخابات کے نتائج حیران کن ثابت ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی پارٹی نے تقریباً ساری نشستیں حاصل کرلیں۔ اگرچہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی طرح کی کامیابی تو حاصل نہ ہوئی لیکن پیپلز پارٹی نہ صرف مغربی پاکستان کی واحد سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری بلکہ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں تو قومی اسمبلی کے اجلاس کا بار بار

التواء سمجھ میں آتا ہے۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان 5 دسمبر 1970ء کو کیا گیا جبکہ جنرل یحییٰ خان نے 11 جنوری 1971ء کو مشرقی پاکستان آنے سے قبل نہ تو اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور نہ ہی انہوں نے متعدد لیڈروں کے ساتھ بات چیت شروع کی۔ 11 جنوری 1971ء ہی کی اسی میٹنگ میں جنرل یحییٰ نے مجیب کو مستقبل کا وزیراعظم قرار دیا اور اس کے بدلے میں شیخ مجیب سے صدارت کی پیشکش وصول کی۔ بعد میں جو کچھ ہوا اس کے حوالے سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان زبانی جمع خرچ کر رہے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو چھ نکات سے مضبوطی سے چمٹے رہنے کی وجہ سے غدار قرار دیا گیا۔ یقینی طور پر اس میٹنگ کے بعد چھ نکات سامنے نہ آئے۔ اگر انتخابات کے دوران چھ نکات کے پروگرام کو محض ایک پارٹی کا پروگرام ہونے کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا تھا اس پارٹی کے متعلق خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی کلی حمایت حاصل نہیں کر سکے گی اور اگر ایسے نکات کو قابل مذاکرات قرار دیا بھی گیا ہو تو جنوری 1971ء کے وسط تک ان پر مذاکرات نہ ہو سکے۔ انتخابات کے نتائج نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ چھ نکات کو مشرقی پاکستان کے لوگوں کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ (ہم اس وقت اس بات کا تجزیہ نہیں کر رہے ہیں کہ آیا بنگلہ دیشی عوام چھ نکات کو کلی طور پر سمجھتے تھے اور وہ علیحدگی یا وفاق کے حق میں فیصلہ دینا چاہتے تھے بلکہ ہم یہاں محض یہ بیان کر رہے ہیں کہ مجیب اس قابل تھا کہ وہ اپنے اس پروگرام کی عوامی حمایت کے ذریعے جو کچھ چاہتا حاصل کر سکتا تھا) اس کے بعد جنرل یحییٰ نے لاڑکانہ میں بھٹو کے ساتھ ملاقات کی جس میں اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ 3 مارچ مقرر کی گئی۔ یکم مارچ کو 3 مارچ کو اسمبلی کا ہونے والا اجلاس ملتوی کر دیا گیا اور جنرل یحییٰ خان نے فوری طور پر مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ ان واقعات کی تفصیل ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں۔ اس مرحلے پر اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب، جو دونوں سینئر دفاعی افسر تھے اور دونوں مشرقی پاکستان میں صدر کے اعلیٰ نمائندے رہ چکے تھے نے صدر سے درخواست کی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس کی واضح تاریخ متعین کریں اور انہیں فوری طور پر مشرقی پاکستان پہنچنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ان کی درخواست صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دونوں افسران جو ابھی تک صدر کے خلوص پر پختہ یقین رکھتے تھے ان سے مایوس ہو گئے اور تقریباً اسی روز انہوں نے اپنے اپنے عہدوں کا چارج چھوڑ دیا۔

کل جماعتی مذاکرات نہ ہونے کی وجہ

جب مارچ کے وسط میں حتمی اور ناگوار مذاکرات شروع ہوئے تو اس وقت تک شیخ مجیب الرحمٰن کا رویہ اگر پہلے سے اس قدر سخت نہ تھا تو اب اس قدر سخت ہو چکا تھا اور وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ جس انداز میں ان مذاکرات سے نمٹا گیا وہ انداز بھی خاصا مشکوک تھا۔ مذاکرات کے دوران کوئی بھی میٹنگ ایسے انداز میں نہیں ہوئی کہ ساری پارٹیاں صدر کی موجودگی میں مذاکرات کرتیں۔ خاص طور پر جنرل یحییٰ اور عوامی لیگ و پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندوں کے مابین مذاکرات سوائے 2 مارچ کی مختصر میٹنگ کے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں اور اس بات کی توثیق کی جا سکتی ہے کہ کانفرنس میں ملاقات یا میٹنگ نہ ہونے کی وجہ کا کم از کم ایک پہلو شیخ مجیب الرحمٰن کی ہٹ دھرمی تھی لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے اس رویے کی وجہ سے جنرل یحییٰ خان اپنی اس ذمہ داری سے بری ہو جاتے کہ انہیں اس طرح کی میٹنگ پر اصرار کرنا چاہیے تھا۔ درحقیقت ہم یہ احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جنرل یحییٰ کو پیش آمدہ صورتحال کا ادراک تک نہ تھا۔

ہم پہلے ہی یہ بات کر چکے ہیں کہ جنگ چھڑنے کے بعد کے چند ماہ کے دوران مذاکرات کے عمل کو دوبارہ شروع کرنے یا صورتحال کا سیاسی حل ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جنرل یحییٰ خان نے اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ اقتدار کی منتقلی پر یقین رکھتے ہیں اور انہوں نے جون کے آخر میں اعلان کیا کہ وہ اپنا ہی تیار کردہ آئین نافذ کریں گے۔

یحییٰ خان کا "آئین"

آئین کے نافذ ہونے کی تاریخ کا اعلان نہیں کیا گیا' لیکن اس دوران میں ہمیں مشرقی پاکستان کے محاذ پر 20 نومبر کو اور 3 دسمبر کو مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی اثنا میں قانون کا مسودہ تیار کر لیا گیا۔ یحییٰ خان کی تیار کردہ اس آئینی دستاویز جس کے مطالعے کا عوام کو موقع نہیں ملا کا مشاہدہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس آئین کے آرٹیکل 16 میں درج ہے۔

"آرٹیکل 16، اس آئین میں شامل دوسری دفعات کے علاوہ:

(i) اس آئین کے تحت پاکستان کے پہلے صدر جنرل یحییٰ خان صاحب ہوں گے۔

(ii) جنرل آغا محمد یحییٰ خان اگر چاہیں تو کمانڈر انچیف آف پاکستان آرمی کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں' لیکن ان کے اس عہدے کی مدت پانچ برس سے زائد نہیں ہو گی جبکہ اس مدت کا آغاز آئین کے نافذ ہونے کے دن سے ہو گا۔

پاکستان کے پہلے نائب صدر کا انتخاب صدر کے انتخاب سے بالکل علیحدہ ہو گا۔

نائب صدارت کا انتخاب صرف وہی شخص لڑ سکے گا جس کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہو گا

آئین کے اس مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جنرل یحییٰ خان نہ صرف عہدہ صدارت کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ کمانڈر انچیف کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ یعنی 25 مارچ 1969ء کو انہوں نے جس دوہرے عہدے پر قبضہ کیا تھا اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات بلاشبہ واضح ہے کہ وہ مارشل لا کے کا نفاذ کمانڈر انچیف کا حق سمجھتے تھے اور کمانڈر انچیف کے اختیارات کو صدر اور آئین سے ماورا گردانتے اور یوں کوئی بھی شخص انہیں ان کے عہدے سے نہ ہٹا سکتا۔ جنرل یحییٰ خان نہ تو صدر کا عہدہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی وہ کسی کو تلوار کی طرح اپنے سر پر لٹکنے کی اجازت دے سکتے تھے۔

اس آئین کی دوسری دفعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس آئین کے تحت صدر کا عہدہ نمائشی نہ ہوتا۔ اس حوالے سے ہم جنرل یحییٰ خان کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہیں جو انہوں نے مجیب الرحمٰن کی طرف سے عہدہ صدارت کی پیش کش ہونے کے بعد دیا کہ وہ مزید عرصہ کے لیے بے اختیار سربراہ بننا پسند نہیں کریں گے۔ ایک ایسا فرد جس نے آئین کا مسودہ تیار کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اس نے واضح انداز میں کہا کہ اسے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ جنرل یحییٰ خان صدارت کے عہدے پر فائز رہنا چاہتے ہیں' لیکن مملکت کے تمام اختیارات صدر کی ذات میں مرتکز نہیں ہوں گے کیونکہ مارشل لا دور حکومت میں صدر کے اختیارات آئینی صدر سے زیادہ ہوتے ہیں جو پارلیمانی نظام جمہوریت میں وزراء کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس آئین میں اس شق سے ملتی جلتی ایک اور شق بھی تھی۔ یہ آرٹیکل 260 ہے جو

درج ذیل ہے:

"260(1) پورے پاکستان یا پاکستان کے کسی ایک حصے میں مارشل لا کا نفاذ ناگزیر ہو جائے۔ ناگزیر حالات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) ملک کو کسی بیرونی طاقت کی جانب سے فوری حملے کا خطرہ ہو۔

(ب) ملک میں امن و امان کا اتنا بگڑ جائے کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں اس پر قابو پانے میں ناکام ہو جائیں۔

(ج) کوئی ایسا سنگین مسئلہ جس سے پورا ملک یا ملک کا کوئی ایک حصہ شدید طور سے متاثر ہو رہا ہو یا اس آئین سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ جسے آئینی، سیاسی یا انتظامی طریقے سے حل نہ کیا جا سکے۔

(2) اس آرٹیکل کے کلاز (i) میں درج حالات اگر پیدا ہو جائیں تو پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف صدر کی درخواست پر یا خود اپنی تحریک پر، لیکن صرف صدر کے مشورے پر پاکستان کے کسی ایک حصے کو یا پورے پاکستان میں مارشل لا نافذ کر سکتا ہے۔

(3) اس آئین کے نفاذ سے قبل یا بعد میں نافذ ہونے والے مارشل لا کی منسوخی کا اختیار پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف کے پاس ہوگا جو مارشل لا کی منسوخی سے قبل صدر سے مشورہ کرے گا۔

(4) یہ اختیار بھی پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہوگا، کے پاس ہوگا کہ وہ مارشل لا کی مدت کو کم کر دے یا آئین میں دی ہوئی دفعات کے مطابق کم کر دے، لیکن مذکورہ پرسنل اتھارٹی کے پاس آئین کو منسوخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

(5) اس آرٹیکل کے کلاز (4) کی دفعات سے مشروط طور پر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے پاس اختیار ہوگا کہ مارشل لا کے تسلسل کے عرصہ میں مارشل لا کے ضروری ضوابط اور آرڈرز نافذ کرے۔ اسی طرح چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مارشل لا اتھارٹی کو مارشل لا کے آرڈرز تشکیل دینے کے اختیارات تفویض کر سکتا ہے۔

مارشل لا لگانے کی اجازت

دوسرے لفظوں میں آئین نے بذات خود مارشل لا کے نفاذ اور اس کی منسوخی کو تسلیم کر لیا۔ اگرچہ آئین میں مارشل لا کے نفاذ کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اب آئین کو منسوخ کرنے کے بجائے اسے معطل کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا۔ اس ذہنی تضاد پر ہر شخص حیران ہوتا ہے اگر جنرل یحییٰ خان یہ بات سوچنے کے حوالے سے حق بجانب تھے کہ مارشل لا کا نفاذ کسی بھی کمانڈر انچیف کا بنیادی حق ہے اور وہ مارشل لا کے تقدس کو آئین سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اس کے لیے اس بات کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ آئین مارشل لا کے نفاذ کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے واضح طور پر اس نظریے کے درست ہونے سے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔

درحقیقت یہ مسودہ آئین 16 دسمبر 1971ء کو پریس میں دیا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ ہدایات بھی جاری کی گئیں کہ جب تک اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی جائے اس وقت تک اسے نہ چھاپا جائے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ سقوط ڈھاکہ بھی 16 دسمبر ہی کو پیش آیا تھا۔ حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ہتھیار ڈالنے کی شرائط کے مذاکرات سے ایک ہفتہ قبل بہت سے اقدامات ممکن تھے اور اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل روزانہ ہی ایسی قراردادوں پر بحث کر رہی تھیں۔ جن کا مقصد جنگ بندی تھا۔ یہ بات مشکل ہی سے کہی جا سکتی ہے ہتھیار ڈالنے کا عمل حیران کن تھا اور یہ کہ جس تاریخ کو یہ مسودہ آئین پریس میں دیا گیا تو وہ محض اتفاق تھا کہ اسی تاریخ کو سقوط ڈھاکہ ہوا۔

خیالی دنیا

اس وقت جنرل یحییٰ خان غیر حقیقی یعنی خیالوں کی دنیا میں رہ رہے تھے۔ یہ بات اس حقیقت سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ مغربی سرحد پر سیز فائر کے بعد 18 دسمبر کو بھی جنرل یحییٰ اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ ان کے آئینی منصوبے بے کار نہیں ہوئے ہیں اور وہ اپنے ٹائم ٹیبل پر عملدرآمد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فی الحقیقت انہوں نے اعلان کیا کہ آئین 20 دسمبر 1971ء کو

نافذ کیا جائے گا لیکن اس تاریخ کو جو کچھ ہوا اسے سب جانتے ہیں اور اس کا یہاں تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس دوران میں بہرحال یہ بات سامنے آئی ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ آئین کے مسودے میں آرٹیکل کی شق (جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے) لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس بنا پر انہوں نے مسودہ آئین کی کاپیاں انتہائی جلدی میں تیار کروائیں جن میں یہ آرٹیکل حذف کر دیا گیا تھا۔

ہم نے اوپر متعدد حالات کا حوالہ دیا ہے جن سے جنرل یحییٰ خان کے اقدامات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اقتدار پر قبضہ کیا اور اس حوالے سے انہوں نے پیشگی تیاری کی تھی۔ جس انداز میں انہوں نے انتخابات کو ملتوی کرنے کے لیے اقدامات کئے اور بعد میں اسی طرح کے حربے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے لیے انہوں نے استعمال کیے۔ جس انداز میں انہوں نے سیاسی مقاصد کے لیے فنڈز کو اکٹھا کیا اور انہیں استعمال کیا تاکہ وہ متعدد پارٹیوں کے ساتھ مذاکرات کر سکیں اور آخر میں ان کے مستقبل کے منصوبے جو آئینی مسودے سے آشکار ہوتے ہیں' یہ سارے عوامل اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں چھوڑتے کہ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار کے حصول کی ذاتی خواہش کے لیے مارشل لا نافذ کیا تھا۔

شراب اور عورتیں

جنرل محمد یحییٰ خان کی نجی زندگی کے بارے میں نہ صرف عوامی سطح پر بہت کچھ کہا گیا ہے بلکہ ہمارے سامنے شہادت کے دوران بھی گواہان نے ان کی نجی زندگی بارے بتایا ہے۔ ہم نے اس سوال کا تجزیہ اس وجہ سے نہیں کیا ہے کہ ہمیں ان کی نجی زندگی سے کوئی سروکار ہے بلکہ ہم نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ آیا ان کا یہ کردار ان کے سرکاری فیصلوں اور امور کی انجام دہی پر اثر انداز ہوا کہ نہیں۔

وہ سب لوگ جن کا جنرل یحییٰ سے قریبی تعلق رہا ہے انہوں نے متفقہ طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جنرل یحییٰ بہت زیادہ شراب نوشی کرتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے صدر بننے کے بعد اچانک شراب نوشی شروع کر دی ہو بلکہ شراب نوشی طویل عرصے سے ان کی نجی زندگی کا ایک اہم پہلو تھا۔ گواہوں نے یہ تو کہا ہے کہ وہ (جنرل یحییٰ) بہت زیادہ شراب نوشی کرتے تھے' لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ شراب پینے کے بعد وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتے تھے۔ شراب نوشی جنرل یحییٰ کا معمول تھا۔ اس حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات وہ معمول سے زیادہ

شراب پی جاتے تھے۔ ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس قدر کثرت سے شراب نوشی نے ان کے ذہنی قویٰ پر اثر ڈالا ہوگا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص پر صدارت اور مسلح افواج کی قیادت کی دوہری ذمہ داری تھی اسے اور زیادہ چاق وچوبند (خاص طور پر جنگ کے نازک دنوں میں) رہنے کی ضرورت تھی لیکن یہ کہنے کے باوجود ہمارے سامنے ایسی کوئی شہادت نہیں آئی ہے جس سے ظاہر ہو کہ ان کی اس کمزوری نے ان کے سرکاری امور کی بجا آوری پر اثر ڈالا ہو۔ یہ کہ انہوں نے جنگ کے نازک دنوں میں آپریشن روم کا دو سے زیادہ مرتبہ معائنہ نہیں کیا۔ اس مسئلے پر ہم نے اس رپورٹ میں کسی اور جگہ اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے قابل نہیں ہیں کہ ان کی حد سے زیادہ شراب نوشی نے ان کے فرائض کی بجا آوری میں اس کے سوا اثر ڈالا ہو کہ جس کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ یہ بات لازم ہے کہ زندگی کی اس طرح کی عادت کسی نہ کسی حد تک ذہنی کسل مندی ضرور پیدا کرتی ہے۔

ان کی نجی زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی عوامی سطح پر بحث کے علاوہ ہمارے سامنے بھی گواہوں نے شہادت دی ہے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو عورتوں سے تعلقات پر مبنی ہے۔ ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان جنسی حوالے سے معتدل مزاج نہیں تھے۔ جن عورتوں کے ساتھ ان کے ناجائز تعلقات تھے بدقسمتی سے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان عورتوں میں سے ایک صدر کے ریاستی گیسٹ ہاؤس میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا کرتی تھی اور کم از کم ایک موقعہ پر صدر صاحب اپنے گھر سے غیر حاضر پائے گئے۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ صدر صاحب اس مذکورہ خاتون کے گھر میں تھے۔ ہم یہ بیان کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے سرکاری امور کی بجا آوری میں طرف داری اپنائی' مثال کے طور پر جب انہوں نے اس مذکورہ خاتون اور ان کے خاوند کو بیرون ملک سفیر کے عہدہ پر مقرر کیا۔ دوسرے کیسز یہ سامنے آئے ہیں کہ انہوں نے بعض خواتین کو صنعتی لائسنس دینے کے لئے مداخلت کی یا پھر انہیں بیرونی دوروں کے لئے بہت زیادہ روپیہ دیا اور ایک واقعہ میں تو صدر کی خواہشات کی تکمیل نہ کرنے پر ایک سینئر افسر کو برطرف کر دیا گیا۔ اس حوالے سے عورتوں کے ساتھ ان کے تعلقات نے ان کے سرکاری امور کی انجام دہی پر اثر ڈالا۔ ہمیں حکومت کے امور (خاص طور پر جنرل یحییٰ کے دور میں) کی انکوائری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف ان وجوہات کا اندازہ لگانے تک محدود ہیں جو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے اور مغربی پاکستان

میں بیز فائز کا سبب بنے۔ ہم ایسی کوئی شہادت ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئے ہیں جس سے یہ بات سامنے آتی ہو کہ ان کے عورتوں کے ساتھ تعلقات کا ان معاملات سے کوئی معمولی سا بھی تعلق ہو سوائے اس کے کہ ملک کے مشکل ترین دور میں ان کا ذہن معمول کی عیاشیوں میں الگا رہا۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ جنرل یحییٰ اقتدار میں شراکت پسند نہیں کرتے تھے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کا تجزیہ کریں کہ اس صورتحال تک پہنچنے میں ان کے ساتھیوں کا کردار (اگر کوئی ہے) کس حد تک ہے۔

یحییٰ کے دور کا طریقہ کار

اس مقصد کے حصول کے لیے مختصر طور پر اس جگہ کا معائنہ کرنا ضروری ہے جسے جنرل یحییٰ خان کا سیکرٹریٹ کہا جاتا تھا۔ بلاشبہ سول سطح پر متعدد وزارتوں کے سربراہ اور سیکرٹریز حضرات ہوتے جبکہ سوالات کے وقفہ کے عرصہ میں وزراء حضرات بھی موجود ہوتے۔ وزارتوں کی جانب سے صدر کو بھیجی جانے والی فائلیں سب سے پہلے سیکرٹری صدر سیکرٹریٹ (پبلک) کو مارک ہوتی تھیں۔ اس وقت سیکرٹری کے اس عہدے پر مسٹر قیوم فائز تھے۔

مسٹر قیوم نے اپنے آپ کو صدر کا سیکرٹری کہے جانے پر بار بار احتجاج کیا۔ وہ یہ بات واضح کرنے کے لئے بے تاب تھے کہ وہ صدر کے سیکرٹریٹ کے سیکرٹری انچارج تھے نہ کہ صدر کے سیکرٹری۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس بات سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ متعدد قسم کی ہدایات انہی کے پاس سے گزر کر جاتی تھیں۔ ان صاحب کے متعلق خیال نہیں کیا جاتا کہ وہ براہ راست صدر کے پاس فائل لے جاتے ہوں گے یا فائل پر نوٹ لکھتے ہوں گے۔ ان کا کام بس اتنا تھا کہ فائل کو پرسنل اسٹاف آفیسر جنرل پیرزادہ کو بھیج دیتے اور اس کے ساتھ اگر جنرل پیرزادہ اپنی طرف سے کوئی نوٹ لکھتے تو وہ علیحدہ سے فائل میں اس فائل کے ساتھ لگایا جاتا۔ جب یہ کاغذات واپس وزارت کے پاس پہنچتے تو ان نوٹنگز (Notings) کو علیحدہ کر دیا جاتا اور یوں یہ سرکاری ریکارڈ کا حصہ نہ بنتیں۔

بہرحال یحییٰ خان کے اس دور میں صدر کے سیکرٹریٹ میں ایسا سسٹم بنا دیا گیا تھا کہ صدر ہر پیر کو پرسنل سٹاف آفیسر اور چیف آف سٹاف کی موجودگی میں تمام سیکرٹریوں سے ملاقات کرتے اور سیمیں پر کابینہ کی میٹنگز ہوتیں۔ اس عرصہ میں کابینہ موجود تھی۔ اگرچہ اس صورتحال

سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سیکرٹری حضرات کو صدر سے براہ راست ملاقات کا موقع ملتا لیکن اس عمومی سیٹ اپ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سیکرٹری حضرات کی صدر تک بلاواسطہ پہنچ صرف تکنیکی طور پر درست ہے اور اس سے زیادہ کچھ کہنا مبالغہ آمیزی ہوگا۔ انفرادی فائلوں پر نوٹ لکھنے کے علاوہ نہ تو وہ صدر کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوتے اور نہ ہی وہ ایسا کرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ سیاسی فیصلے جن میں لیگل فریم ورک آرڈر کی تشکیل بھی شامل ہے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا معاملہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان کے فیصلے کے لئے اس طرح کی کسی فائل کی ضرورت نہیں تھی اور سیکرٹری حضرات کے لئے ایسا کوئی موقع نہ ہوا کہ وہ ان معاملات سے متعلق صدر کو مشورہ دیتے۔

اس سوال نے ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑا ہے کہ آیا ذمہ دار سرکاری افسران کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ صدر کے سامنے حق بات کہتے اور اس بات پر اصرار کرتے کہ یہ مخصوص فیصلے درست نہیں ہیں اور افسران کے لاتعلقی اختیار کرنے کے بعد کیا وہ ان فیصلوں کے مضمرات سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے خلاف یہ بات کہی جاتی ہے کہ حکومتی ملازم کا فرض یہ ہے کہ وہ اس فیصلے پر عملدرآمد کرے۔ ہم اس بات سے اتفاق نہیں کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ فیصلہ سازی سے قبل یا کم از کم اس پر عملدرآمد سے قبل ہم سمجھتے ہیں کہ حکومتی ملازم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس بات پر اصرار کرے کہ یہ فیصلہ غلط کیا گیا ہے جب وہ احتجاج اور مشورے کا فریضہ سرانجام دے لے تو اس کے بعد اس پر عملدرآمد کا مرحلہ آتا ہے۔

واقعات کی جو تصویر ہمارے سامنے آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر کو مشورہ دینے کا امکان نہایت مایوس کن تھا یہاں تک کہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان جو اس دور حکومت میں وزیر قانون تھے جو بعد ازاں اپنے عہدے پر مشیر قانون کی حیثیت سے متمکن رہے۔ انہوں نے ہمارے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ صدر یحییٰ کو مشورہ دینا ممکن نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے لئے خود کسی کو بلاتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر کوئی موقع پیدا ہوتا تو وہ اپنی رائے کا اظہار کر دیتا اور اگر صدر صاحب اس موضوع پر بات جاری رکھنے کے خواہشمند نہ ہوتے تو معاملہ وہیں پر ختم ہو جاتا۔ انہوں نے کہا کہ اکثر موقع پر وہ کسی مسئلے سے متعلق قطعی رائے رکھتے لیکن اپنی رائے کے اظہار کے لئے انہیں کوئی مناسب موقع نہ ملتا تو وہ اس بارے میں نوٹ لکھتے۔ اس نوٹ پر توجہ ملنا یا نہ ملنا صدر کی صوابدید پر ہوتا۔ سول سروس کو اس

درجہ قابل حقارت بنادیا گیا تھا کہ ہم اس حیثیت کو صرف سمجھ سکتے ہیں لیکن وزراء کا نقطہ نظر اور رویہ تو مختلف ہونا چاہئے تھا۔ وزیر کل وقتی ملازم نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے کیریئر کو اس حوالے سے کوئی خطرہ ہوتا ہے۔ ہمارا یہ سوچنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ جب کوئی وزیر صدر کی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتا تھا اور اسے صدر کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی اجازت بھی نہ ہوتی تھی سوائے چاہئے تھا کہ وہ استعفیٰ دے دیتا لیکن کسی وزیر کی طرف سے بھی اس طرح کا ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔

جنرل یحییٰ اور ان کے قریبی عسکری ساتھیوں نے سول سروس کے فرائض' حقوق اور مراعات کے بارے میں اپنی نفرت کو کبھی نہیں چھپایا تھا۔ اس وقت کے آمرانہ دور حکومت میں اس طرح کے رویے کے حامل فوجی افسروں کے سامنے سول افسران کا ان کو مشورہ دینا ممکن نہیں تھا اور جس انداز میں حکومت چلائی جارہی تھی اس بارے میں اگر سول افسران کو مکمل طور پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تو کم ازکم ان سے وضاحت طلب کی جاسکتی تھی۔

یحییٰ خان کے اصل مشیر

جنرل یحییٰ کے اردگرد فوجی افسروں کے لئے گروپ نے گھیرا ڈال رکھا تھا جو ان کے بہت قریب تھے اور ان پر خاصا اثرورسوخ رکھتے تھے۔ ان میں جنرل حمید' جنرل گل حسن' جنرل پیرزادہ' جنرل مٹھا اور جنرل عمر شامل تھے ان میں سے پہلے (جنرل حمید) عملی طور پر ڈپٹی کمانڈر انچیف اور ڈپٹی چیف مارشل اور ایڈمنسٹریٹر تھے دوسرے (جنرل گل حسن) چیف آف جنرل اسٹاف جبکہ جنرل پیرزادہ اس حد تک تمام حالات کے انچارج تھے کہ انہیں حتیٰ کہ وزیراعظم بھی کہا جاتا تھا۔ جنرل مٹھا کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ جنرل یحییٰ نے مشکل وقت میں ان سے صلاح مشورہ کیا مثلاً جب مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا فیصلہ ہوا جہاں وہ دوسرا محاذ کھلنے (10 اپریل 1971ء) تک قیام پذیر رہے۔ جنرل یحییٰ نے 20 دسمبر 1971ء کو اقتدار چھوڑنے کے وقت بھی ان سے مشورہ کیا۔ یہ بات عیاں ہے کہ اس روز وہ (جنرل مٹھا) ایوان صدر کی حفاظت کے لئے کافی تعداد میں کمانڈوز کو متحرک کرنے کی کوشش میں رہے۔ جنرل گل حسن نے خصوصیت سے جنرل مٹھا کو یحییٰ کا قریبی ساتھی بتایا۔ جب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جنرل یحییٰ لوگوں کے حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہر قیمت پر خود کو اقتدار میں رکھنا چاہتے تھے تو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جرنیل اس منصوبے کے سرگرم شریک کار تھے یا محض بہ امر مجبوری انہوں نے یہ کردار ادا کیا۔ یہ سب انتہائی منجھے ہوئے اور سینئر افسر تھے۔ ان سب سے کوئی بھی حالات کی پیچیدگی سے اپنی لاعلمی کا بہانہ نہیں بنا سکتا۔ مزید برآں جنرل یحییٰ کے اقتدار کی بنیاد ہی فوج تھی اور جب تک ان دونوں جنرلوں کے عہدے کے لوگ جن سے جنرل یحییٰ روزانہ ملتے اور مشاورت کرتے وہ ان کے اقتدار کو جاری رکھنے پر رضامند نہ ہوتے تو جنرل یحییٰ اقتدار میں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ ان جنرلوں کی اپنی اعلیٰ مراعات اور اقتدار کا دارومدار بھی جنرل یحییٰ کی حکومت پر تھا۔ ان کا منشاء بھی یہی تھا کہ یہی حکومت رہے اور یہی اختیارات رہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تمام جنرل یحییٰ خان کے مارشل لا نافذ کرنے اور حکومت حاصل کرنے کے ابتدائی پلان میں شریک تھے۔

جنرل عمر کا کیس بھی اپنی قسم کا انوکھا کیس ہے۔ وہ قومی سلامتی کونسل کے سیکرٹری تھے لیکن جیسا ہمیں نظر آیا وہ اپنی ذمہ داری کی آڑ لے کر جنرل یحییٰ کے لئے اس سے زیادہ اہم امور سرانجام دیتے رہے۔ ان کے پاس بھاری مقدار میں نقد رقم تھی جو یقیناً ان کے محکمہ کے بجٹ کا حصہ نہیں تھی اور اس رقم کا ذریعہ ہمارے سامنے سرکاری طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ جنرل یحییٰ اور وہ (جنرل عمر) دونوں اس سیکرٹ فنڈ کی موجودگی سے انکار کرتے رہے اور نہ ہی اس رقم کے مصرف کا کوئی سرکاری اعلان کیا گیا جو کہ یقیناً جنرل یحییٰ کی ہدایات پر عموماً یا خصوصاً ان کے متعین کردہ مقاصد پر خرچ ہوتی تھی حتیٰ کہ ان کے قریبی ماتحت بھی اس رقم کے ذریعہ یا مقاصد سے لاعلم تھے۔ دوسری طرف کافی ثبوت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے (جنرل عمر) سیاستدانوں سے قریبی رابطے تھے جن سے وہ یا صدر کے ایلچی کے طور پر یا یحییٰ کی پالیسیوں کی ترویج کے لئے ملتے اور بخصوص لائحہ عمل کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ تمام امور ان کی سرکاری ڈیوٹی میں شامل نہیں تھے۔ الیکشن مہم سے پہلے اور بعد کے حالات کے جائزے کے دوران ہم نے دیکھا کہ جنرل یحییٰ نے کسی جماعت کی حمایت نہیں کی بلکہ وہ ایسے نتائج کی توقع کررہے تھے جن میں کوئی بھی جماعت اس حد تک طاقتور نہ بنے جو ان سے اپنی شرائط منوا سکے۔ اس مقصد کے لئے کئی چھوٹی جماعتوں کو الیکشن میں جھونکا گیا۔ جنرل عمر نے الیکشن سے کافی پہلے ہی رقم اکٹھی کرلی تھی جو انہوں نے انتخابات میں خرچ کی۔ یہ واضح ہے کہ انہوں نے اسے اپنے مقصد کو آگے بڑھانے پر ہی لگایا ہوگا۔ انتخابات کے بعد بھی جنرل یحییٰ کی کوشش یہ تھی کہ وہ پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر نتائج

کو کالعدم قرار دے دیں۔ اس عرصہ میں بھی جنرل عمر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سیدھی سادی سرکاری نوکری کرتے رہے۔ انہوں نے تمام تر غیر قانونی ہتھکنڈوں سمیت جنرل یحییٰ کی غاصبانہ اقتدار برقرار رکھنے میں مدد اور اعانت کی۔ ان کا مقصد بھی جنرل حمید اور پیرزادہ کی طرح اپنی مراعات یافتہ حیثیت کو دوام دینا ہی تھا۔

لہٰذا ہم اس ناخوشگوار نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ چاروں جنرل صدر یحییٰ کے ناجائز اقتدار پر قبضے میں اپنی مرضی اور سرگرمی سے کردار ادا کرتے رہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس طرح کے اور بھی لوگ ہوں لیکن چونکہ ہمیں ایسی شہادتیں نہیں ملیں اس لئے ہم اپنی تحقیقات کو ان تک نہیں لے جا سکتے۔

جہاں تک دوسرے سرکاری حکام کا تعلق ہے تو یہ عیاں ہے کہ وہ پالیسی ساز حکومتی مشینری میں شامل نہیں تھے۔ وہ صرف احکامات پر عملدرآمد کرتے تھے۔ انہیں فوجی حکومت محکوم سمجھتی۔ چونکہ ان کی نوکری کا دارومدار حکومت کے برسراقتدار رہنے سے نہیں تھا اس لئے فوجی افسروں کی طرح ان کے وہ مقاصد نہیں تھے لہٰذا ہم کسی سرکاری افسر کو اس سازش کا حصہ نہیں سمجھتے۔

ان میں ایک قابل توجہ استثناپی ایس پی رضوی کا ہے جو اس وقت ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے۔ ہمارے سامنے شہادتیں آئی ہیں کہ وہ سیاست میں مصروف رہے۔ صنعت کاروں اور دوسروں سے فنڈز اکٹھے کرتے اور اسے جنرل یحییٰ ان کی فوجی حکومت کے سیاسی عزائم کو ترویج دینے میں استعمال کرتے رہے: تاہم ہم صرف یہ اخذ کر سکے ہیں کہ وہ فوجی حکومت کے ایک آلہ کار کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انہیں اختیارات پر قابض رہنے میں مصروف فوجی جرنیلوں کے برابر نہیں رکھا جا سکتا۔

بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت اور ان کے اثرات

ابتدائی ابواب میں ہم نے مشرقی پاکستان کے سانحہ کے سیاسی عناصر کا تجزیہ کیا۔ اب ہم بین الاقوامی تعلقات اور ان کے اثرات کی طرف آتے ہیں جن کا ہماری تحقیقات کے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔ قومی سلامتی اور دفاع ناگزیر طور پر خارجہ پالیسی سے جڑے ہوئے ہیں اور خارجہ پالیسی جغرافیائی حیثیت سیاسی فلسفے اور لوگوں کے قومی نظریے کی پیداوار ہوتی ہے۔

ایشیا اور افریقہ میں قائم ہونے والی اکثر ریاستوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ آزادی کی تحریک کا اختتام دراصل اپنا وجود قائم رکھنے کی کوشش کا آغاز ہے۔ ان میں نہ صرف بین الاقوامی تعلقات سے نمٹنے کے تجربہ کی کمی تھی بلکہ ان کے پاس اپنی قومی سلامتی اور ترقی کے وسیع خارجہ پالیسی کو شکل وصورت دینے کی بھی تربیت نہیں تھی۔ چنانچہ خارجہ امور میں ان کی کارروائی دنیا کی عظیم قوتوں کے اثر ورسوخ کے دائرے میں گھوم رہی تھی۔ پاکستان میں ہمارے لئے یہ مسئلہ اس لئے بھی زیادہ گھمبیر ہو گیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے جغرافیائی طور پر الگ تھے اور ان کے درمیان ہزار میل کا بھارتی علاقہ پڑتا تھا اپنے حدود اربعہ کی وجہ سے ہمیں جنوب مشرق اور مشرق وسطیٰ میں برابر کی دفاعی اہمیت حاصل تھی مغربی پاکستان ایک انتہائی حساس علاقے میں واقعہ ہے جہاں چین' سوویت یونین' افغانستان اور ایران ہمارے ہمسائے ہیں جبکہ اس طرح مشرقی پاکستان میں ہم برما' تھائی لینڈ' ویتنام' ملائشیا اور انڈونیشیا کے قریب ہونے کے باعث جنوب مشرقی ایشیا کا حصہ تھے۔ ان ممالک کو ایشیا میں مغربی استعمار کا اعصابی مرکز خیال کیا جا سکتا ہے لیکن ہماری مشکلات کی بنیادی وجہ بھارت کی طرف سے ہمارے آزاد خود مختار وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر صلح صفائی سے رہنے میں ناکامی ہے جو نہ تو ہمارے آزاد اور خود مختار وجود

کو دل سے تسلیم کرتا ہے اور نہ ہم سے مصالحت چاہتا ہے۔

چھوٹے ممالک بڑے ملکوں کے مقابلے میں اپنی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کی حفاظت کی ضرورت کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں کیونکہ بڑے ممالک طاقتور ہونے کی وجہ سے اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ عالمی سیاست میں ابتری کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ ریاستیں طاقت کا احترام کرتی ہیں اور کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں حالانکہ یہ طرز عمل بین الاقوامی قانون کے اصول سے ہم آہنگ نہیں' بین الاقوامی طرز عمل کے اصولوں اور ریاستوں کے حقیقی رویئے میں خلیج موجود ہے' چھوٹے اور ترقی پذیر ممالک کئی حوالوں سے غیر محفوظ ہیں۔ وہ فوجی اور اقتصادی دونوں حوالوں سے کمزور ہیں۔ انہیں سرحدی جھگڑے اپنے سامراجی آقاؤں سے وراثت میں ملے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بننے کے لئے انہیں اقتصادی اور مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑی طاقتیں فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے امداد دینے والے کی حیثیت سے بڑی طاقتیں مداخلت کرتی ہیں اور امداد لینے والے ممالک کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں۔

گزشتہ 20 سالوں میں عالمی طاقتوں کے ظہور نے ریاستوں کے باہمی تعلقات کا پورا تصور ہی بدل دیا ہے۔ عالمی طاقتوں سے دوطرفہ تعلقات کی نوعیت کے تعین اور اپنے قومی مفادات کے فروغ کے لئے چھوٹے اور ترقی پذیر ممالک کے لئے مزید پیچیدگیاں اور مشکلات ہیں۔ یہ تعلق برابری کی سطح پر قائم نہیں ہوتے اور کسی چھوٹے ملک کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انصاف کے تقاضوں یا دیانت داری کے اصولوں کے تحت بڑی طاقت سے اپنی بات منوا سکے' حتمی تجزیہ یہ ہے کہ چھوٹے اور بڑے ممالک کے باہمی تعلقات کی نوعیت عالمی طاقتوں کے اپنے مفادات پر منحصر ہوتی ہے اور یہ اپنے مفادات ہی عالمی طاقت اور چھوٹے ممالک میں لامحدود اور غیر مساوی محاذ آرائی پیدا ہونے کا باعث بنتے ہیں۔ اس تناظر میں بھارت اور دوسری تین عالمی طاقتوں کے ساتھ نومبر 1971ء سے قبل پاکستان کے تعلقات کی نوعیت کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ جائزہ قیام پاکستان سے سقوط ڈھاکہ تک ان ممالک سے تعلقات میں اتار چڑھاؤ کی مختصر تاریخ پر نظر ڈالے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی تین مراحل سے گزری ہے پہلا مرحلہ اقوام متحدہ کی طرف سے ہماری قومی سلامتی کی ضمانت اور کشمیری عوام کے حق خودارادیت کو تسلیم کرنے کے دور سے متعلق ہے لیکن جب بھارتی ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ اقوام متحدہ غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے تو ہم اپنی غیر جانبدارانہ (خارجہ) پالیسی ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پاک بھارت تعلقات

دلیل اور جغرافیائی حالات اور عالمی طاقتوں کا اثر و رسوخ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں امن سے رہیں لیکن غربت کے مارے عوام کو ان ثمرات سے محروم رکھا گیا جو انہیں سیاسی آزادی کے باعث حاصل ہونے چاہئیں تھے۔ ہندوؤں کی قومی سوچ جس سے گزشتہ صدی کے کئی ہندو مفکرین متاثر تھے یہ ہے کہ پاکستان سمیت پورا برصغیر ایک ناقابل تقسیم خطہ ہے حالانکہ جغرافیائی حوالے سے برصغیر انگریز راج یا مغل بادشاہ اورنگزیب کے دور حکومت کے سوا مکمل طور پر کبھی بھی ایک سلطنت کے کنٹرول میں نہیں رہا لیکن جب برصغیر کے مسلمان اپنے لئے وطن بنانے میں کامیاب ہو گئے تو ہندوؤں نے پاکستان کو اپنے مادر وطن بھارت کے ٹکڑے کرنے کے مترادف قرار دیا' ہندو رہنما تقسیم برصغیر کو صرف اس وقت قبول کرنے پر تیار ہوئے جب یہ انہیں ناگزیر نظر آنے لگی اور انہوں نے اسے برطانیہ کی طرف سے ہندوستانیوں کو انتقال اقتدار کی قیمت تصور کیا۔ انہوں نے تقسیم کو مصلحت کے تحت اس امید پر قبول کیا کہ نئی ریاست قائم نہیں رہ سکے گی اور اپنے بڑے ہمسائے کے دباؤ کے باعث ٹوٹ جائے گی۔

تقسیم ہند کے بعد روز اول سے ہی بھارت کی خواہش یہ تھی کہ پاکستان اس میں دوبارہ جذب ہو جائے یا اس کا طفیلی ملک بن کر رہے۔ بھارت نے 1947ء میں مہاجرین کا المناک مسئلہ بھی ہماری معیشت کو تباہ کرنے کے لئے پیدا کیا' غیر منقسم ہندوستان کے اثاثوں سے ہمیں ہمارا حصہ دینے سے انکار اور ہمارے ملک میں بہنے والے دریاؤں کے پانی کو روکنے اور رخ موڑنے کی دھمکی کی وجہ بھی یہی تھی۔

کشمیر پر قبضہ اور مسلم کش فسادات

تمام سمجھوتوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارت نے ریاست جموں وکشمیر کے ایک بڑے حصے پر زبردستی قبضہ کرلیا اور وہاں اپنی فوج جمع کر کے ہماری سلامتی کے لئے ایک سنگین خطرہ پیدا کر دیا۔

بھارتی لیڈروں نے اپنے مذموم منصوبوں کو خفیہ رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مسز اچاریہ کرپلانی نے جو 1947ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے اعلان کیا کہ کانگریس متحدہ ہندوستان کے اپنے دعوئی سے دستبردار ہوگی نہ بھارتی قوم۔ بھارت کے پہلے وزیر داخلہ اور کانگریس کے طاقتور لیڈر سردار وی بی پٹیل نے بھی تقریباً انہی دنوں اعلان کیا کہ جلد یا بدیر دونوں ممالک (پاکستان اور بھارت) پھر متحد ہو جائیں گے۔ یوں پاکستان کو اپنے پہلے یوم آزادی سے ہی اپنی بقاء کی سخت جدوجہد شروع کرنا پڑ گئی۔ پاکستان اور بھارت میں مرکزی مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ ایک اسلامی ملک اور ایک سیکولر ہندو ریاست باہم امن سے رہ سکتے ہیں یا نہیں۔

تقسیم ہند کے بعد مہاجرین کے مسئلے اور اثاثوں کی تقسیم کے علاوہ پہلا بڑا واقعہ جو دونوں ممالک میں شدید محاذ آرائی کا باعث بنا وہ بھارت کا اپنے ملک میں بڑی مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک تھا۔ صورت حال اس حد تک خراب ہوگئی کہ 1950ء میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کو انتہائی کشیدگی کی فضاء میں بھارت کا دورہ کرنا پڑا جس کے نتیجے میں لیاقت نہرو معاہدہ عمل میں آیا۔ معاہدے کا ابتدائی اعلامیہ یہ ہے۔

"پاکستان اور بھارت کی حکومتیں باضابطہ اتفاق کرتی ہیں کہ دونوں اپنے پورے ملک میں اقلیتوں سے مذہبی تفریق سے بالاتر ہوکر بطور شہری مساویانہ سلوک کریں گی۔ ان کے جان و مال، ثقافت اور وقار کا تحفظ کیا جائے گا اور آزادانہ آمدورفت، کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے اور تقریر اور عبادت کی قانون و اخلاقیات کے دائرے میں

رہتے ہوئے مکمل آزادی دی جائے گی"

بدقسمتی سے لیاقت نہرو معاہدے کے باوجود بھارت میں مسلم کش فسادات کا سلسلہ جاری رہا دونوں ممالک کے تعلقات انتقال آبادی کے مسئلے سے بھی متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ سرحدوں کے تعین کے لئے باؤنڈری کمیشن کے فیصلے بھی کشیدگی کی وجہ بنے جن میں مشرقی پاکستان کا باگے (Bagge) ایوارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

بھارت کی طرف سے مغربی پاکستان کو طاس سندھ کے دریاؤں اور مشرقی پاکستان کو دریائے گنگا کے پانی کا جائز حصہ دینے سے انکار نے مزید پیچیدگیاں پیدا کیں۔ طاس سندھ پانی کے معاہدے سے مغربی پاکستان میں تنازع طے پا گیا۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں فرخا بیراج کا پریشان کن مسئلہ 1971ء کی جنگ تک حل طلب تھا۔

بھارت کی کھلی جارحیت

دونوں ملکوں کے درمیان سب سے زیادہ دھماکہ خیز تنازع بدقسمتی سے ریاست جموں وکشمیر کے بڑے حصے پر بھارتی قبضہ تھا۔ جغرافیائی، معاشی اور ثقافتی ہر حوالے سے کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور اگر وہاں کے عوام کو آزادانہ طور پر کسی ایک ملک کے انتخاب کا موقع دیا جائے تو وہ فطری طور پر پاکستان میں ہی شامل ہونا پسند کریں گے۔ ریاست پر بھارتی قبضہ اور کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے سے انکار بھارت کی کھلی جارحیت تھی۔ نہ تو اس رپورٹ کا یہ مقصد ہے کہ مسئلہ کشمیر کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے نہ یہاں اس کی ضرورت ہے یہاں یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ بھارت 25 سال تک پاکستان اور اقوام متحدہ کی طرف سے اس مسئلے کو سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق پرامن طور پر حل کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بناتا رہا، یکم جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے سیز فائر کرانے کے بعد بھارت نے ریاست پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لئے جو ہتھکنڈے اختیار کئے ان سے نہ صرف کشمیریوں میں بے چینی اور مایوسی پیدا ہوئی بلکہ پاکستان کی سلامتی کے لئے بھی خطرات پیدا ہو گئے۔ صدر ایوب خان کی طرف سے یکم ستمبر 1960ء کو نئی دہلی میں اور 19 سے 23 ستمبر 1960ء کے درمیان راولپنڈی میں جواہر لال نہرو سے ملاقاتوں کے دوران مسئلے کے حل کی کوششوں کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اکتوبر 1962ء کے بھارت چین تنازع نے امریکہ کو موقع فراہم کر دیا جس کا وہ آزادی کے وقت سے انتظار کر رہا تھا

اگر چہ 19 مئی 1954ء کوسلامتی اور امداد وتعاون کے معاہدے پر دستخط کے بعد سے پاکستان اور امریکہ کے تعلقات 50 کے عشرے کے آخری سالوں میں مسلسل فروغ پا رہے تھے لیکن بھارت کے غیر جانبدارانہ پالیسی پر مضبوطی سے جمے رہنے کے باوجود امریکہ نے اسے بڑے پیمانے پر اقتصادی امداد کی پیش کش کردی۔ امریکہ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ کیمونسٹ چین کو خطے میں اپنا اثر ورسوخ پھیلانے سے روکنے کی اس کی عالمی پالیسی کی کامیابی کے لئے بھارت کا تعاون ضروری ہے لداخ اور ''نیفا'' میں بھارتی فوج کی عبرتناک شکست پر امریکہ میں فوری ردعمل ہوا اور پاکستان سے ضروری مشورہ کئے بغیر امریکہ کے مغربی اتحادیوں نے بھارت کو فوجی امداد دینا شروع کردی اسی دوران 21 نومبر 1962ء کو چین نے یکطرفہ طور پر سیز فائر کا اعلان کردیا اور اپنی فوجیں واپس بلالیں لیکن امریکہ اور مغرب کے فوری اور پر جوش ردعمل سے حوصلہ پا کر نہرو نے دسمبر 1962ء میں اعلان کردیا کہ اگر بھارت چین سرحدی تنازع طے ہوگیا تو بھی ان کا ملک اپنی فوجی تیاریاں جاری رکھے گا۔ امریکہ کی مدد سے بھارت نے اپنی فوجی طاقت بڑھادی جس سے خطے میں طاقت کا توازن پاکستان کے خلاف ہوگیا اور ہمارے ملک کی سلامتی کے لئے سنگین خطرہ پیدا ہوگیا۔ یہاں یہ جائزہ دلچسپ ہوگا کہ بھارت اور امریکہ کا 1951ء میں باہمی دفاعی تعاون کا معاہدہ طے ہونے اور 1958ء میں اس کی تجدید کے باوجود امریکہ غیر جانبدار بھارت اور اپنے اتحادی پاکستان میں امتیاز روا رکھتا رہا لیکن 1962ء کی چین بھارت جنگ نے یہ فرق مٹادیا۔

امریکہ اور اس کے اتحادی ملک بھارت کو جتاتے رہے کہ اسے جلد چین کے ایک بڑے حملے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بھارت کو مسلح کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی صدر کینیڈی نے 28 اکتوبر 1962ء کو صدر ایوب کو لکھا کہ وہ نہرو کو یقین دلائیں کہ پاکستان سرحدوں پر کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ خط میں کینیڈی نے صدر ایوب کو یقین دلایا کہ پاکستان کا یہ اقدام برصغیر کے وسیع تر مفاد میں ہے اور آگے چل کر پاک بھارت سرحدی تنازعات طے کرنے کا ضامن ہوگا۔ صدر ایوب نے تامل کا اظہار کیا تو کینیڈی نے برطانوی وزیر اعظم ہیرلڈ میکملن اور آسٹریلوی وزیر اعظم آر جی مینز یز کے ذریعے ان پر دباؤ ڈلوایا اس سلسلے میں مزید کوشش کرتے ہوئے برطانیہ کے وزیر خارجہ برائے دولت مشترکہ ڈنکن سینڈز اور امریکہ کے نائب وزیر خارجہ برائے مشرق بعید ایورل ہیریمین نے پاکستان کے دورے کئے ان کوششوں کے نتیجے میں فیلڈ مارشل

ایوب اور نہرو نے 29 نومبر 1962ء کو ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جس میں کشمیر اور دوسرے متعلقہ مسائل کو حل کرنے کے لئے براہ راست مذاکرات پر اتفاق کیا گیا تھا تاکہ دونوں ممالک دوستی اور امن کے ساتھ رہ سکیں۔ نہرو نے اس مشترکہ اعلامیہ میں اس وقت دستخط کئے جب بھارت اور چین کے درمیان فوجی طاقت کا توازن بھارت کے نقطہ نظر سے تشویشناک تھا لیکن چین کی طرف سے یکطرفہ سیز فائر کے اعلان سے اس کا رویہ مکمل طور پر تبدیل ہوگیا۔ جب امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھارت کی فوجی امداد کو مسئلہ کشمیر کے حل سے مشروط نہیں کریں گے تو بھارت نے اس مسئلہ پر پاکستان کے ساتھ سنجیدہ مذاکرات پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بھارتی وقت حاصل کرنے کے چکر میں تھے اور مغرب سے اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ کے بدلے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے مشترکہ اعلامیہ انہیں کوئی بڑی قیمت محسوس نہ ہوا۔ بھارت نے اپنی سلامتی کو درپیش ایک بڑے خطرے کے موقع پر پاکستان کے احسان کو فراموش کردیا اور یوں بالآخر مسئلہ کشمیر کے حل کا ایک عظیم موقع ضائع ہوگیا۔

بھارت نے فوجی لحاظ سے اپنی مضبوطی اور صنعتی ترقی کا ہر نیا مرحلہ طے کرنے کے ساتھ پاکستان کے ساتھ مزید جارحانہ رویہ اختیار کرنا شروع کردیا۔ بھارتی لیڈر یہ سوچنے لگے کہ ایشیا پر ان کی سیاسی حکمرانی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے جو ایشیا کی سلامتی کے امریکی منصوبے سے بھی میل کھاتا تھا۔ کشمیر کے مشترکہ دفاع سمیت پاکستان اور بھارت کی ممکنہ کنفیڈریشن قائم کرنے کے لئے امریکہ میں مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بدقسمتی سے یہ نظریہ پاکستان کی سلامتی کی پروا کئے بغیر ایشیا پر بھارتی بالادستی قائم کرنے کی بنیاد پر استوار کیا گیا تھا۔ اس دوران درگاہ حضرت بل کے واقعہ پر کشمیر میں کنٹرول لائن کے دونوں طرف مسلمانوں کا زبردست احتجاج شروع ہوگیا اور صورت حال تشویشناک ہوتی گئی۔

اپریل 1965ء میں بھارت نے رن آف کچھ میں فوجی آپریشن کئے۔ جوابی کارروائی پر صورتحال بھارتی فوج کے لئے بدترین ہوگئی اور پاکستانی فوج اس پوزیشن میں آگئی کہ اسے عبرتناک شکست دے سکتی تھی۔ پاکستان نے فوجی فتح کے موقع سے فائدہ اٹھانے کی بجائے رن آف کچھ کا تنازع بین الاقوامی ثالثی سے حل کرنے سے اتفاق کرلیا۔ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحد پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں کہ 6 ستمبر 1965ء کی صبح بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کردیا۔

بلا شبہ بھارت کا مؤقف یہ ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے مقبوضہ کشمیر میں گوریلا کارروائیوں کے باعث بین الاقوامی سرحد پار کرنے پر مجبور ہوا جبکہ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ گوریلا کارروائیاں نہیں ہو رہی تھیں اور یہ کشمیری خود تھے جو بھارتی فوج کے خلاف مسلح جدو جہد کر رہے تھے۔ چنانچہ پاکستانی فوج نے فوری طور پر چھمب کے محاذ پر حملہ کیا تا کہ بھارت کو آزاد کشمیر پر قبضے سے روکا جا سکے۔ تقریباً پوری دنیا نے بھارتی حملے کی مذمت کی کہ اس نے بین الاقوامی سرحد پر جارحیت کا ارتکاب کیا تھا۔ عددی اعتبار سے بڑی بھارتی فوج کو چھوٹی لیکن انتہائی ثابت قدم پاکستانی فوج نے لاہور اور سیالکوٹ دونوں محاذ پر پسپا کر دیا۔ پاک فضائیہ اور بحریہ نے بھی انتہائی مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور پاکستان پر قبضے کی بھارتی کوشش ناکام ہو گئی۔

سیز فائر کے بعد تاشقند میں سربراہ مذاکرات ہوئے جو روس کی نئی ڈپلومیسی کی فتح اور برصغیر پاک و ہند کے بارے میں ایک نئی حکمت عملی کا آغاز تھے۔ اعلان تاشقند کے خلاف بھرپور عوامی ردعمل کے باوجود اس بات کی امید پیدا ہو گئی تھی کہ سوویت یونین کی نئی پیش رفت پاک بھارت تنازعات کے پرامن حل کا دروازہ کھولے گی لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ مارچ 1966ء میں مذاکرات ہوئے لیکن بھارت کشمیر کو ان کے ایجنڈے میں شامل کرنے پر تیار نہ ہوا۔ اکتوبر 1966ء میں پاکستان نے بھارت سے تمام تنازعات پر کسی تیسرے ملک میں مذاکرات کی خواہش کا اظہار کیا۔ 1969ء میں ہم نے تجویز پیش کی کہ تمام تنازعات کے حل کے لئے ایک خودکار انتظامی مشینری قائم کی جائے جو دونوں ممالک کے اہلکاروں پر مشتمل ہو۔ 1970ء میں ہم نے تجویز پیش کی کہ کشمیر سے پاکستان و بھارت دونوں ممالک کی فوجیں واپس بلالی جائیں تا کہ وہاں کے لوگ اپنے حق خودارادیت کو استعمال کر سکیں لیکن بھارت کے منفی طرز عمل کی وجہ سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

پاکستان نے فرخابیراج کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بھارت سے طویل مذاکرات کئے لیکن گنگا کے پانی کی تقسیم پر اختلافات دور نہ ہو سکے۔ ان تمام مذاکرات اور کوششوں کو اس حوالے سے کوئی کامیابی نہ ملی کہ کشمیر پر بھارت نے طاقت سے قبضہ برقرار رکھا۔

1947ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد سے 71ء تک پاکستان اور بھارت کے تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو مشرقی پاکستان کے بحران میں بھارت کے کردار کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔

بھارت کی سازش

مشرقی پاکستان کے ریاست مخالف عناصر سے بھارت کا گٹھ جوڑ پہلی بار اس وقت منظر عام پر آیا جب 1967ء میں اگرتلہ سازش پکڑی گئی۔ مشرقی پاکستان کو باقی ملک سے الگ کرنے کے لئے ایک انقلابی تنظیم قائم کی گئی اور شیخ مجیب الرحمٰن اس میں شامل ہو گئے۔ بھارت نے تنظیم کو ہتھیاروں اور مالی امداد کی فراہمی کے علاوہ یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فضائی اور سمندری راستے بھی بلاک کر دے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت کے مجموعی حالات کی وجہ سے اگرتلا سازش کیس کا فیصلہ نہ سنایا جا سکا لیکن اس سازش میں بھارت کے ملوث ہونے کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ حقیقت ہے کہ 1971ء میں حالات و واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے جن کا اس کیس کے دوران انکشاف ہوا تھا۔

30 جنوری 1971ء کو بھارتی حکام نے اپنے ایک ہوائی جہاز کی ہائی جیکنگ کا ڈرامہ کر کے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پاکستان کے مسافر طیاروں کی پروازوں پر پابندی لگا دی' بلوچستان اور سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج کی جوڈیشل انکوائری میں ہائی جیکر بھارتی ایجنٹ نکلے اور حکومت پاکستان اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے درمیان سیاسی اور آئینی مذاکرات کے دوران ملک کے دونوں حصوں میں سول طیاروں کی آمدورفت پر پابندی انتہائی پریشان کن ثابت ہوئی اور اس سے ملک کو درپیش مشکلات میں اضافہ ہوا۔

اسی دوران بھارت نے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کی پشت پناہی کے لئے اپنی فوجی نقل و حرکت میں اضافہ کر دیا' بھارتی فوج کی بڑی تعداد کو فروری اور مارچ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی سرحد پر پہنچا دیا گیا۔ لڑاکا جیٹ اور ٹرانسپورٹ طیاروں کو سرحدی علاقے کے ہوائی اڈوں پر جمع کر دیا گیا۔ باقاعدہ فوج کے علاوہ بھارتی بارڈر سیکورٹی فورسز کے دستوں کو بھی مشرقی پاکستان کی سرحد پر تعینات کر دیا گیا۔ بی ایس ایف کے نشانات مٹا کر جیپوں اور دوسری گاڑیوں کو سویلین بنا دیا گیا۔ یہ بات تحقیقات سے ثابت ہو چکی ہے کہ مارچ 1971ء کے آخر سے بی ایس ایف کی ان بٹالینز نے سویلین بھیس میں مشرقی پاکستان کے اندر سرحدی

علاقوں میں کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ پاک فوج نے مشرقی پاکستان کے علاقوں میں سرگرم غنڈوں سے بڑی تعداد میں بھارتی ہتھیار اور اسلحہ برآمد کر کے قبضے میں لے لیا۔

''شیخ مجیب الرحمٰن بھارت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔''

اگرچہ جنرل یحییٰ کی طرف سے 25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کا حکم خالصتاً پاکستان کا ایک ملکی اور اندرونی معاملہ تھا لیکن بھارتی لیڈروں نے اس میں اعلانیہ مداخلت شروع کر دی۔ بھارت کی کئی ریاستی اسمبلیوں میں ''بنگلہ دیش'' کی حمایت میں رسمی قراردادیں پاس کی گئیں۔ حتیٰ کہ مغربی بنگال کے نائب وزیراعلیٰ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ ہم مغربی بنگال میں ''بنگلہ دیش'' کو آزاد ملک کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ مرکزی حکومت تاحال یہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ بھارتی وزیراعظم کی طرف سے پارلیمنٹ میں ایک قرارداد پیش کی گئی جسے دونوں ایوانوں نے 30 مارچ 1971ء کو منظور کیا۔ قرارداد میں مشرقی بنگال کے عوام سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ بھارت کے عوام ان کی جدوجہد کی تہہ دل سے حمایت کرتے ہیں۔ 4 اپریل 1971ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی بھارتی پارلیمنٹ کی منظور کردہ قرارداد کو اتفاق رائے سے پاس کیا' قرارداد پر بحث کے دوران آل انڈیا کانگریس کمیٹی مغربی بنگال یونٹ کے جنرل سیکرٹری کے کے شکلا نے کہا کہ'' شیخ مجیب الرحمٰن بھارت کی جنگ لڑ رہے ہیں''۔

سیاسی رہنماؤں کے علاوہ بھارتی پریس اور دانشوروں نے بھی بحث میں حصہ لیا جس سے پاکستان کو کمزور اور تقسیم کرنے کے یکساں بھارتی مقصد کے متعلق دنیا کو شک وشبہ کی گنجائش نہ رہی۔

نادر موقع

30 مارچ 1971ء کو بمبئی کے روزنامہ ''انڈین ایکسپریس'' نے مشرقی پاکستان میں بھارت کی مسلح مداخلت کی کھلم کھلا وکالت کرتے ہوئے کہا کہ'' یہ یقیناً ایک تاریخی موقعہ ہے اور اب عمل کا وقت آ گیا ہے''۔

7 اپریل 1971ء کو انڈین انسٹی ٹیوٹ فار ڈیفنس سٹڈیز کے ڈائریکٹر سبرامنیم نے

مشرقی پاکستان میں بھارت کی حمایت یافتہ مسلح بغاوت کے حوالے سے کہا کہ'' بھارت کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ پاکستان کا ٹوٹنا ہمارے مفاد میں ہے ہمیں اب جو موقعہ ملا ہے وہ پھر کبھی نہیں آئے گا''۔

بالکل اسی نظریہ کو ایک اور بھارتی دانشور سبرامنیم سوامی نے دہرایا۔ وہ 15 جون 1971ء کو روزنامہ ''مدرلینڈ'' کے آرٹیکل میں کہتے ہیں'' کہ پاکستان کی علاقائی سالمیت سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہ پاکستان کا مسئلہ ہے ہمارا صرف دو سوالوں سے تعلق ہونا چاہئے۔

(1) کیا پاکستان کا ٹوٹنا ہمارا طویل مدتی قومی مفاد ہے؟ اگر ایسا ہے تو

(2) کیا ہم اس بارے میں کچھ کر سکتے ہیں؟

مضمون کا خاتمہ اس رائے کے ساتھ کیا گیا کہ پاکستان کی ٹوٹ پھوٹ نہ صرف ہمارے بیرونی بلکہ اندرونی سلامتی مفاد میں بھی ہے۔ بھارت کو بین الاقوامی طور پر سپر پاور بن کر سامنے آنا چاہئے۔ اس کردار کے لئے ہمیں قومی سطح پر اپنے شہریوں کو یکجا کرنا ہوگا اور اس مقصد کے لئے پاکستان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا پہلی ضروری شرط ہے''۔

اندرا گاندھی نے بنگلہ دیش کی حمایت کر دی

آخر میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے 15 جون 1971ء کو اعلان کیا کہ ''بھارت کسی ایسے سیاسی حل کی ایک طرح کے لئے بھی حمایت نہیں کرے گا جس کا نتیجہ بنگلہ دیش کی موت کی صورت میں نکلتا ہو''۔ بھارت کی سب سے اعلیٰ عہدیدار کی طرف سے اس بیان نے اس کے برے عزائم اور پاکستان کے لئے جارحانہ خیالات پر مہر ثبت کر دی۔

اس مسئلے کے آغاز سے ہی بھارت نے مشرقی پاکستان کے بحران کو بین الاقوامی رنگ دینے کی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ بھارت نے ایک عالمی سفارتی مہم شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ

(a) مشرقی پاکستان کے لوگوں کے سیاسی حقوق کی بحالی اور ان کی نسل کشی کو روکنے کا بہانہ بنا کر کسی قسم کی بین الاقوامی مداخلت کی درخواست کر سکے۔

(b) ایسی فضاء قائم کی جائے کہ اگر مشرقی پاکستان میں مداخلت کی ضرورت پڑے تو اس کا کوئی شدید عالمی ردعمل سامنے نہ آ سکے۔ مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے مہاجرین اور ان

کی دیکھ بھال معاشی بوجھ کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ وہ تمام حدیں پار کر گیا۔ عالمی ایجنسیوں سے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اپیلیں کی گئیں اور عالمی پریس میں مظالم کی مسخ شدہ اور انتہائی مبالغہ آمیز کہانیاں شائع ہوئیں۔ شروع میں تو بھارتی کوششوں کا عالمی برادری کی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ آیا۔ لیکن جب کسی سیاسی حل کے نظر نہ آنے پر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی طویل ہوگئی تو دنیا ہماری مخالفت پر اتر آئی۔ ہم اس معاملہ کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ لیکن اس وقت اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی صورتحال سے پورا فائدہ اٹھایا۔

سفارتی محاذ کے علاوہ بھارت نے مکتی باہنی کے ارکان کو تربیت اور اسلحہ فراہم کر کے مشرقی پاکستان میں کھلی مداخلت شروع کر دی۔ اور ان لوگوں کو مشرقی پاکستان کے اندر داخل کر دیا۔ کمیشن کو فراہم کردہ معلومات کے مطابق بھارت نے مارچ 1971ء سے اکتوبر 1971ء تک غنڈوں کو بڑے پیمانے پر شورش پھیلانے' ذرائع مواصلات کو تباہ کرنے اور مشرقی پاکستان کے امن پسند اور محب وطن عناصر میں خوف و دہشت پیدا کرنے کی تربیت دے کر بھیجا۔

اس کے ساتھ بھارت نے مشرقی پاکستان کے دیہات پر گولہ باری شروع کر دی۔ بینا پول (جیسور) ہلی (دیناج پور) بڑنگ مانی (رنگ پور) کمال پور (میمن سنگھ) انگرام' ذکی گنج اور دملائے (سہلٹ) سلارندی (کومیلا) بیلو نیا (نواکھلی) اور رام گڑھ (چٹاگانگ) سے ایسے واقعات کی مصدقہ اطلاعات ملی ہیں۔ اس گولہ باری سے نہ صرف ہماری عالمی سرحدوں کی کھلی خلاف ورزی کی گئی بلکہ سرحدی علاقوں میں اس حد تک خوف و ہراس پھیل گیا کہ لوگ بڑے پیمانے پر بھارت ہجرت کرنے لگے۔ بھارت کے ان جارحانہ اقدامات سے مہاجرین کی مشرقی پاکستان واپسی میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگئی حالانکہ صدر مملکت نے واپسی کے خواہش مند ایسے تمام شہریوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا تھا جو سیاسی مشکلات کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پس بھارت ایک طرف تو مہاجرین کے مسئلے اور بنگلہ دیش کے بحران کے سیاسی حل کا شور مچائے ہوئے تھا اور دوسری طرف ان دونوں امور میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے ہر ممکن کوشش میں لگا ہوا تھا۔

اپنے اشتعال انگیز اور مخالفانہ اقدامات کے ساتھ ایک ہی وقت میں بھارت نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ اپنی افواج کو جمع کر کے دھماکہ خیز صورتحال پیدا

کر دی۔ بھارتی آرٹلری کی گولہ باری کے علاوہ فضائیہ نے بھی مشرقی پاکستان کی فضائی حدود کے خلاف ورزیاں شروع کر دیں جبکہ بھارتی بحریہ کی مداخلت سے چٹاگانگ' کھلنا اور کراچی کی بندرگاہوں تک ہمارے جہازوں کی رسائی کو حقیقی خطرہ لاحق ہوگیا۔

ان نازک مہینوں میں پاکستان نے صورتحال کو پرسکون کرنے کے کئی اقدامات کئے جن میں بھارت جانے والے شہروں کے لئے عام معافی کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ حکومت نے مہاجرین کی واپسی میں سہولت کی خاطر استقبالیہ مراکز قائم کئے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین کے نمائندے کا خیر مقدم کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی تاکہ یہ ادارہ مہاجرین کے مسئلہ کی نوعیت اور ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگا سکے۔ حکومت نے کئی غیر ملکی پارلیمانی گروپوں اور صحافیوں کو سرحدوں کا دورہ کرنے کی اجازت دی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے حالات دیکھ سکیں۔ دفاعی پہلو پر حکومت نے سرحدوں کے دونوں اطراف سے افواج کی واپسی اور یہاں اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کے تعیناتی کی تجویز پیش کی۔ بھارت کی طرف سے انکار پر پاکستان نے یکطرفہ طور پر اقوام متحدہ کے مبصرین کو سرحد کے اپنی طرف قبول کرنے کی پیش کش کی لیکن نہ تو بھارت نے یہ تجاویز قبول کیں اور نہ ہی عالمی برادری نے انہیں منوانے کے لئے بھارت پر کوئی دباؤ ڈالا۔

جب دونوں ممالک میں کشیدگی بڑھ رہی تھی تو بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کے متعلق حمایت حاصل کرنے کی خاطر اکتوبر نومبر 1971ء میں مغربی ممالک کا دورہ کیا۔ انہوں نے بار بار بھارت پر مشرقی پاکستان کے مہاجرین کے ناقابل برداشت معاشی بوجھ اور اخلاقی سیاسی اور معاشرتی دباؤ کا تذکرہ کیا۔ دورے سے قبل انہوں نے اپنی کابینہ کے تقریباً تمام وزراء اور دوسرے اعلیٰ حکام کو پاکستان کے خلاف سیاسی اور معاشی امداد لینے کے لئے دوسرے کئی ممالک روانہ کر دیا۔

25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے آغاز سے ہی اہم بھارتی رہنما مثلاً جے پی نرائن' وزیر دفاع جگجیون رام' وزیر سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ' وزیر خزانہ وائی بی چوان اور خارجہ پالیسی ساز کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر ڈی پی دھر نے بنگلہ دیش کی حمایت میں مسلسل بیانات دینے شروع کر دیئے اور اس بات پر اصرار کیا کہ بھارت کے لئے قابل قبول حل وہی ہوگا جس کا شیخ مجیب نے مطالبہ کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو جنگ کی دھمکیاں دینی شروع

کر دیں۔ سب سے پہلے بھارتی وزیراعظم نے 18 مئی 1971ء میں یہ اعلان کر کے اس بات کا اشارہ دیا کہ "بھارت پاکستان کے ساتھ لڑائی کے لئے مکمل طور پر تیار ہے"۔

13 جون کو بھارتی وزیر صنعت نے ہیگ میں کہا کہ "میرے ملک میں عوامی رائے یہ ہے کہ پاکستان کے ساتھ جنگ مہاجرین کو امداد دینے سے زیادہ سستی پڑے گی"۔

15 جون کو وزیر خارجہ سورن سنگھ نے حکمران کانگریس پارٹی کے اجلاس کو بتایا کہ "اگر بنگلہ دیش کے بحران کا کوئی اطمینان بخش حل نہ نکلا تو بھارت کو اپنے طور پر کارروائی کرنا ہوگی"۔

9 اگست 1971ء کو بھارت روس معاہدے پر دستخط کے بعد سورن سنگھ نے لوک سبھا میں بیان دیا جس میں انہوں نے کہا "بھارت روس معاہدہ ہمیں بنگلہ دیش میں یکطرفہ ایکشن لینے سے نہیں روکتا"۔

اس بارے میں ایک اہم بیان بھارتی وزیر محنت و بحالیات آر کے کھاد یکر کا ہے جب انہوں نے 22 اگست 1971ء کو اعلان کیا "بھارت روس معاہدے سے بنگلہ دیش میں آزادی کی قوتوں کو تقویت ملی ہے"۔

بھارتی حکومت کئی طریقوں سے صورتحال کو خراب تر بناتی رہی۔ جب یہ پڑھنے میں آیا کہ کلکتہ میں پاکستان ہائی کمیشن کے کئی بنگالی اہلکار بنگلہ دیش کے ساتھ مل گئے ہیں تو اس وقت بھارتی حکومت نے صرف پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کو ان اہلکاروں سے ملنے نہ دیا بلکہ ڈپٹی ہائی کمشنر کی نقل وحرکت پر شرمناک پابندی عائد کر کے ان کا بطور سفارت کار جینا دوبھر کر دیا۔ نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر کو بھی مروجہ سفارتی مراعات اور آداب سے محروم کیا گیا تقریباً اس وقت بھارت نے علیحدگی پسند عوامی لیگ کے راہنماؤں کو کلکتہ میں نام نہاد بنگلہ دیش حکومت قائم کرنے پر اکسایا اور بعجلت 6 دسمبر کو یہ نام نہاد حکومت سفارتی طور پر تسلیم کر لی۔

☆☆☆☆☆☆

کمیشن کی رپورٹ کا ایک پیراگراف شائع نہیں کیا گیا اس کے بعد رپورٹ میں ہے کہ

ہم نے جو کچھ لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکتوبر اور نومبر 1971ء تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ اپنی روایتی دشمنی کے باعث کھلی جنگ کی طرف جا رہا ہے۔ بھارتی راہنماؤں کے بیانات' سفارتی سرگرمیاں روس کے ساتھ معاہدے' پاکستان کے دونوں بازوؤں پر فوج کے اجتماع' صورتحال کو معمول پر لانے کے لئے تمام معقول تجاویز کو رد کرنے اور

مشرقی پاکستان میں ریاست مخالف قوتوں کو مسلسل تربیت اور ہتھیار دینے کے اقدامات سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ ہمارا دفتر خارجہ اور فوج کی خفیہ ایجنسیاں بھی اسی نتیجہ پر پہنچی تھیں اور اس وقت کے صدر آغا محمد یحیٰی خان اس بات سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ ہمیں جنرل یحیٰی کے کمیشن کے سامنے اس بیان سے انتہائی حیرت ہوئی جب انہوں نے کہا کہ "میرا خیال تھا کہ بھارت کھلی جنگ شروع نہیں کرے گا"۔ اس مہم جوئی سے نمٹنے کے لئے جنرل یحیٰی کے ذہن میں غلط اندازے تھے۔ وہ (بھارت کی اس) مہم جوئی کے مقابلے کے لئے کس طرح قوم اور مسلح افواج کو تیار کرنا چاہتے تھے اسے سمجھنا آسان نہیں۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں اگر جنرل یحیٰی ایسی کسی غلط فہمی میں مبتلا تھے تو وہ بھارت عزائم اور تدابیر سمجھنے میں یکسر ناکام ثابت ہوئے۔

☆☆☆☆☆

کمیشن کی رپورٹ کے صفحہ 145 سے لے کر 212 تک شائع نہیں کئے گئے۔ یہ صیغہ راز میں ہیں۔

☆☆☆☆☆

غیرملکی اخبارات میں پروپیگنڈا

مشرقی پاکستان میں سیاسی بحران اور نتیجہ کے طور پر فوجی ایکشن کو دنیا بھر میں توجہ حاصل ہوئی۔فوجی کارروائی کے وقت ڈھاکہ میں موجود بڑی تعداد میں غیرملکی صحافیوں کو مارشل لا حکام نے بلاتمیز نکال باہر کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام غیرملکی میڈیا سرحد پار سے بھارتی معلومات پرانحصار کرنے لگا۔عالمی پریس بالخصوص امریکی اور برطانوی اخبارات نے پاک فوج کے ہاتھوں خفیہ قتل عام زیادتیوں'لوٹ مار' آتشزنی کی ہولناک کہانیاں نمایاں طور پر شائع کیں۔مشرقی پاکستان سے مہاجرین کے بڑے پیانے پر بھارت انخلاء اور بھارتی پروپیگنڈہ نے عالمی برادری کی نظروں میں پاکستان کی ساکھ بگاڑ دی۔یہاں عالمی پریس کی رپورٹوں کو تفصیلاً بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے چند اقتباسات ہی کافی ہیں۔عالمی اخبارات کی تنقید کالب لباب یہ ہے کہ پاکستانی فوج اور سیاستدانوں کے دباؤ کے زیراثر صدر یحییٰ نے مشرقی پاکستان کی آبادی کو مذاکرات کے ذریعے جھوٹے احساس تحفظ میں رکھ کر ان پر اچانک حملہ کیا انہوں نے صوبائی خودمختاری مانگنے والی اکثریتی آبادی کو دبانے اور نیست ونابود کرنے کے لئے جنگ شروع کردی۔یہ سب کچھ انہوں نے طاقتور اقلیت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر کیا۔

برطانوی اخبار"روزنامہ سکیچ"29 مارچ 1971ء کے شمارے میں لکھا ہے کہ

''جب گنگا'ڈیلٹا کے لوگ سیلاب اور قحط سے تباہ حال تھے تو یحییٰ خان اس وقت امدادی کارروائیوں کے لئے اپنے طیارے اور فوجی بھیجنے سے ہچکچاتے رہے'جب انہی لوگوں نے اپنے راہنما شیخ مجیب کی حمایت کرنے کی جرأت کی تو اب یحییٰ خان کے ٹینک اور دستے حرکت میں آ گئے ہیں''۔

ٹائمز آف لندن نے 29 مارچ 71ء کے شمارے میں کہا کہ:

''پاکستانی فوجی حکومت کی شیخ مجیب اور ان کی عوامی لیگ کو کچلنے اور مشرقی پاکستان میں کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش تباہ کن ہوسکتی ہے۔اس سے مشرقی پاکستان میں شدت پسندوں کے ان دلائل کی تائید ہوگئی کہ مغربی حصے کے غلبے پرمبنی مرکزی حکومت کے ساتھ چلنا ناممکن ہوگیا ہے اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ کسی بھی طرح آزاد بنگلہ دیش حاصل کرلیا جائے''۔

برطانیہ کے''روزنامہ ٹیلیگراف'' نے 29 مارچ کونئی دہلی سے اپنے نامہ نگار کی بھیجی ہوئی یہ رپورٹ شائع کی کہ:

''بیرونی دنیا سے کٹے صوبے سے حاصل تمام اطلاعات کے مطابق مشرقی پاکستان میں بڑے پیانے پر ہلاکتیں جاری ہیں ڈھاکہ میں موجود سفارتی مشنوں سے ریڈیو پررابطہ رکھنے والے ذرائع کے مطابق 70 ہزار پاکستانی فوجی بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک کو بے رحمی سے دبانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔اندازہ ہے کہ 10 ہزار سے ایک لاکھ بنگالیوں کوقتل کیا گیا۔مرنے والوں کے تعداد جتنی بھی ہولیکن صوبے میں بے رحمانہ طریقہ سے اپنی مرضی مسلط کرنے کے فوجی عزائم میں کوئی شک شبہ نہیں رہا''۔

نیویارک ٹائمز یکم اپریل 1971ء کولکھتا ہے:

''امریکی انتظامیہ الزام لگارہی ہے کہ اسے مشرقی پاکستان میں بھاری خون ریزی کی رپورٹیں مل رہی ہیں جنہیں وہ ظاہر نہیں کرتی پاکستان کے باہر سے آنے والی محکمہ دفاع کے نام ایک کیبل گرام میں تو لفظ''جِن چِن کرنسل کشی''استعمال کیا گیا ہے''۔

حکومت نے نقصان پہنچانے والی ان کہانیوں کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کیا۔یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس شعبہ میں ہمارے غیرمؤثر ہونے کی وجہ نہ صرف ہماری اطلاعاتی ایجنسیوں کی نااہلی یا کوتاہی ہے بلکہ بحران کی وسعت اور کئی مہینوں کی طوالت بھی ایک وجہ ہے۔یہودی مفادات کے زیرتسلط عالمی اخبارات میں پاکستان اور مسلمان مخالف بغض' جبکہ جمہوری معاشروں میں فوجی حکومتوں کے خلاف عالمگیر نفرت اور بدگمانی بھی وجوہات میں شامل ہیں یہ بات اہم ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات وواقعات کے بارے میں حکومتی وائٹ پیپر بھی فوجی کارروائی شروع ہونے کے 5 ماہ بعد اگست 71ء میں جاری ہوا۔اس وقت تک عالمی پریس میں

مسلسل شائع ہونے والی رپورٹیں اس حد تک جڑیں پکڑ چکی تھیں کہ کوئی شخص جنرل یحییٰ کے وائٹ پیپر والے مؤقف سے متفق نہیں تھا۔

جارحیت کی تیاریاں

برادر اسلامی ممالک سمیت کچھ ملکوں میں ہمارے حق میں بات کی گئی۔ انہوں نے ملکی سلامتی کے لئے جنرل یحییٰ کے فوجی اقدام کو حق جانب قرار دیا اور عوامی لیگ کے علیحدگی پسندانہ مؤقف کی مذمت کی۔ لیکن ان کلمات کے باوجود مشرقی پاکستان کے بحران کو خصوصاً انسانی ہمدردی کی بناء پر بین الاقوامی موضوع بننے سے روکا نہ جا سکا۔

صدر یحییٰ نے دیر سے نقصان کی تلافی کے لئے غیر ملکی نمائندوں کو اور دوسرے ممالک کے پارلیمانی وفود کو مشرقی پاکستان کے دورہ کی اجازت دی۔ وزارت خارجہ نے بھی بیرونی ممالک میں سفارت خانوں کو پاکستان نقطۂ نظر اجاگر کرنے کے لئے پمفلٹ اور سرکلر ارسال کئے۔ لیکن اس وقت تک بھارتی حکومت مشرقی پاکستان کے خلاف نپی تلی جارحیت کی تیاری کر چکی تھی۔

بھارت کی جارحیت کے ابتدائی مراحل پر دنیا میں پاکستان کے لئے کم ہی ہمدردی پائی جاتی تھی اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں محب وطن بنگالیوں اور بہاریوں کو جو مصائب اٹھانے پڑے ان کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

عالمی پریس کے سانحہ مشرقی پاکستان کے متعلق روش سے ایک چیز کھل کر سامنے آتی ہے کہ کوئی بھی حکومت عالمی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے اس طرح کے حالات پر قابو نہیں پا سکتی اور نہ اپنی سرحدوں کے اندر ہونے والے اہم واقعہ کے بارے میں مستند خبروں اور اطلاعات کا بلیک آؤٹ کر سکتی ہے۔ مہذب قومیں اب تنہائی میں وجود قائم نہیں رکھ سکتیں اس لئے حکومت کے لئے لازمی ہے کہ وہ غیر ملکی تشہیر کا شعبہ مضبوط بنائے اور اس کے ساتھ حکومت میں صحیح تناظر میں درست حقائق بیان کرنے کی جرأت ہونی چاہئے۔

سوویت یونین کی پاکستان دشمنی

مشرقی پاکستان میں 21 نومبر 1971ء کو بھارتی جارحیت کے بعد پیدا ہونے والے بحران کے حوالے سے قیام امن کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے کردار کا جائزہ لینے کے لئے ہم نے اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر آغا شاہی سے درخواست کی کہ وہ اقوام متحدہ میں ہونے والے مختلف واقعات اور کوششوں کا مفصل اور جامع احوال بیان کریں۔ جس پر آغا شاہی نے ایک انتہائی دلچسپ بیان ارسال کیا جو مشرقی پاکستان کے بحران کے حوالے سے امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور افروایشیائی ملکوں کے کردار کو واضح کرتا ہے۔ یہ بیان ویٹو پاور رکھنے والے ممالک سلامتی کونسل کے مستقبل ممبران کی ادارے میں غیر معمولی اہمیت اور جنگ میں مصروف دو رکن ممالک کے درمیان قیام امن کے لئے جنرل اسمبلی کی اہمیت بھی واضح کرتا ہے۔ حالانکہ جنرل اسمبلی میں 104 ممالک نے اس مسئلے پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی لیکن اس کے باوجود سوویت یونین نے سلامتی کونسل کو بار بار ویٹو کر کے پاکستان کو ٹوٹنے سے بچانے کی تمام بروقت کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

اس کے بعد رپورٹ کا ایک پیراگراف شائع نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

مارچ 1971ء میں جب مشرقی پاکستان کا بحران شروع ہوا تو پاکستان نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے اس لئے اقوام متحدہ یا اس کا کوئی ذیلی ادارہ کسی قسم کی سیاسی حتیٰ کہ انسانی بنیادوں پر بھی مداخلت کا حق نہیں رکھتا۔ بعد ازاں اس میں ترمیم کر کے انسانی بنیادوں پر امداد کے حق کو تسلیم کر لیا گیا۔

پاکستان کو اپنے اس مؤقف میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے مارچ کے آخر سے جولائی تک اقوام متحدہ کی سیاسی مداخلت کو روکے رکھا۔ بھارت نے پہلے سلامتی کونسل کو اس معاملے میں لانے کی کوشش کی جو ناکام رہی جس کے بعد اس نے اقوام متحدہ کی سماجی کمیٹی اور اقتصادی کمیٹی میں اس معاملے کو بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے طور پر اٹھایا۔ مئی میں چند رکن ممالک کی حمایت کے باوجود بھارت پاکستان کے خلاف کسی مشترکہ

املا یے یا قرارداد منظور کرانے میں ناکام رہا۔

لیکن بحران کی سنگینی خاص طور پر بڑے پیمانے پر ہلاکتوں اور مہاجرین کے سرحد پار کرنے کی رپورٹوں کے ناگزیر اثرات مرتب ہوئے اور بین الاقوامی برادری کی توجہ اس مسئلے پر مرکوز ہوگئی آہستہ آہستہ "اندرونی مسئلہ" بتانے کا پاکستانی مؤقف کمزور پڑتا گیا اور دنیا کی رائے ہمارے خلاف ہوتی چلی گئی۔ 23 جون کو اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین پرنس صدر الدین آغا خان نے مشرقی پاکستان کے مسئلے کے سیاسی حل کی اپیل کر دی جو اس وقت اقوام متحدہ میں پائی جانے والی عام سوچ کی عکاس تھی۔

20 جولائی کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے جو اس سے پہلے انسانی بنیادوں پر مشرقی پاکستان کے بحران پر تشویش ظاہر کر چکے تھے سیکورٹی کونسل کے صدر کو تمام ارکان میں تقسیم کرنے کے لئے ایک خفیہ یادداشت بھیجی جس میں ارکان کی توجہ معاملے کی سنگینی کی طرف مبذول کرائی گئی اور اسے بین الاقوامی امن کے لئے ایک سنگین خطرہ قرار دیا گیا۔

اس موقع پر حکومت پاکستان کچھ عرصہ اقوام متحدہ کی مداخلت کی مزاحمت کرتی رہی لیکن کچھ دن بعد پاکستان نے کہہ دیا کہ سیکورٹی کونسل کا اجلاس تصادم کو روکنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے؛ تاہم اس وقت تک سلامتی کونسل کا اجلاس بلانے کے لئے باقاعدہ درخواست کا فیصلہ نہیں کیا گیا تھا اور کونسل کے ارکان اپنے طور پر اجلاس بلانے سے گریزاں تھے۔ ان کے خیال میں پاکستان اور بھارت اس معاملے پر اس قدر متضاد خیالات رکھتے تھے کہ کوئی مثبت حل نکلنے کی امید بہت کم تھی۔

اس صورتحال میں حکومت نے تجویز پیش کی کہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے سیکورٹی کونسل کی ایک کمیٹی کو بھارت اور پاکستان کا دورہ کرنا چاہیے اس تجویز کو سیکورٹی کونسل کے پاکستان کے کچھ ہمدرد غیر مستقل ارکان کی حمایت حاصل تھی؛ تاہم مستقل ارکان نے اسے شک کی نظر سے دیکھا جبکہ سوویت یونین نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔

20 اکتوبر کو اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے بھارت اور پاکستان دونوں کو معاملہ سلجھانے میں مدد کی پیشکش کی جس کے جواب میں 22 اکتوبر کو صدر نے اس کا خیر مقدم کیا اور 22 اکتوبر کو اپنے جواب میں تجویز پیش کی کہ دونوں ملک باہمی رضامندی سے فوجیں ایک خاص فاصلے تک پیچھے ہٹالیں۔ بھارت نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد سے لے کر 3 دسمبر کو مشرقی محاذ پر جنگ شروع ہونے تک پاکستان سیکریٹری جنرل سے مداخلت کی اپیلیں کرتا رہا لیکن سیکریٹری جنرل سیکورٹی کونسل کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ کے حوالے سے اقوام متحدہ میں ہونے والی کارروائی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ 21 نومبر کو مشرقی پاکستان میں بھارتی جارحیت سے لے کر 3 دسمبر میں مکمل جنگ کے آغاز تک کے عرصہ پر مشتمل ہے؛ دوسرا حصہ 3 دسمبر سے 10 دسمبر پر محیط ہے جب اقوام متحدہ میں موصول ہونے والے جنرل فرمان علی کے پیغام کو ہتھیار ڈالنے پر آمادگی کا اظہار سمجھا گیا۔ تیسرا حصہ 10 دسمبر سے 17 دسمبر کو جنگ بندی تک ہے جبکہ آخری حصہ فائر بندی سے لے کر 21 دسمبر تک کا ہے جب سیکورٹی کونسل نے قرارداد نمبر 307 (1971ء) منظور کی۔

پہلا حصہ:

12- اس حصے میں حکومت کی طرف سے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ کمیشن کے خیال میں ایسا اس لئے نہیں کیا گیا کہ حکومت کو اس بات کا ڈر تھا کہ سیکورٹی کونسل کی طرف سے کوئی ایسا حل نہ پیش کر دیا جائے جو حکومت کے لئے ناقابل قبول ہو۔

دوسرا حصہ:

بھارت سے فوجیں ہٹانے کا مطالبہ

مغربی پاکستان میں جنگ کے آغاز کے بعد سیکورٹی کونسل کا اجلاس امریکہ کی درخواست پر منعقد ہوا۔ پاکستان نے کونسل میں اپنا مؤقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارت نے مشرقی حصے میں مسلح مداخلت کی اور بعد ازاں کھلی جارحیت کا ارتکاب کیا۔ پاکستان نے مطالبہ کیا کہ اس جارحیت پر بھارت کی مذمت کی جائے۔ فائر بندی عمل میں لاتے ہوئے فوجیں واپس بلائی جائیں دوسری طرف بھارت کا مؤقف مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا۔

(ا) پاکستان مشرقی حصے میں لوگوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔

(ب) مہاجرین کسی ایسے سیاسی حل کے بغیر واپس آنے پر آمادہ نہیں جو مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کے لئے قابل قبول ہو۔

(ج) فوری طور پر ایسا حل تلاش کرنا ناگزیر ہے۔

(د) بھارت نے پاکستان پر مغربی محاذ پر جنگ چھیڑنے کا الزام بھی عائد کیا۔
(ر) سیاسی تصفیے کے بغیر مشرقی محاذ پر کشیدگی کم نہیں ہو سکتی۔

اس موقع پر سیکورٹی کونسل کے ارکان تین مختلف گروپوں میں بٹ گئے۔ پہلا گروپ جو اکثریت میں تھا امریکہ کی مجوزہ قرارداد (S/10416) کے حق میں تھا جس میں فوری جنگ بندی اور فوجوں کی واپسی پر زور دیا گیا تھا۔ یہ قرارداد پاکستان کے حق میں تھی۔ اس موقع پر چین نے بھارت کو پاکستان پر جارحیت کا مرتکب قرار دیا۔ کونسل کے ارکان کی اکثریت نے فوری طور پر جنگ بند کرنے اور کونسل کی طرف سے ان مضمرات پر خصوصی توجہ کی ضرورت پر زور دیا جو اس صورتحال کا باعث بنے۔ چین، صومالیہ اور ارجنٹائین نے اس بات پر بھی زور دیا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کی سرزمین سے فوجیں واپس بلا لیں۔

دوسرا مؤقف سوویت یونین کا تھا جس نے اپنی الگ مجوزہ قرارداد کا مسودہ پیش کیا۔ قرارداد (S/10417) میں کہا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی تصفیہ عمل میں لایا جائے جس کے نتیجے میں کشیدگی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ حکومت پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں موجود افواج کو تشدد سے روکے یہ یکطرفہ مؤقف پاکستان کے بالکل خلاف اور بھارت کے حق میں تھا۔

تیسرا مؤقف برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں کا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ صرف اس قرارداد کی حمایت کریں گے جسے سوویت یونین ویٹو نہ کرے۔ دراصل اس مؤقف نے بھارت کی پوزیشن مستحکم بنائی۔

امریکہ کی قرارداد کے حق میں 11 ووٹ آئے لیکن سوویت یونین نے اسے ویٹو کر دیا۔ روس کی قرارداد کے حق میں صرف 2 اور مخالفت میں ایک ووٹ پڑا جبکہ 12 ارکان نے اس پر رائے کا اظہار ہی نہیں کیا۔

گو قرارداد نے کونسل کے زیادہ تر ارکان کو مایوس کیا ان کے خیال میں ایک متوازن اور مؤثر قرارداد میں تین باتوں کا ہونا ضروری تھا۔ I۔ فائر بندی، II۔ فوجوں کی واپسی اور III۔ سیاسی تصفیہ کونسل کے 8 غیر مستقل ارکان نے مل کر ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا۔ جس میں قرارداد کا اصل متن اوپر بیان کئے گئے پہلے دونوں نکات پر مشتمل تھا جبکہ تیسرا نکتہ یعنی سیاسی تصفیہ کو قرارداد کا افتتاحیہ بنایا گیا تھا۔ اس مجوزہ قرارداد نے بھی 11 ووٹ حاصل کئے دو مخالفت

میں آئے جبکہ برطانیہ اور فرانس نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔

دو دفعہ ویٹو کا حق استعمال کرنے کے بعد روس نے اپنے یکطرفہ مؤقف میں تبدیلی لاتے ہوئے اسے قدرے متوازن بنایا اور ایک نئی قرارداد (S/10428) پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی دنیا کی امن وسلامتی کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ قرارداد میں دونوں پارٹیوں پر زور دیا گیا کہ وہ فوری جنگ بندی عمل میں لائیں جبکہ پاکستان سے کہا گیا کہ وہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق سیاسی تصفیہ کرے جس کا اظہار انہوں نے 1970ء کے عام انتخابات میں کیا ہے: تاہم سوویت یونین نے یہ قرارداد رائے شماری کے لئے پیش نہیں کی کیونکہ اس کے منظور ہو جانے کی کوئی امید نہ تھی۔ حکومت پاکستان کی ہدایت کے مطابق ہم نے روسی تجاویز کی مخالفت کی کیونکہ ان تجاویز کو ماننا اسی طرح تھا کہ بھارتی جارحیت کے زیر اثر مشرقی پاکستان کو فوری طور پر پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔

اس مرحلے پر کونسل کے غیر مستقل ارکان روس کے مسلسل ویٹو کرنے اور لمبی تقریروں کے ذریعے تاخیری حربے استعمال کرنے کی روش سے عاجز آچکے تھے لہٰذا وہ معاملے کو جنرل اسمبلی میں پیش کرنے پر متفق ہو گئے۔ اس فیصلے کے حق میں 11 ووٹ آئے جبکہ برطانیہ فرانس پولینڈ اور روس نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔

جنرل اسمبلی نے 7 دسمبر کو قرارداد (xxvi)2793 منظور کر لی جس کے حق میں 104 اور مخالفت میں 11 ووٹ آئے جبکہ 10 ملکوں نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ اس قرارداد کا مسودہ دراصل سیکورٹی کونسل کے غیر مستقل ارکان کی طرف سے تجویز کی جانے والی قرارداد (S/10423) جیسا ہی تھا جسے سوویت یونین نے 5 دسمبر کو ویٹو کر دیا تھا۔

دوسرے مرحلے میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بھارت کی مسلح جارحیت اور مداخلت کی بنیاد پر پاکستانی مؤقف کو جنرل اسمبلی میں غیر معمولی حمایت حاصل رہی۔ سیکورٹی کونسل کی کارروائی میں بھی بھارت کو کوئی سیاسی سہولت نہیں دی گئی۔ حالانکہ سوویت یونین نے ویٹو کر کے فوری جنگ بندی اور فوجوں کی واپسی کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ یہ سب کچھ اس لئے ممکن تھا کیونکہ اس وقت تک پاکستان عزم و حوصلے کے ساتھ بھارتی جارحیت کا مقابلہ کر رہا تھا۔

ہماری یہ پوزیشن جو سیاسی سودے بازی کے لئے انتہائی ضروری تھی 10 دسمبر کو اس وقت اچانک ختم ہوگئی جب ڈھاکہ میں جنرل فرمان علی نے سیکریٹری جنرل کے نمائندے پال میر ہنری کو ایک تحریری پیغام دیا۔ جس کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر مالک نے اپنی تجاویز بھیج دیں اور سیکریٹری خارجہ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ گورنر حکومت کی ہدایت کے بغیر بھی ایسا کرنے کا "اختیار" رکھتے تھے۔ سیکریٹری جنرل کو یہ پیغام نہیں پہنچنے دیا گیا جبکہ سیکریٹری جنرل سے کہہ دیا گیا کہ جنرل فرمان کی تحریر کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان دو تجاویز کے منظر عام پر آنے سے خواہ یہ متنازعہ تھیں یہ بات صاف ہوگئی کہ پاکستان زیادہ دیر تک جنگ میں نہیں ٹک سکے گا۔ جنرل فرمان کے پیغام کا مدعا سیکورٹی کونسل کے مستقل ارکان کے علم میں آ چکا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو جیسے ہی 10 دسمبر کو نیو یارک پہنچے فرمان علی کے پیغام کی خبر ان تک بھی پہنچی۔ انتہائی صدمے کی حالت میں انہوں نے فوری طور پر سابق صدر کو ایک تار ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ فرمان علی کی پیشکش پورے "پاکستان کے شرمناک خاتمے کے مترادف ہے" اور وہ (ذوالفقار علی بھٹو) ہتھیار ڈالنے کے ذلت آمیز کام میں شریک نہیں ہوں گے۔ بھٹو نے صدر یحییٰ پر زور دیا کہ وہ ان باتوں پر سختی سے قائم رہیں جن کا فیصلہ ان کے نیو یارک آنے سے پہلے بحث مباحثے کے بعد کر لیا گیا تھا۔ بعد کے پیغامات میں انہوں نے یہ تجویز کیا کہ امریکہ اور چین کو اس بات پر متفق کیا جائے کہ وہ معاملے کو کچھ دیر کے لئے ٹال دیں اور اگر ممکن ہو تو کم از کم ایک ہفتے کے لئے میدان جنگ میں پاکستان کی پوزیشن مستحکم بنا دیں۔

21 دسمبر کو بھٹو نے امریکہ اور چین کے وفود سے طویل صلاح مشورے کئے۔ اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ سیکورٹی کونسل کا اجلاس فوری طور پر بلایا جائے اور ایک قرارداد فوری طور پر منظور کر لی جائے جس کا متن کم و بیش ویسا ہی ہو جیسا جنرل اسمبلی میں منظور ہونے والی قرارداد کا تھا۔ سوویت یونین کے ویٹو کر دینے کے بعد عام فائر بندی پر مبنی ایک قرارداد پیش کی جائے۔

بھٹو کے ہنگامی پیغامات کے جواب میں صدر یحییٰ نے یہ پیغام بھیجا کہ فرمان علی کے پیغام کو وہیں روک لیا گیا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں اور صدر کی پیشکش صرف جنگ بندی تک محدود ہے۔ صدر نے یہ بھی کہا کہ فوج کو مزید ایک ہفتہ تک مصروف جنگ رکھنا پاکستان کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوگا۔ ان کے ٹیلی گراموں میں بلا تاخیر فوری جنگ بندی کے ناگزیر ہونے پر

زور دیا گیا تھا۔ ایک اور تار میں صدر نے امریکی اور چینی وفود سے بات چیت کے نکات پر اتفاق ظاہر کیا۔

12 دسمبر کو جبکہ صورتحال تیزی سے مایوس کن ہوتی چلی جا رہی تھی بھٹو نے صدر یحییٰ پر زور دیا کہ وہ آخری امید کے طور پر چین جا کر انہیں پاکستان کو بچانے کے لئے مداخلت پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔

سیکورٹی کونسل کا اجلاس 12 دسمبر کو دوبارہ ہوا۔ بھارت کے وزیر خارجہ مطالبہ کر رہے تھے کہ بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) کے منتخب نمائندوں کو بھی اجلاس میں آنے کی دعوت دی جائے کیونکہ نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ مغربی حصے میں بھی جنگ بندی کی کسی تجویز پر موثر عملدرآمد کے لئے ان کی موجودگی لازم ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے معاملے کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے لئے اس کی اہمیت کو واضح کیا انہوں نے کہا کہ "ریاستوں کو ان کی غلطیوں کی سزا نہیں دی جاتی۔" انہوں نے سوویت نمائندے کو ان کے ملک کا وہ وعدہ یاد دلایا جس میں پاکستان کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا اعادہ کیا گیا تھا جو بھارت اور روس معاہدے کو بنیاد بنا کر توڑ دیا گیا۔

سیکورٹی کونسل کی اب تک کی کارروائی میں یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ سوویت یونین یہ تہیہ کئے ہوئے ہے کہ وہ کسی ایسی قرارداد کو منظور نہیں ہونے دے گا جس میں جنگ بندی کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں کسی سیاسی تصفیے کا پابند نہ بنایا گیا ہو۔ اس حوالے سے سوویت نمائندے کی طرف سے فرمان علی کے فارمولے کے بارے میں پسندیدگی کے اظہار پر مبنی ریمارکس قابل توجہ ہیں۔ ان حالات میں حکومت کی یہ امید غیر حقیقت پسندانہ تھی کہ وہ عام جنگ بندی کا مقصد حاصل کر لے گی۔ امریکہ کی مجوزہ قرارداد (S/ 10446/Rev.1) جس کا متن جنرل اسمبلی کی قرارداد (2793(xxxvi) جیسا ہی تھا ایک دفعہ پھر سوویت یونین نے ویٹو کر دی۔

فرانس، برطانیہ اور امریکہ سقوط ڈھاکہ کے منتظر تھے

سوویت یونین کی طرف سے تیسری مرتبہ ویٹو کئے جانے کے بعد فرانس اور برطانیہ کے نمائندوں نے امریکہ کو خفیہ طور پر اس بات پر زبردست تنقید کا نشانہ بنایا کہ وہ ایک ایسی قرارداد منظور کروانے کی کوشش میں مصروف ہے جسے سوویت یونین کا ویٹو کرنا یقینی ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک تین نکاتی فارمولا پیش کریں گے جو تمام فریقوں کے لئے قابل قبول ہوگا۔ یہ فارمولا ان تین نکات پر مشتمل تھا۔

(1) جارحانہ کارروائیوں کا فوری خاتمہ۔

(2) فوجوں میں لڑائی کا خاتمہ۔

(3) اور انصاف پر مبنی سیاسی تصفیہ۔

یہ بات صاف ظاہر تھی کہ یہ تینوں ممالک سقوط ڈھاکہ کے منتظر تھے تاکہ وہ پاکستان پر سیاسی تصفیہ مسلط کر کے بھارت اور سوویت یونین کے مقاصد کو پورا کر دیں۔ بھارت کی جانب سے مشرقی پاکستان میں موجود افواج کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کے حوالے سے آنے والی خبروں میں برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں نے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جس میں کہا گیا تھا۔

(a) مغربی پاکستان میں فوری جنگ بندی عمل میں لائی جائے اس میں کشمیر کی کنٹرول لائن بھی شامل ہے جہاں افواج 1965ء والی پوزیشن میں واپس آ جائیں گی۔

(b) مشرقی پاکستان میں پاک بھارت فوجی کمانڈروں کے درمیان جنگ بندی کے لئے فوری بات چیت۔

(c) ان تمام اختلافات کے تصفیہ کے لئے جامع مذاکرات جن کے باعث یہ بحران پیدا ہوا اسی نکتے میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ سیاسی تصفیہ مشرقی پاکستان کی خواہشات کے مطابق ہوگا۔

(d) یہ قرارداد دونوں ملکوں کو اس بات کا پابند بناتی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں سیکریٹری جنرل کی طرف سے کئے جانے والے اقدامات کو قبول کریں گے۔

سفارتی کوششیں بے کار ہو گئیں

اس دوران جب ہم اس قرارداد کے مسودے کو حتمی شکل دینے کی کوششوں میں مصروف تھے مشرقی پاکستان میں پاک فوج کے کمانڈر جنرل نیازی کی جنگ بندی کے لئے بھارتی چیف آف اسٹاف سے رابطے کی خبر اقوام متحدہ پہنچی۔ مشرقی پاکستان میں ہماری مکمل عسکری ناکامی کا اثر بحث مباحثے میں مصروف سیکورٹی کونسل کے ارکان پر بھی پڑا۔

اس موقع پر امریکی وفد نے ہمیں بتایا کہ وہ سوویت یونین کو سادہ جنگ بندی پر آمادہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ ہم سیکورٹی کونسل سے کوئی ایسی قرارداد منظور نہیں کروا سکتے جس میں:

(a) پاکستان کے علاقائی استحکام کی ضمانت موجود ہو۔

(b) اور اسے بھارت بھی تسلیم کر لے۔

سلامتی کونسل میں بھٹو کی تقریر

بے نتیجہ طویل بحث مباحثے کو ملک کے عزت و وقار کے منافی جانتے ہوئے بھٹو اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈھاکہ میں ہماری قومی ذلت و رسوائی اقوام متحدہ میں بھی نہیں دہرائی جانی چاہئے۔ ہم نے سیکورٹی کونسل کے ہنگامی اجلاس کی درخواست کی جس سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا:

''میں جارحیت کو برحق قرار دینے اور اپنے ملک کے ایک حصے کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کرنے کی کارروائی میں حصہ نہیں لوں گا۔''

بھٹو اپنی تقریر مکمل کرنے کے بعد سیکورٹی کونسل چیمبر سے باہر نکل گئے۔

بھٹو کے اس دلیرانہ مظاہرے کو دشمن ممالک کے پریس نے بھی نہایت اچھے الفاظ میں سراہا۔ تمام چھوٹے ممالک کے وفود نے بھی اس کی بے انتہا تعریف کی۔ کچھ عرب ممالک کے نمائندوں نے خفیہ طور پر اس بات کا بھی اظہار کیا کہ بھٹو نے وہ کر دکھایا ہے جو 1967ء میں بالکل ایسی ہی فوجی شکست کے وقت عرب نہ کر سکے تھے۔

سیاسی تصفیہ پر اصرار

بھٹو کے واک آؤٹ کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے گیے جب سیکورٹی کونسل کے اگلے اجلاس میں ایک رکن نے بھٹو کے اس عمل کو ان الفاظ میں حق بجانب قرار دیا کہ ''وہ سیکورٹی کونسل کے مکمل جمود پر احتجاج کرنے میں حق بجانب تھے''۔ اور یہ تجویز کیا کہ معاملہ دوبارہ جنرل اسمبلی میں لے جایا جائے۔ تیزی سے خراب ہوتی ہوئی صورتحال کے تناظر میں بہت سی قراردادوں کے مسودے تیار کئے گئے۔ پہلی قرارداد پولینڈ نے دوسری برطانیہ اور فرانس نے تیسری شام نے اور چوتھی سوویت یونین نے تجویز کی۔ ان تمام قراردادوں میں کسی نہ کسی حد تک سیاسی تصفیے پر ہی زور دیا گیا تھا۔

ان تمام قراردادوں میں سب سے زیادہ اہم برطانیہ اور فرانس کی جانب سے پیش کی جانے والی قرارداد (S/10455) تھی اس قرارداد کے مطابق:

1- پائیدار قیام امن کے لئے مغربی محاذ پر مکمل اور فوری جنگ بندی عمل میں لا کر تمام جارحانہ کارروائیاں ختم کردی جائیں اور اس کی اس وقت تک پابندی کی جائے جب تک اسی طرح کی فائر بندی مشرقی محاذ پر بھی عمل میں نہیں آجاتی۔

2- مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہشات کے مطابق ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے ایک ایسا فوری اور جامع سیاسی تصفیہ عمل میں لایا جائے جو اقوام متحدہ کے چارٹر اور اصولوں کے عین مطابق ہو۔

اس دوران جب ہم اس قرارداد کے مسودے کو اپنے حق میں تبدیل کروانے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے اور مسودے کی تحریر پر بحث مباحثہ جاری تھا یہاں یہ خبر پہنچی کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کے کمانڈر نے فائر بندی کی درخواست کی ہے۔ بعدازاں برطانوی سفارتکاروں نے ہمیں بتایا کہ وہ قرارداد کے مسودے میں فوجوں کے انخلاء کا اصول شامل کرانے سے قاصر ہیں۔

اب ہم نے ایک ایسی قرارداد منظور کرانے کے لئے کوشش شروع کردی جس میں

فوری جنگ بندی کے ساتھ جنیوا کنونشن کی پاسداری کا اصول موجود ہو کیونکہ اس وقت محسوس کیا جا رہا تھا کہ اس تبدیل شدہ صورتحال میں سیاسی تصفیے کے حوالے سے کسی نئی شق کی شمولیت خارج از امکان تھی۔ لہٰذا سوویت ویٹو کے اندیشے کے پیش نظر سیکورٹی کونسل کے غیر مستقل ارکان نئی قرارداد پیش نہ کر سکے جس میں 16 ستمبر تک دونوں حصوں میں فائر بندی اور بعدازاں فوجوں کی واپسی اور مقبوضہ علاقوں کی واپسی کا اصول موجود ہو۔

دسمبر کو ذوالفقار علی بھٹو کو صدر یحییٰ کا تار موصول ہوا جس میں برطانیہ اور فرانس کی قرارداد کے مسودے سے اتفاق کا اظہار کیا گیا تھا۔ تار میں کہا گیا تھا کہ اگر اس مسودے میں تبدیلی ممکن ہو تو یہ اور بھی بہتر ہوگا؛ تاہم اگر یہ قرارداد منظور نہ ہو تو پھر محض جنگ بندی کے لئے کوشش کی جائے۔ اس سے پہلے کہ اس پیغام کے مطابق عمل کیا جاتا یہ خبر پہنچی کہ ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کردیئے گئے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس نے اپنی تجاویز دوسروں پر آمادہ کرنے کی کوششیں ترک کردیں۔ اسی دن کونسل کے دوسرے اجلاس میں بھارت کے وزیر خارجہ نے وہ بیان پڑھ کر سنایا جس میں یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کردیا گیا تھا۔

سوویت یونین نے بھارتی اعلان جنگ بندی کا کچھ کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈالنے کے لئے ایک نئی قرارداد (S/10458) پیش کردی جس میں مشرقی پاکستان میں جارحانہ اقدامات کے خاتمے کا خیر مقدم کرتے ہوئے دسمبر 1970ء کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے مشرقی پاکستان کے نمائندوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر اختیارات کی منتقلی پر زور دیا گیا تھا۔ اس تجویز کا مقصد پاکستان پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ بھی بھارتی اقدام کا مثبت جواب دے۔ اس قرارداد میں جموں وکشمیر میں 1965ء کی سیز فائر لائن سمیت تمام محاذوں پر جنگ بند کرنے کی اپیل بھی تھی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد آناً فاناً تبدیل ہو جانے والی صورتحال کے باعث تمام پچھلی قراردادیں بے کار ہو چکی تھیں اب میدان میں صرف سوویت یونین کی قرارداد باقی تھی۔ یہ بات انتہائی ضروری تھی کہ اس قرارداد کو مؤثر طریقے سے روکا جائے۔ لہٰذا ہم نے امریکہ سے درخواست کی کہ اس قرارداد کے مسودے کو استعمال میں لایا جائے جو سیکورٹی کونسل کے غیر مستقل ارکان نے تیار کی تھی اور بعدازاں سوویت ویٹو کے خطرے کے پیش نظر پیش نہیں کی۔ امریکہ نے ہماری درخواست کا مثبت جواب دیا اور قرارداد (S. 10459-Rev1) پیش کی۔ جاپان

بھی اس قرارداد کا شریک محرک تھا اس قرارداد کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

1- تمام محاذوں پر فوری فائر بندی کی سختی سے پابندی کی جائے جب تک کہ تمام مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کی واپسی عمل میں نہیں آ جاتی۔

2- تمام متعلقہ فریق انسانی جانوں کے تحفظ اور 1949ء کے جنیوا کنونشن کی پاسداری کے لئے تمام ممکنہ اقدامات کریں۔ اور اپنے تمام تر اختیارات اور وسائل کو استعمال میں لا کر زخمی اور بیمار جنگی قیدیوں اور شہریوں کے مکمل تحفظ کو یقینی بنائیں۔

3- اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اپنا ایک خصوصی نمائندہ مقرر کریں جو اس انسانی مسئلے کے حل کے لئے کوششیں بروئے کار لائے۔

حالانکہ اس قرارداد میں سوویت یونین کی خواہش کے مطابق فائر بندی کی نگرانی سے متعلق کوئی شق شامل نہ تھی اس کے باوجود اس نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔ اب سوویت یونین کو تمام مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کی فوری واپسی پر اعتراض تھا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان پر بھارت قابض ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس میں جنرل اسمبلی کی قرارداد نمبر 2793 (xxvi) یا یو این ای پی آر او کا کوئی حوالہ آئے۔ مزید برآں وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس موقع پر کوئی ایسی قرارداد منظور ہو جائے جس کا محرک امریکہ ہو۔

چوتھا حصہ

صدر یحییٰ نے بھارتی وزیراعظم کے اعلان فائر بندی کے جواب میں جمعہ کے روز 1430 جی ایم ٹی پر اپنی تمام افواج کو بھی فائر بندی کا حکم دے دیا۔ اعلان جنگ بندی میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر بھارت جنگ بندی کے گرین وچ ٹائم کے اعلان میں مخلص ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس اعلان کو اقوام متحدہ کے ذریعے باقاعدہ بنائے۔ تاہم سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی کے اعلان کے بعد بھارت نے اقوام متحدہ کے ذریعے اسے باقاعدہ بنانے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

صدر یحییٰ کے ایک ہنگامی پیغام پر بھٹو صدر نکسن سے ملنے واشنگٹن پہنچے اور ان سے مل کر واپس پاکستان چلے گئے۔

جنگ رک جانے کے باعث دوسروں کی نظروں میں اس معاملے کی ہنگامی نوعیت ختم ہو چکی تھی: تاہم ہمیں فائر بندی کو باقاعدہ شکل دینے مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کی واپسی اور

جموں کشمیر میں فائر بندی لائن کی بحالی پر مبنی کسی قرارداد کی منظوری کی کوششیں جاری رکھنا تھیں۔ ہماری یہ کوشش 17 سے 21 دسمبر تک جاری رہی۔ یہ کارنامہ صومالیہ کے نمائندے نے انجام دیا جس نے تمام فریقوں سے گفت و شنید کے بعد ایسے مسودے کی تیاری میں کامیابی حاصل کر لی جو سوویت یونین کے ویٹو سے محفوظ رہا۔ بھارت کا اصرار تھا کہ اس مسودے میں:

(a) جنرل اسمبلی کی قرارداد 2793 کا کوئی ذکر نہیں ہونا چاہئے

(b) جموں کشمیر کی سیز فائر لائن کا کوئی ذکر نہیں ہونا چاہئے

(c) اور مشرقی اور مغربی محاذ جنگ سے فوجوں کی واپسی کا تذکرہ ایک ہی اصول کے تحت نہیں کیا جانا چاہئے۔ ہم نے بھارتی مطالبات کی مخالفت کی اور گفت و شنید کے بعد ایک قرارداد (S/10465) کا مسودہ تیار کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس قرارداد میں یہ تینوں نکات موجود تھے تاہم باہمی طور پر قابل قبول مسودہ تشکیل دینے کے لئے بعض نکات پر سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ قرارداد کے نکات کی تشریح کے بارے میں کسی ابہام سے بچنے کے لئے قرارداد کے محرک دستاویز کے متن کی تشریح کر کے بتائیں کہ کسی مخصوص نکتے سے وہ کیا مطلب اخذ کرتے ہیں۔ اس قرارداد اور اس کی تشریحات نے فائر بندی کو باقاعدہ شکل دے دی اور یہ اصول طے پا گیا کہ فوجیں اپنی پرانی پوزیشنوں پر واپس چلی جائیں گی۔

قرارداد (S/10465) 21 دسمبر کو سیکورٹی کونسل کے حتمی اجلاس میں منظور کر لی گئی۔ قرارداد کے حق میں 13 ووٹ آئے مخالفت میں کوئی ووٹ نہ تھا جبکہ سوویت یونین اور پولینڈ نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ قرارداد کی تشریحات کو پڑھنے کی ذمہ داری صومالیہ نے نبھائی۔

قرارداد منظور ہو جانے کے بعد ہم نے یہ واضح کر دیا کہ یہ ایک المناک حقیقت تھی کہ سیکورٹی کونسل اس معاملے کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں کے مطابق سلجھانے میں ناکام رہی ہے۔ ہم یہ بات بھی ریکارڈ پر لائے کہ وہ کون سے امور ہیں جو اس قرارداد کے بارے میں ہماری حکومت کے رویئے کو متعین کریں گے جس کی تشریحات صومالیہ کے نمائندے نے کی ہیں۔

بھارت کے وزیر خارجہ نے کہا کہ ان کا ملک متعلقہ فریقوں کے ساتھ مل بیٹھ کر نہ صرف فوجوں کے انخلاء کے معاملہ کو سلجھانے کے لئے تیار ہے بلکہ دوسرے مسائل کو بھی باہمی

بات چیت سے حل کرنا چاہتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں بنگلہ دیش اور اصول کی حکومت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستانی نمائندے اس موقع پر بھارتی مداخلت کا مناسب الفاظ میں جواب دیا۔

خون کی ہولی بند کرانے کی اپیل

سیکورٹی کونسل کی کارروائی ختم ہونے کے بعد بھٹو نے سیکورٹی کونسل کے رکن ممالک کے سربراہان مملکت اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کے قتل عام کو بند کرانے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ اس اپیل کے ساتھ ہم نے سیکریٹری جنرل پر زور دیا کہ وہ قرارداد 307 (71) کے پیراگراف 5 کے تحت اپنا ایک خصوصی نمائندہ بھیجیں۔ ہم نے تمام رکن ممالک پر زور دیا کہ وہ اس خون کی ہولی کو بند کرانے کے لئے فوری اقدامات کریں۔ ان ممالک نے صلاح دی کہ جب تک سیکریٹری جنرل کا خصوصی نمائندہ اپنی رپورٹ پیش نہیں کر دیتا اس وقت تک سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرنا کسی طور بھی فائدہ مند نہیں ہوگا۔

26 دسمبر کو ہم نے سیکریٹری جنرل کو تحریری طور پر حکومت کی طرف سے سیکورٹی کونسل کی قرارداد 307 (71) قبول کرنے کے فیصلے سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیا کہ قرارداد اقوام متحدہ کے چارٹر کے چیپٹر vii کے تحت منظور کی گئی تھی۔ اس پیغام میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ برصغیر میں پائیدار امن کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب بھارت مشرقی پاکستان اور جموں و کشمیر سمیت تمام علاقوں میں جارحانہ کارروائیاں بند کر دے۔

بھارت نے 10 جنوری کو سیکریٹری جنرل کو ایک پیغام (مسودہ S/10501) بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ فوجوں کے انخلاء کے معاملے پر دو طرفہ بات چیت کے لئے تیار ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکے فوجوں کو واپس بلا لینے پر رضامند ہے۔ مشرقی پاکستان سے فوج کے انخلاء کے بارے میں بھارت نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس بات کا فیصلہ بھارت اور بنگلہ دیش کی حکومتیں باہمی گفت و شنید سے کریں گی اور انخلاء اسی وقت عمل میں آئے گا جب دونوں حکومتیں اسے مناسب سمجھیں گی۔ اس پیغام کے آخر میں 1949ء کے جنیوا کنونشن کی مکمل پاسداری تمام انسانی مسائل کے حل کے لئے اقوام متحدہ سے مکمل تعاون کا اعادہ

کیا گیا تھا۔

اوپر بیان کئے جانے والے واقعات کی روشنی میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا چاہئے۔

(a) کیا یہ ممکن تھا کہ یہ مسئلہ اس وقت نومبر 1971ء میں سیکورٹی کونسل میں اٹھایا جاتا جب بھارت نے مشرقی پاکستان میں کھلی جارحیت کا آغاز کیا تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

(b) اگر مشرقی کمان کچھ دیر اور میدان میں ڈٹی رہتی اور ہتھیار نہ ڈالتی جیسا کہ اس نے 16 دسمبر 1971ء کو کیا تو کیا ایک آبرومندانہ جنگ بندی اور افواج کی واپسی کا امکان تھا؟

(c) کیا سوویت یونین، پولینڈ اور اینگلو فرنچ قراردادوں کو منظور کر کے اپنے حق میں نتائج حاصل کئے جاسکتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو ان قراردادوں کو منظور کیوں نہیں کیا گیا؟

پہلے سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ان حقائق کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے جن کے باعث بتدریج مشرقی پاکستان کے بحران نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی۔ مارچ کے مہینے سے جولائی 1971ء تک حکومت پاکستان کا موقف تھا کہ مشرقی پاکستان کا بحران مکمل طور پر پاکستان کا داخلی معاملہ ہے اس لئے اقوام متحدہ اس میں کسی قسم کی مداخلت کی مجاز نہیں۔

سیکورٹی کونسل کے ارکان کی اکثریت اور اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری بھی ظاہری طور پر اسی موقف کے حامی تھے۔ تاہم کچھ ہی ہفتوں میں یعنی 25 مارچ کے بعد سیکریٹری جنرل انسانی بنیادوں پر مشرقی پاکستان کے حالات پر تشویش ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مئی 1971ء میں اکنامک اینڈ سوشل کونسل (ای سی او ایس او سی) کے نیویارک میں ہونے والے 50 ویں سیشن کے موقع پر بھارت نے مشرقی پاکستان کے مسئلے کو اٹھانے کی بھرپور کوشش کی اور موقف اختیار کیا کہ مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی جا رہی ہیں لیکن اجلاس میں موجود پاکستانی نمائندہ تنظیم کو کسی اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے یا اعلامیہ جاری کرنے سے روکے رکھنے میں کامیاب رہا۔

لیکن 23 جون 1971ء کو اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین پرنس صدر الدین آغا خان نے اقوام متحدہ میں ایک کانفرنس کے دوران کہا کہ مشرقی پاکستان سے بہت

بڑی تعداد میں لوگ ملک چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے مہاجرین کے مسئلے کو گمبھیر اور غیر معمولی تشویش کا حامل قرار دیتے ہوئے کہا کہ مشرقی پاکستان کے مسئلے کا سیاسی تصفیہ ہی مہاجرین کی واپسی کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ ان کا یہ بیان اس حوالے سے انتہائی اہم تھا کہ پہلی دفعہ اقوام متحدہ کے کسی اعلیٰ عہدیدار نے کھلے طور پر مشرقی پاکستان کے بحران کے سیاسی تصفیے کی ضرورت پر زور دیا تھا اور آگے چل کر یہی بات اقوام متحدہ کے حلقوں کے عام موقف کی شکل اختیار کرگئی۔

25 جولائی 1971ء کو پاکستان نے مشرقی پاکستان پر اپنا موقف تبدیل کرتے ہوئے اقوام متحدہ میں اپنے نمائندے کو اس بات سے آگاہ کیا کہ بھارت سے جنگ کے خطرے کو ٹالنے کے لئے سیکورٹی کونسل کا اجلاس مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ لہٰذا پاکستان برصغیر میں امن کو درپیش خطرات پر بحث کے لئے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کا حامی ہے۔ کیونکہ سوویت یونین اور سیکورٹی کونسل کے چند اور رکن ممالک اس موقع پر اجلاس بلانے کے حق میں نہیں تھے اس لئے ایسا نہ ہوسکا۔

اس پر حکومت پاکستان نے تجویز دی کہ سیکورٹی کونسل کی ایک کمیٹی کو امن کو لاحق خطرات کو ٹالنے کے لئے بھارت اور پاکستان کا دورہ کرنا چاہیے۔ اس تجویز میں ادارے کے غیر مستقل ارکان نے ہمدردانہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ سوویت یونین نے تو اسے رد کردیا؛ تاہم دوسرے مستقل ارکان نے بھی اس تجویز کو شک کی نظر سے دیکھا۔ سوویت یونین کے اس مخالفانہ رویے کا محرک اس کی بھارت کے لئے مکمل حمایت کا اصول تھا۔ اس نے روایتی انداز میں سیکورٹی کونسل کے ہر اس اقدام کا رخ موڑ دیا جو وہ ویٹو کے بغیر کرسکتا تھا۔

3/4 اکتوبر 1971ء کو صدر یحییٰ خان نے امریکہ کے صدر نکسن کو ایک ذاتی پیغام بھیجا جس میں پاکستان اور بھارت میں جنگ جیسی صورتحال کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ پیغام میں امریکہ سے اس مشکل وقت میں مشرقی پاکستان کے بحران کے حل کے لئے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے میں مدد اور راہنمائی فراہم کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ یحییٰ خان نے امریکی صدر سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ اس مقصد کے لئے بین الاقوامی سطح پر دیگر اقدامات کو زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں تو پاکستان ان سے بھی اتفاق کرے گا۔

یہ پیغام 6 اکتوبر 1971ء کو پاکستان کے ایڈیشنل سیکریٹری خارجہ مسٹر علوی نے جو اس وقت امریکہ کے دورے پر تھے صدر نکسن کے قومی سلامتی کے مشیر ڈاکٹر کسنگر کے حوالے کیا۔

ڈاکٹر کسنگر نے مسٹر علوی اور پاکستانی سفیر ہلالی کو بتایا کہ وہ فوری طور پر یہ پیغام صدر نکسن کو پہنچائیں گے اور بعدازاں سفیر ہلالی کو اپنے خیالات سے آگاہ کردیں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کو انتہائی احتیاط اور ہمدردی کی نظر سے دیکھیں گے۔

پیغام پر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "اگر پاکستان یہ معاملہ سیکورٹی کونسل میں لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو امریکہ کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوں گی"۔ تاہم میرے خیال میں سیکورٹی کونسل ہمیں کسی نتیجے پر نہیں پہنچائے گی۔ شاید بھارت اور سوویت یونین سے مذاکرات کے ذریعے زیادہ بہتر نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

کونسل کا اجلاس بلانے سے گریز

انہوں نے مزید کہا کہ سیکورٹی کونسل میں بحث مباحثہ سے جہاں سوویت یونین کے پاس ویٹو کا ہتھیار ہوگا رائے عامہ کے بھڑک اٹھنے کا امکان ہوگا جس سے صورتحال مزید خراب ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر کسنگر نے کہا کہ وہ اس معاملے پر چینی رہنماؤں سے گفت وشنید کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس پر ان کا کیا موقف ہے۔

16 اکتوبر سے 21 نومبر کے درمیان جب مشرقی پاکستان پر بھارتی فوجی یلغار جاری تھی پاکستان کی جانب سے سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کرنے کی کوئی باقاعدہ درخواست نہیں کی گئی حالاکہ صدر یحییٰ نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھان سے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ پاکستان معاملے کو سلجھانے میں ان کی کوششوں کا خیر مقدم کرے گا۔ صدر یحییٰ نے 23 نومبر کو اپنے ایک پیغام میں سیکرٹری جنرل سے معاملے میں ذاتی دلچسپی لینے کی درخواست بھی کی حالانکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ سیکرٹری جنرل سیکورٹی کونسل کی ہدایت کے بغیر ذاتی طور پر کوئی اقدام نہیں کرسکتے۔ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ سیکرٹری جنرل اس مقصد کے لئے چارٹر کے آرٹیکل 99 کو استعمال کریں۔ معاملے پر کسی مناسب اقدام کرنے کی ذمہ داری سیکورٹی کونسل کے پاس تھی جسے سیکرٹری جنرل کی 20 جولائی 1971ء کی یادداشت کے ذریعے صورتحال کے بارے میں آگاہ کردیا گیا تھا۔ اوتھان نے 26 نومبر 1971ء کو اپنے خط میں صدر یحییٰ کو اس بات سے آگاہ کردیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ چارٹر کے تحت وہ جس حد تک جاسکتے تھے جاچکے ہیں۔

29 نومبر 1971ء جنرل یحییٰ نے سیکرٹری جنرل کو ایک اور خط لکھا جس میں مشرقی

پاکستان کی طرف سرحد پر اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کی تعیناتی کی درخواست کی گئی تھی تا سرحدی خلاف ورزیوں کی رپورٹ اقوام متحدہ تک پہنچ سکے۔

3 دسمبر 1971ء کو مغربی محاذ پر جھڑپوں کے آغاز پر جنرل یحییٰ نے ایک دفعہ پھر سیکریٹری جنرل کو پیغام بھیجا جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ بین الاقوامی برادری اس صورتحال کا نوٹس لے گی اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں کی پاسداری کرے گی جو مسائل کے حل میں طاقت کے استعمال پر پابندی عائد کرتا ہے اور اقوام کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

درحقیقت یہ بات بالکل واضح ہے کہ صدر یحییٰ نے پاک بھارت بحران کے دوران کسی بھی مرحلے پر سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی باقاعدہ درخواست نہیں کی۔ آخر وقت تک انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ سیکرٹری جنرل اور رکن ممالک خود اپنے طور پر اجلاس بلائیں جبکہ ان میں سے کوئی بھی اجلاس بلانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ سیکورٹی کونسل کے ارکان کا خیال تھا کہ اجلاس بلانے کی درخواست کرنے کی ذمہ داری پاکستان یا بھارت پر عائد ہوتی تھی۔

اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر آغا شاہی کے خیال میں مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے فوراً بعد پاکستان کی جانب سے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کرنے میں ناکامی کے بعد ازاں سیکورٹی کونسل کی جانب سے بحران کے حل کی کوششوں پر انتہائی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے فوراً بعد سیکورٹی کونسل میں احتجاج نہ کرنے کے باعث پاکستان نے وہ حیثیت کھو دی تھی جو ایک جارحیت کا شکار ہونے والے ملک کو دی جاتی ہے۔ پاکستان نے ایسا رویہ اختیار کئے رکھا جو ایک جارحیت کا شکار ہونے والے ملک کا نہیں ہوتا جس نے بھارتی عزائم اور اس کی فوجی کارروائی کی شدت کے بارے میں ہمارے دعوے کو ناقابل یقین بنا دیا تھا۔

آغا شاہی کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ پاکستان سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کرنے میں اس لئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا کہ وہ سیکورٹی کونسل کی جانب سے مسئلے کے سیاسی تصفیے سے فرار چاہتا تھا کیونکہ اس صورت میں اسے عوامی لیگ کے ساتھ معاملہ طے کرنا پڑتا۔

پاکستان کی اس ہچکچاہٹ سے دوست ممالک نے بھی یہ تاثر لیا کہ یا تو پاکستانی حکومت حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتی یا پھر پاکستان فوجی اعتبار سے اس قدر طاقتور ہے کہ اسے مغربی محاذ خصوصاً جموں وکشمیر میں فیصلہ کن فوجی برتری حاصل کر لینے کا کامل یقین ہے اور وہ نہیں

چاہتا کہ سیکورٹی کونسل کے کسی اقدام یا فیصلے کے باعث اس کی فوجی کارروائیوں اور قوت عمل پر کسی قسم کی پابندی لگ جائے۔ بہرحال یہ بات انتہائی اہم ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ واحد مثال ہے کہ اقوام متحدہ کے ایک رکن ملک نے دوسرے کی سرزمین پر حملہ کیا ہو لیکن اس جارحیت کا شکار ہونے والا یہ معاملہ فوری طور پر سیکورٹی کونسل میں نہ لایا ہو۔ 3 دسمبر 1971ء کو مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کے آغاز پر بھی پاکستان نے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست نہیں کی حالانکہ وہ اس سے کچھ روز پہلے ایک قرارداد کا مسودہ بھی تیار کر چکا تھا۔ 4 دسمبر 1971ء کو امریکہ نے پاکستان کو بتایا کہ وہ اس معاملے پر اپنے طور پر سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کر رہا ہے خواہ پاکستان اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔

یہ محض آغا شاہی کا ہی خیال نہیں کہ پاکستان کو مشرقی پاکستان پر بھارتی حملہ ہوتے ہی سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کر دینی چاہیے تھی۔

صحافی قطب الدین عزیز (گواہ نمبر 36) اپریل 1971ء سے واشنگٹن میں پاکستانی سفارتخانے میں تعینات تھے۔ انہوں نے بتایا کہ امریکی نومبر 1971ء سے ہی اس بات سے آگاہ تھے کہ بھارت مشرقی پاکستان پر بڑا فوجی حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ امریکہ اس معاملے پر سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کی حمایت کرے گا۔ قطب الدین عزیز کے مطابق امریکہ کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ قیام امن کی امریکی کوششوں کو بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کامیاب نہیں ہونے دیں گی۔

جب اس معاملے پر سیکرٹری خارجہ سلطان محمد خان (گواہ نمبر 143) سے سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء سے پہلے کے عرصہ میں امریکہ کو ہماری فہم و فراست سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ ہم سیکورٹی کونسل میں جائیں گے لیکن ایک دفعہ جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور بھارت نے خود اس بات کا اقرار کر لیا کہ اس نے اپنے فوجی کمانڈروں کو دفاعی اقدامات کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کرنے کی اجازت دے دی ہے تو صورتحال پوری طرح سے تبدیل ہو چکی تھی۔ اس موقع پر امریکہ نے کھلے طور پر سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی ضرورت کا اظہار کر دیا تھا لیکن صدر یحییٰ 4/5 دسمبر 1971ء تک اس کے حق میں نہیں تھے۔ سلطان محمد خان کے مطابق اجلاس بلانے کی درخواست کرنے میں جنرل یحییٰ کی ہچکچاہٹ کی وجہ ان کا یہ یقین تھا کہ پاک فوج مغربی محاذ پر فوری برتری حاصل کر لے گی۔

یحییٰ خان نے کیوں گریز کیا

ہم نے صدر یحییٰ سے پوچھا کہ وہ ان حالات اور وجوہات کی وضاحت کریں جنہوں نے انہیں 21 نومبر 1971ء کو بھارتی حملے کے بعد سیکورٹی کونسل میں معاملہ اٹھانے سے روکے رکھا۔ ان کے جواب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام وقت اکتوبر 1971ء میں پاکستانی پوزیشن کے حوالے سے سوچتے رہے۔ جب ڈاکٹر کسنگر نے صدر یحییٰ کی طرف سے صدر نکسن کو بھیجے جانے والے پیغام کے حوالے سے ایڈیشنل سیکرٹری خارجہ کو بتایا کہ اس وقت سیکورٹی کونسل میں جانا فائدہ مند نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ صدر یحییٰ کا جواب 21 نومبر 1971ء کو پیدا ہونے والی صورتحال سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ سوویت یونین کے ویٹو کو سیکورٹی کونسل میں سرے سے معاملہ نہ اٹھانے کی وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملی کہ سیکورٹی کونسل کے مستقل ارکان معاملے کو زیر بحث لانے اور پاکستان کے مقاصد کی حمایت پر تیار نہ تھے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کو بھیجے جانے والے جنرل یحییٰ کے پیغامات جن میں جنرل سیکرٹری سے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی جاتی رہی کہ فوری جوابات پہنچتے رہے جن میں یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ اوتھان اس معاملے میں کوئی ذاتی کوشش کرنے سے قاصر ہیں۔

ان تمام حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ 21 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان پر بھارتی جارحیت کے بعد سیکورٹی کونسل کا اجلاس نہ بلانے کی تمام ذمہ داری جنرل یحییٰ پر عائد ہوتی ہے۔ آغا شاہی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ مشرقی پاکستان پر جارحیت واحد واقعہ ہے جب جارحیت کا شکار ہونے والے ملک نے سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جنرل یحییٰ خان کی ہچکچاہٹ کی بنیادی طور پر دو وجوہات تھیں۔

(a) وہ اس بات سے گریزاں تھے کہ سیاسی تصفیہ کی صورت میں انہیں شیخ مجیب الرحمٰن سمیت صوبے کے دیگر منتخب نمائندوں کے ساتھ معاملہ طے کرنا پڑے گا۔

(b) دوسری وجہ ان کا وہ بے بنیاد اعتماد تھا کہ ان کی فوج مغربی محاذ پر اس طرح کی فوری برتری حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی جس کی بنیاد پر پاکستان فائر بندی کے بعد سودے بازی میں برتر حیثیت حاصل کرلے گا۔

جنرل یحییٰ کی ہچکچاہٹ کی پہلی وجہ کو ان کی کوتاہ اندیشی ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور ایسی باتوں کے لئے قومی سلامتی کو کسی صورت قربان نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو وہ اس صورت میں اہمیت کی حامل ہوتی جب فوجی برتری حاصل کرنے کے لئے مکمل منصوبہ بندی اور عزم کے ساتھ مناسب اقدامات کئے گئے ہوتے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ فوجی کارروائی کے دوران ہماری اعلیٰ عسکری کمان میں اوپر بیان کی گئی خوبیوں کا فقدان دیکھنے میں آیا۔ ہمارے خیال میں یہ معاملہ 21 نومبر 1971ء کو بھارتی حملے کے فوراً بعد نہ صرف سیکورٹی کونسل میں لے جانا نہ صرف ممکن تھا بلکہ ایسا ہی کیا جانا چاہئے تھا اور وہاں تمام تر فوائد کا حصول ممکن تھا۔ بھارت کی کھلی جارحیت کے ارتکاب کے باعث بین الاقوامی برادری کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ آیا مشرقی پاکستان میں 16 دسمبر 1971ء سے کچھ دیر بعد تک لڑائی جاری رکھنے سے مشرقی پاکستان میں آبرومندانہ فائر بندی کا مقصد حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اقوام متحدہ میں سفارتی سرگرمیوں کو ڈھاکہ میں فوجی صورتحال کے تناظر میں دیکھا جائے۔ ایسا کرنے سے اس سوال کا جواب بھی فراہم ہوجائے گا کہ روس، پولینڈ اور انگلینڈ فرنچ قراردادوں کی منظوری ہمارے لئے کس حد تک قابل قبول تھی۔

مشرقی پاکستان میں سیاسی تصفیے اور بالخصوص مجیب الرحمٰن سے معاملے طے کرنے سے گریز نے جنرل یحییٰ کو ذہنی طور پر مفلوج کردیا تھا جس کے باعث وہ آخر وقت تک نہ تو کوئی فیصلہ کرسکے اور نہ صورتحال اور حقائق کا ادراک کرسکے۔

مشرقی پاکستان کی جنگی صورت حال

4 سے 10 دسمبر تک اقوام متحدہ میں ہونے والا بحث مباحثہ اس تاثر کے زیر اثر تھا کہ پاک فوج بھارتی حملے کے خلاف عزم و حوصلے کے ساتھ ڈٹی ہوئی ہے اور سخت مزاحمت کر رہی ہے اور مشرقی پاکستان میں بھارت کی فوجی کارروائی کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے طویل عرصہ درکار ہوگا۔ لہٰذا 7 دسمبر 1971ء کو جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہونے والی ووٹنگ کے نتائج بے مثال تھے اور بین الاقوامی برادری کے احساسات کی عکاسی کرتے تھے حالانکہ اس موقع پر اصل فوجی صورتحال بہت حد تک مختلف تھی جس کا یہاں اجمالی طور پر ذکر کرنا مناسب ہوگا۔
مغربی محاذ پر جنگ شروع ہوتے ہی مشرقی محاذ پر بھارتی فوجی سرگرمیوں خاص طور پر بھارتی فضائیہ کے حملوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ 4,3 اور 5 دسمبر کی رات ڈھاکہ ائیر فیلڈ اور شہر میں دوسرے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ بھارتی فوج ''کومیلا'' کے سوا مشرقی پاکستان کے تمام محاذوں پر پیش قدمی کر رہی تھی۔ کومیلا اس وقت تک ایک مضبوط قلعے کی طرح بھارتی فوج کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا لیکن دشمن کومیلا کو شمال اور جنوب کی طرف سے ایک طرف چھوڑ کر نکل گیا۔ ''جیسور'' جس پر 20/21 نومبر کو سب سے پہلے حملہ ہوا زبردست دباؤ کا شکار تھا۔ بھارتی ذرائع کے مطابق جیسور پر نومبر کے آخر میں قبضہ ہوا جبکہ ہماری مشرقی کمان 5 دسمبر تک یہ دعویٰ کرتی رہی کہ جیسور ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ کمیشن کو اس بات میں زیادہ دلچسپی تھی کہ 7 دسمبر کے بعد پیدا ہونے والی جنگی صورتحال کا تجزیہ کیا جائے کیونکہ اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر اے ایم مالک نے اپنے تین مایوس کن پیغامات میں سے پہلا اس دن بھیجا تھا۔ بے شک اہم ترین گواہ کی عدم موجودگی حقائق تک پہنچنے میں بڑی دشواری کا باعث ہے تاہم ہمارے سامنے 7 دسمبر سے پیدا ہونے والی صورت حال کا یہ نقشہ آ گیا۔ بھارتی بحریہ مشرقی پاکستان کی مکمل بحری ناکہ بندی کر چکی تھی۔ صوبے کے مغربی حصے میں جیسور اور جنیاپول پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اور دشمن فرید پور اور کھلنا کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ دشمن کے ایک ڈویژن کے حملے کا رخ دیناج پور کی طرف تھا جبکہ رنگ پور اور بوگرہ کے درمیان دشمن دور تک اندر گھس آیا تھا

اور یہاں پیش قدمی جاری تھی۔ اس حملے نے رنگ پور کے محاذ پر موجود ہماری فوج کو دوسرے دستوں سے کاٹ دیا تھا لہٰذا اس پورے محاذ پر ہماری حالت یہ تھی کہ ایک بریگیڈ نے رنگ پور کے دفاع کے لئے قلعہ بندی کر رکھی تھی یہاں بھی ہمارا ایک بریگیڈ تھا۔ ہماری یہ قلعہ بندی بھی اوپر بیان کئے حملے کے باعث ہلی بیرگنج کی سمت سے بھارت کی زد میں تھی۔ میمن سنگھ سیکٹر میں بھی ہماری پوزیشن اچھی نہ تھی اور یہاں پر پاک فوج سرحد سے میمن سنگھ اور جمال پور کی طرف پسپا ہو رہی تھی۔ مزید مشرق میں سلہٹ تھا جہاں ہماری قوت ایک ریگولر اور ایک ایڈ ہاک بریگیڈ پر مشتمل تھی۔ مؤخر الذکر بریگیڈ سول آرمڈ فورسز پر مشتمل تھا۔ یہ بھی سلہٹ کے شمال جنوب اور مشرق کی جانب سے دشمن کے شدید دباؤ کے پیش نظر پسپا ہوئی اور اس نے سلہٹ کے گرد دفاعی قلعہ بندی کر لی۔ کومیلا کے شمال میں کومیلا اور سلہٹ کو ملانے والی نہایت اہم ریلوے لائن کو دو دن پہلے دشمن نے اکھنور کے علاقے میں کاٹ دیا تھا اور اس علاقے میں دفاع پر مامور بریگیڈ پسپا ہو کر پیچھے ہٹ آیا تھا۔

7 دسمبر کو اس بریگیڈ نے سرحد پر اپنی پوزیشنیں خالی کر دی تھیں اور میناس نہر تک پسپا ہو گیا تھا لیکن کومیلا میں دشمن سے برسر پیکار ہمارا بریگیڈ ڈٹا ہوا تھا کومیلا کے جنوب میں دشمن نے ذیلی سڑکوں کا جال بچھا دیا تھا اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس علاقے میں مامور ہمارا بریگیڈ زیادہ دیر تک دشمن کے دباؤ کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔ دشمن کا پورا ایک ڈویژن تری پورہ سے چاند پور دریائے میگھنا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس مرحلے پر مشرقی پاکستان کے گورنر کی طرف سے صدر یحییٰ کو یہ پیغام بھیجا گیا۔
فلیش سگنل نمبر: اے۔ 6905 برائے ہیڈ کوارٹرز سی ایم ایل اے ''یہ انتہائی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کی صحیح صورتحال آپ کے علم میں لائی جائے۔

> ''میں نے جنرل نیازی سے بات چیت کی ہے جنہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ہماری افواج دشمن کی غیر معمولی عددی برتری' ناکافی نفری اور عسکری وسائل اور فضائیہ کی مدد حاصل نہ ہونے کے باوجود بہادری سے لڑ رہی ہیں۔ بائی ہماری پچھلی پوزیشنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں فوجی ساز و سامان اور جانی نقصان بہت زیادہ ہے جسے پورا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی اور مغربی محاذ پر ہماری افواج شکست کھا چکی ہیں۔

دریائے میگھنا کے مغرب میں واقع پوری پٹی ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہے جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جیسور پر پہلے ہی دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے جس سے پاکستان کے حامی لوگوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ سول انتظامیہ مفلوج ہو چکی ہے کیونکہ مواصلات کی غیر موجودگی میں وہ کچھ نہیں کر سکتی' خوراک اور دیگر ضروری اشیاء کی قلت ہو رہی ہے اور چٹا گانگ سے پورے صوبے میں کسی جگہ ترسیل ممکن نہیں حتیٰ کہ 7 دن بعد ڈھاکہ میں بھی کھانے کو کچھ نہیں ہوگا۔ ایندھن اور تیل کے بغیر پورا کاروبار حیات ٹھپ ہو کر رہ جائے گا' جن علاقوں کو پاک فوج نے خالی کر دیا ہے وہاں امن و امان کی صورتحال انتہائی دگرگوں ہے۔ پاکستان کے حامی ہزاروں لوگ باغیوں کے ہاتھوں انتہائی سفاکی سے قتل کیے جا رہے ہیں۔ لاکھوں غیر بنگالی اور پاکستان کے حامی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس وقت زبانی ہمدردی حتیٰ کہ مادی مداخلت سے بھی کوئی بہتری نہیں آ سکتی۔ اگر ہمارا کوئی دوست ہماری مدد کے لئے تیار ہے تو وہ اگلے 48 گھنٹوں میں پہنچ جانی چاہئے اگر مدد کی کوئی توقع نہیں تو میں پورے خلوص کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ مذاکرات کریں تاکہ ایک مہذب اور پرامن تبدیلی آئے۔ لاکھوں جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں اور ناقابل بیان مصائب سے بچا جا سکے۔ جب نتیجہ صاف نظر آ رہا ہے تو کیا اس قدر قربانی دینے کا کوئی جواز ہے اگر امداد پہنچ رہی ہے تو ہم لڑیں گے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔"

اوپر بیان کی گئی فوجی صورتحال کے حوالے سے گورنر مالک کا پیغام شاید ضرورت سے کچھ زیادہ مایوس کن تھا؛ تاہم صورتحال اس سے کچھ زیادہ مختلف بھی نہ تھی۔

ہم دعا گو ہیں' یحییٰ

صدر یحییٰ کے اس پیغام کا جواب اپنے فلیش سگنل نمبر اے۔ 1925,455 -07 بجے:

یہاں حالات قابو میں ہیں۔

(1) مغربی حصے میں پورے محاذ پر شدید جنگ جاری ہے۔

(2) دنیا کی طاقتیں انتہائی سنجیدگی سے فائر بندی عمل میں لانے کے لئے کوشاں ہیں۔ سیکورٹی کونسل میں سوویت یونین کے مسلسل ویٹو کرنے کے باعث معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک اعلیٰ سطح کا وفد نیویارک روانہ ہو چکا ہے۔ اس بات کا یقین رکھئے کہ میں اس ہولناک صورتحال سے پوری طرح آگاہ ہوں جس کا آپ کو سامنا ہے۔ میں نے چیف آف اسٹاف کو ہدایت کی ہے کہ وہ جنگی منصوبہ بندی اور حکمت عملی میں جنرل نیازی کی رہنمائی کریں۔ آپ اور آپ کی حکومت کو چاہئے کہ خوراک کی راشننگ میں انتہائی سختی سے کام لیں جنگ کی ہنگامی حالت کے تحت تمام ضروری اشیاء کی ترسیل میں کٹوتی کی جائے تاکہ مکمل ناکامی کو زیادہ سے زیادہ طویل عرصہ تک ٹالا جا سکے اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو ہم تمام دعا گو ہیں۔

کمیشن اس بات کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے حالانکہ صرف گورنر مالک کے پیغام سے ہی جنرل یحییٰ کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنا چاہئے تھا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج مکمل شکست سے دوچار نہیں ہوئی تھی تاہم اس کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔

اگر یحییٰ خان اس مرحلے پر بھی مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگی کامیابی حاصل کر کے بچا لینے کے اپنے منصوبے میں یقین رکھتے تھے تو انہیں اپنا جنگی ماسٹر پلان روبہ عمل لانا چاہئے تھا۔ اگر وہ اب بھی اپنے منصوبے کی کامیابی کے لئے طے شدہ موزوں جنگی حالات کی تلاش کے جنون میں مبتلا تھے' جیسا کہ اس رپورٹ میں کئی جگہوں پر محسوس کیا گیا' اور مشرق

پاکستان میں سرعت سے بگڑتی ہوئی صورت حال کے حوالے سے اپنے منصوبے کے لئے موزوں وقت کے انتخاب کی صلاحیت سے محروم ہورہے تھے تو سب سے ضروری بات یہ تھی کہ اقوام متحدہ میں اپنے سخت موقف پر نظر ثانی کی جاتی۔

بہر حال اسی دن جنرل اسمبلی نے غیر معمولی اکثریت سے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا جو ایک بے مثال کامیابی تھی اور یہ بات قابل فہم ہے کہ قدرتی طور پر اس دن پاکستان کے سپریم کمانڈروں اور صدر پاکستان کا مورال بہت بلند ہوگا۔ نامزد نائب وزیراعظم کو اقوام متحدہ روانہ کر دیا گیا۔ کم وبیش ساری دنیا پاکستان کی حمایت کر رہی تھی۔ لہٰذا 7 دسمبر ایسا دن نہیں ہوسکتا تھا جس دن یحییٰ خان اپنے رویے میں تبدیلی کے بارے میں سوچتے۔

لیکن 8 اور 10 دسمبر کے درمیان مشرقی اور مغربی دونوں حصوں میں پیدا ہونے والی صورتحال انتہائی مختلف تھی۔ 8 اور 9 دسمبر کے عرصہ میں فوجی صورتحال میں مزید ابتری آئی۔

جیسور سیکٹر کے دفاع پر مامور ہمارا ڈویژن فرید پور اور کھلنا کی جانب دشمن کے حملے کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور پسپا ہونا شروع ہوگیا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کھلنا اور منگلا میں موجود ہماری بحریہ کو حکم دیا گیا کہ وہ چٹا گانگ اور نارائن گنج کی طرف چلے جائیں۔ شمالی بنگال میں بوگرہ میں ہماری فوجی قلعہ بندی پر دشمن کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا دشمن تیزی سے دریائے تیستا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شمال مشرق میں دشمن نے سلہٹ کے قریب ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ایک بٹالین اتار دی تھی۔ برہمن باڑیہ سیکٹر میں وہ فورس جس نے بھیراب کو جانے والے راستے کو محفوظ کر رکھا تھا پسپا ہوکر اشوگنج اور دریائے میگھنا پر بھیراب پل تک پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں تری پورہ کی سرحد پر لکشم کے مقام پر گھرے ہوئے ہمارے دستے کومیلا گیریژن سے آملے اور چاند پور کو آنے والے راستے کو دشمن کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔

کمانڈر ان چیف پاکستان نیوی کو مشرقی پاکستان میں پاک بحریہ کے فلیگ آفیسر کمانڈنگ آفیسر کی طرف سے بھیجا جانے والا ایک سگنل جو 9 دسمبر کو مشرقی پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق شام کے چھ بج کر پچیس منٹ پر موصول ہوا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سگنل میں مشرقی کمان کے ہیڈکوارٹر میں پائی جانے والی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ پیغام کا متن اس طرح سے ہے۔

بدقسمتی سے ہماری بری فوج کا دفاعی حصار توقع سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔

مشرقی محاذ پر دشمن چاند پور پر قابض ہو چکا ہے اور یہاں موجود ملیارہ شکن رجمنٹ کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔

پیرا۔ 2 ساحلی وائرلیس سروس، ریلوے اور آبی راستوں کے ذرائع مواصلات اور رسل ورسائل بھارتی فضائیہ کی شدید بمباری اور باغیوں کی کارروائیوں کے باعث مکمل طور پر تباہ ہو چکے ہیں جس سے رسل ورسائل کا پورا نظام ٹھپ ہو چکا ہے۔ دفاعی حملوں کے باعث ہماری 25 ناٹ کی رفتار سے چلنے والی گن بوٹس بھابوک باریسال کے علاقے میں بکھر گئی ہیں۔ ہمارا جانی نقصان بہت زیادہ ہے جس کی فہرست تیار کی جارہی ہے۔ ہماری 60 فیصد بحری قوت عملاً ناکارہ ہو چکی ہے۔ بھارتی ہیلی کاپٹروں کے ذریعے فوج اتارنے کی اپنی صلاحیت کو پوری طرح استعمال کر رہے ہیں اور اب تک سلہٹ، بلی اور برہمن باڑیہ میں فوج اتاری جاچکی ہے۔

پیرا۔ 5 مشرقی کمان صوبے کے مختلف حصوں سے پسپا ہوتی ہوئی فوج کو ڈھاکہ کے دفاع کے لئے منظم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈھاکہ کو آخری قلعہ بندی کے طور پر منظم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو اسی صورت میں کامیاب ہوگی اگر حالات نے اس کی اجازت دی۔

پیرا۔ 6 ہمارے نیم مسلح ڈویژن جنہیں توپ خانے اور ٹینکوں کی بھی مدد حاصل نہیں ہماری محدود فضائی قوت جس کے پاس محض ایک ائیر فیلڈ ہے اور بحریہ جسے ہنگامی حالت میں میسر وسائل سے کھڑا کیا گیا ہے، مل کر دشمن کی زبردست یلغار کا عزم وحوصلے کے ساتھ مقابلے کر رہے ہیں لیکن انسانی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمزور پڑتی چلی جاتی ہے۔ اپنے ذاتی تجزیے کے مطابق اگر مثبت زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو جس تناسب سے گولہ بارود خرچ ہو رہا ہے جس کی ترسیل انتہائی محدود ہے، سامان رسد کے پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ادھر بھارت کی AMPHIBIOUS FORCES (پانی کے راستے سے خشکی پر حملہ آور ہونے والی فوج) تیزی سے ڈھاکہ پر مرکوز کر رہی ہیں انہیں بھارتی فضائیہ اور باغیوں کی مکمل مدد حاصل ہے۔ ان حالات میں ہماری دلیرانہ جدوجہد ایک ہفتے سے زیادہ دشمن کے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دشمن 9 دسمبر کی شام کو چاند پور میں دریائے میگھنا پر پہنچ چکا تھا
جو ڈھاکہ کے انتہائی قریب ہے۔

گورنر مالک کو فیصلہ کا اختیار

اسی دن (یعنی 9 دسمبر کو) گورنر مشرقی پاکستان نے صدر پاکستان کو اپنا دوسرا اہم پیغام بھیجا جس میں کچھ تجاویز کے بارے میں ان کی اجازت مانگی گئی تھی جن کے بارے میں فیصلہ صرف صدر کی طرف سے جواب کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا تھا۔ جوابی پیغام میں صدر نے کہا۔

''میں آپ کو اپنی جانب سے ان تجاویز پر فیصلے کا اختیار دیتا ہوں۔ ہماری ایک دوسرے سے مکمل دوری کے باعث مشرقی پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار میں آپ کی فہم و فراست پر چھوڑتا ہوں۔ میں ہر اس فیصلے کی توثیق کر دوں گا جو آپ کریں گے۔ شہریوں اور خاص طور پر پاک فوج کو بچانے کے لئے جس کا آپ نے اپنے پیغام میں خاص طور پر ذکر کیا ہے' آپ ہر طرح کا فیصلہ اور اقدامات کرنے میں آزاد ہیں۔ آپ اس مقصد کے لئے تمام سیاسی ذرائع استعمال میں لاتے ہوئے دشمن کے ساتھ معاملہ کریں۔''

ہمیں یہاں توقف کر کے جنرل یحییٰ کے پیغام کے مضمرات کا تجزیہ کرنا چاہئے جیسا کہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں حوصلے پست ہو جانے کی حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا اور زندگیاں بچانے کے لئے کسی بھی قسم کے اقدامات اور فیصلے کرنے کا اختیار دے دیا گیا لیکن یہاں یہ بات انتہائی قابل غور ہے کہ یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ ''آبرومندانہ تصفیہ اسی صورت میں ممکن ہے اگر آپ مزید ایک ہفتہ جنگ جاری رکھیں تاکہ اس عرصہ میں' میں اپنے ماسٹر پلان پر عملدرآمد کر سکوں''۔

پیغام میں ''سیاسی ذرائع'' کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ''دشمن کے ساتھ'' کے الفاظ معنی خیز ہیں۔ یہ بات انتہائی دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اس حقیقت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جنرل یحییٰ' شیخ مجیب الرحمٰن سے سیاسی تصفیہ کے کس قدر مخالف تھے۔ یحییٰ کی شخصیت میں موجود ذہنی انتشار حالات کی نزاکت کے حوالے سے انتہائی مایوس کن صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس بات کا جس طرح بھی تجزیہ کیا جائے مقامی سطح پر بھارت کے ساتھ سیاسی معاملہ طے کرنے کی

بات بے محل تھی۔ مشرقی پاکستان کی آزادی پر مبنی بھارتی مطالبات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ سیکورٹی کونسل میں روس نے وہ قراردادیں دوبارہ ویٹو کیں جن میں منتخب نمائندوں کے ساتھ سیاسی تصفیے کو نظرانداز کیا گیا تھا۔ یہ بات پوری طرح سے قابل فہم ہے کہ اگر گورنر نے اس پیغام سے یہ مطلب لیا کہ وہ جنگ کو بند کرنے کے لئے اپنی فہم و فراست کے مطابق کوئی بھی اقدام کرنے میں آزاد ہیں تو وہ درست تھے۔

اب ہمیں 10 دسمبر کو پیدا ہونے والی صورتحال پر نظر ڈالنی چاہئے یہی وہ دن تھا جب نیو یارک میں ایک انتہائی غیر متوقع پیغام موصول ہوا جسے میجر جنرل راؤ فرمان علی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ پیغام نیو یارک میں صبح پانچ بجے موصول ہوا اور سہ پہر تک یہ اقوام متحدہ میں گفتگو کا موضوع بن چکا تھا اور سیکورٹی کونسل کے صدر اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے پاس پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ یہ پیغام پاکستان کے سب سے اہم سفارتکار ذوالفقار علی بھٹو کے لئے شدید دھچکے کا باعث بنا جو اسی شام نیو یارک پہنچے تھے۔

میجر جنرل فرمان علی نے اپنے پیغام میں مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو شروط پرامن انتقال اقتدار کی پیشکش کی تھی اور جواب میں مشرقی پاکستان میں موجود مغربی پاکستانیوں کے تحفظ کی ضمانت مانگی تھی۔ یہاں جنرل یحییٰ خان کے پیغام میں موجود الفاظ اور اس پیغام میں موجود تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ اس پیغام کو اقوام متحدہ میں ہتھیار ڈالنے کی پیشکش تصور کیا گیا اس سے پاکستان کا کیس کمزور پڑ گیا جو پہلے اس وجہ سے انتہائی مضبوط تھا کہ پاکستانی فوج مشرقی پاکستان میں پورے عزم کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر رہی ہے۔

جنرل یحییٰ خان نے اس پیغام کو یہ بیان دے کر رد کر دیا کہ پاکستان صرف فائر بندی کے لئے بات چیت پر راضی ہے۔ اس میں سیاسی تصفیے کا کوئی ذکر نہیں۔

مشرقی پاکستان میں 10 دسمبر کو ہونے والا اہم واقعہ یہ تھا کہ بھارت نے ڈھاکہ سے صرف 25 میل دور نرسنگھدی کے مقام پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوج اتار دی جس نے اس علاقے میں مامور ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کی ایک کمپنی کو پکڑ لیا۔ اسی دن جنرل مانک شا نے پہلی دفعہ ایک اعلان کے ذریعے مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج سے ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا۔

ماسٹر پلان کا خاتمہ

مغربی پاکستان میں پاک فوج کی دو اہم فارمیشنز 33 ڈویژن اور 7 آرمڈ بریگیڈ گروپ' جو ہماری مرکزی حملہ آور فوج کا حصہ تھا' کو 2 کور سے الگ کر کے شکر گڑھ اور راجستھان کے محاذوں پر بھیجنے کا حکم دیا گیا جہاں ہماری پوزیشن بہت خراب ہو چکی تھی۔

اس طرح مغربی پاکستان کی طرف سے جوابی حملے میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی 2- کور کی قوت اور صلاحیت میں زبردست کمی واقع ہوگئی اور اس حملے کی کامیابی کے امکانات بھی معدوم ہوگئے۔

دسمبر کو ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ بھارت نے ڈھاکہ کے شمال مغرب میں 40 میل کے فاصلے پر ایک پورا پیرا بریگیڈ اتار دیا۔ بالکل اسی وقت ہمارا 93 ایڈ ہاک بریگیڈ ڈھاکہ کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لئے میمن سنگھ سے ڈھاکہ کی جانب پسپا ہو رہا تھا یہ بریگیڈ سیدھا بھارت کے پیرا بریگیڈ میں جا گھسا۔ بتایا گیا ہے کہ بعد ازاں 12 اور 13 دسمبر کو اس بریگیڈ کے تقریباً 9 سو افسر اور جوان ڈھاکہ پہنچ گئے۔

دسمبر ہی کے دن ذوالفقار علی بھٹو نے' جو اب تک پوری صورتحال کا اچھی طرح سے مطالعہ کر چکے تھے' صدر کو ایک تار (No.513) بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر ایک ہفتہ تک جنگ جاری رکھی جائے اور اگر ممکن ہو تو جنگی صورتحال میں بہتری پیدا کر لی جائے' جو ناممکن نہیں' تو مجھے یقین ہے کہ صورتحال دوبارہ ہمارے حق میں ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھٹو کے نزدیک کم از کم 14 دسمبر تک ہمیں ہر حالت میں مشرقی پاکستان کو بچائے رکھنا تھا۔ اس پیغام کے جواب میں جنرل یحییٰ نے لکھا کہ محض ایک ہفتے تک لڑائی جاری رکھنا بھی مہلک ثابت ہوگا اور جہاں تک مغربی پاکستان کی طرف سے بڑے حملے کا تعلق ہے تو یہ معاملہ ملٹری کمانڈر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بھٹو نے 12 دسمبر کو ایک اور ٹیلی گرام میں صدر یحییٰ سے درخواست کی تھی کہ وہ فوراً چین جائیں اور پاکستان کو بچانے کے لیے مداخلت کی درخواست کریں' اسی دوران 13 دسمبر کو رات کے سات بج کر پچاس منٹ پر مشرقی کمان کی طرف سے ایک اور پیغام پہنچا جس میں صورتحال کو

انتہائی نازک قرار دیا گیا تھا اور درخواست کی گئی تھی کہ کسی طرح کی بیرونی مداخلت کو 14 دسمبر تک ہر حال میں عملی شکل اختیار کر لینی چاہئے۔

دشمن نے 12 اور 13 دسمبر نرسنگھ دی کے علاقے میں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے فوج اتار کر پوزیشنیں مستحکم کرنا شروع کر دی تھیں۔

طفلانہ رویّہ

14 دسمبر کو 0036 بجے چیف آف اسٹاف نے مشرقی کمان کے تار کے جواب میں لکھا کہ اقوام متحدہ کے سیکورٹی کونسل معاملے پر غور کر رہی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ فائر بندی کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اب صرف چند گھنٹوں کی بات ہے اقوام متحدہ کی قرارداد منظور ہونے تک ڈٹے رہیں لیکن اس کے بعد اسی روز جنرل یحییٰ خان نے گورنر اور مشرقی کمان کے کمانڈر کو 1323 بجے سگنل نمبر G-0013 ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ آپ ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جہاں انسان کے لئے مزید مزاحمت ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جنگ بند کرنے اور فوجیوں کی زندگیاں بچانے کے لئے تمام تر اقدامات کئے جائیں۔ ان لوگوں کو بھی بچانے کی کوشش کی جائے جو مغربی پاکستان سے آئے ہوئے ہیں یا جو پاکستان کے حامی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے فائر بندی کے لئے مذاکرات کی اجازت دے دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر کو اب بھی یہ بچگانہ یقین تھا کہ وہ محض فائر بندی کے لئے مذاکرات کی اجازت دے رہے ہیں سیاسی تصفیے کے لئے نہیں (اس کا حوالہ جنرل یحییٰ کے کمیشن کے روبرو بیان میں موجود ہے)۔

مشرقی کمان یہ اطلاعات دے رہی تھی کہ دشمن تنگائل' نرسنگھ دی اور چاند پور سمیت کئی اطراف سے ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بھارتی فضائیہ کے حملوں میں مزید تیزی آ گئی ہے اور اس کے ایک حملے نے جیدا دپور کا ایمونیشن ڈپو اڑا دیا ہے۔

فوجی صورتحال اور پیغامات کے تبادلے پر مبنی اس طویل تجزیئے کا مقصد یہ ہے کہ اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر جب صورتحال ہر روز اور ہر گھنٹے تبدیل ہو رہی تھی ہماری جنگی حکمت عملی کا ہمارے سیاسی فیصلوں' سفارتی سرگرمیوں اور اقوام متحدہ میں جاری سرگرمیوں سے ہم آہنگ ہونا انتہائی ضروری تھا۔ اپنے سے پوچھے گئے ان دو سوالوں

کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا جنرل یحییٰ نے اس انتہائی پر آشوب دور میں حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہوئے ایسی ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا یا نہیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس وقت اقوام متحدہ میں کیا ہو رہا تھا۔ 11 دسمبر کو بھٹو نے امریکی اعلیٰ سفارتکاروں اور چین کے نائب وزیر خارجہ سے بات چیت کی تا کہ اپنے موقف کے حوالے سے تضاد کو طے کیا جا سکے اور معاملے کو جلد از جلد دوبارہ سیکورٹی کونسل میں لے جانے کے لئے مشترکہ حکمت عملی طے کی جا سکے کیونکہ مشرقی پاکستان میں ہماری فوجی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ سیکورٹی کونسل کا اجلاس اسی دن منعقد ہو اور جنرل اسمبلی کی قرارداد سے ملتا جلتا قرارداد کا مسودہ پیش کیا جائے جس میں فوری جنگ بندی اور فوجوں کی واپسی پر زور دیا گیا ہو۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس مرحلے پر بھی سیاسی تصفیے کی بات ہمارے زیر غور نہ تھی۔ امریکہ کی ہنگامی درخواست پر سیکورٹی کونسل کا اجلاس اتوار 12 دسمبر کی سہ پہر کو پھر ہوا۔

اقوام متحدہ میں ہمارے سفیر آغا شاہی کے مطابق ''سیکورٹی کونسل کی 12 دسمبر کی کارروائی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ پاکستانی صدر کی سیاسی تصفیے اور اختیارات کی منتقلی کے بغیر فائر بندی کی امید بھارتی وفد کی نظر میں بالکل غیر حقیقت پسندانہ تھی اور اس کی بنیاد پر ڈھاکہ کی لڑائی میں بھارتی فوج کی فتح کا یقین اور سوویت یونین کا یہ عزم تھا کہ وہ ہر اس حل کی مخالفت کرے گا جس میں بھارت کی فوجی فتح کے فوائد شامل نہ ہوں۔

باہمی ہم آہنگی کے فقدان کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ 12/13 دسمبر کو سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں صورتحال کسی طرح بھی امید افزا نہیں تھی۔ قبل ازیں سوویت یونین دو دفعہ قراردادوں کو ویٹو کر چکا تھا۔ اس کے باوجود چیف آف اسٹاف نے اوپر بیان کئے گئے مشرقی کمان کو اپنے سگنل میں کہا تھا کہ ''جنگ بندی محض چند گھنٹوں کی بات ہے'' اگر اس سگنل کو لڑتی ہوئی فوج کا مورال بڑھانے کا ایک حربہ قرار دیا جائے تو اگرچہ یہ فوج کے لئے ایک طرح کی حوصلہ افزائی کا تاثر رکھتا ہے لیکن لڑائی میں مصروف سپاہی کے نقطہ نظر سے ایسے پیغامات کے باعث لڑنے کے عزم میں کمی واقع ہوتی ہے۔

سیکورٹی کونسل نے 13 دسمبر کی سہ پہر اپنے اجلاس نمبر 1613 میں بحث مباحثہ جاری رکھا (جو کہ مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق 14 دسمبر کی ابتدا کا وقت تھا) اس وقت تک سیکورٹی کونسل بھارت کے اس دعوے پر یقین کر لینے کی طرف مائل ہو چکی تھی کہ سقوط

ڈھاکہ کسی وقت بھی متوقع ہے۔ ہمارے وفد کے ایک رکن نے ایک بھارتی نمائندے کو سوویت نمائندے سے یہ کہتے سنا کہ اجلاس کی کارروائی 17/18 دسمبر تک روک دی جائے کیونکہ اس دن تک ڈھاکہ پر قبضہ ہو جانا یقینی ہے۔

امریکہ کی قرارداد جسے قرارداد (S/10446Ref.1) میں معمولی تبدیلی کر کے تیار کیا گیا تھا پر 13 دسمبر کو بحث ہوئی لیکن روس نے اسے ویٹو کر دیا جو کہ اس کی طرف سے تیسری بار تھا۔ اس نازک وقت پر جب ایک طرف مشرقی محاذ پر شکست ہو چکی تھی اور دوسری جانب روس ہر اس قرارداد کو ویٹو کر رہا تھا جس میں مشرقی پاکستان کے معاملے کے سیاسی تصفیے کی بات شامل نہیں تھی جنرل یحییٰ خان کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے تھی کہ سقوط مشرقی پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں۔ عزت بچانے کا واحد راستہ یہ تھا کہ اقوام متحدہ کے ذریعے مسئلے کے سیاسی حل سے اتفاق کر لیا جاتا۔ اس کے بجائے انہوں نے گورنر مالک کو جنگ بند کرانے کے تمام اختیارات سونپ دیئے۔

جنرل یحییٰ خان نے 7 دسمبر کے بعد صورتحال پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل کے باہمی تعلق کو نہ سمجھ کر اگر مشرقی پاکستان میں لڑائی جاری رکھنے کے عزم کو براہ راست متاثر نہیں کیا تو وہ حالات کی سنگینی سے صرف نظر کرنے کے مرتکب ضرور ہوئے ہیں۔

یہ بات 7 دسمبر کو گورنر مشرقی پاکستان کو بھیجے جانے والے ان کے پیغام اے۔ 4555 اور 14 دسمبر کو بھیجے جانے والے پیغام G-0013 سے ظاہر ہوتی ہے جن کا ذکر پیرا 72 اور 79 میں موجود ہے۔

مغربی محاذ پر وہ اپنے ماسٹر پلان کو روبہ عمل نہ لا سکے ان کی اہم ترین حملہ آور فوج میں سے ایک ڈویژن اور ایک آرمرڈ بریگیڈ راجستھان' چھمب اور شکر گڑھ کے دفاع کے لئے بھیج دیا گیا تھا جس سے اس فارمیشن کی قوت ضرب ختم ہو چکی تھی۔ شکر گڑھ میں ہم جنگ ہار رہے تھے یہاں پر ریزرو فورس کو جھونک دینے کے باوجود بھی حالات سنبھلنے کی توقع کم تھی۔ محدود نوعیت کے بڑے حملے کا جو جنوب کی طرف سے ایک آرمرڈ اور ایک انفنٹری ڈویژن کی مدد سے کیا جانا تھا انتظار ہی رہا جنرل یحییٰ کے مطابق اس فورس کو شکر گڑھ میں بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر استعمال نہیں کیا گیا۔

جب مغربی پاکستان سے بڑے پیمانے پر حملے کا منصوبہ کارگر نہیں رہا تھا تو اقوام متحدہ کے سوا وہ کون سا ذریعہ تھا جس کی مدد سے پاکستان کو بچایا اور ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بچا جا سکتا تھا۔

عزت بچانے کے مواقع

اصل بحران یحییٰ خان کی جانب سے سیاسی تصفیے سے مسلسل انکار کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ ہم پہلے اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ جنرل یحییٰ کو بہت باخبر ہو جانے کے بعد آخری لمحات میں بھی اپنے ماسٹر پلان کے کارگر ہونے کا یقین تھا اور وہ اسے ترک کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ 7، 8 اور 9 دسمبر کو ان کے رویہ میں بنیادی تبدیلی آنے کی توقع حقیقت پسندانہ نہیں کیونکہ اس وقت تک ان کی اصل حملہ آور قوت ان کے پاس محفوظ تھی لیکن 10 دسمبر کو تو انہوں نے خود اس فورس کو توڑ دیا تھا اور اس کا تیسرا حصہ نکال کر دوسرے محاذوں پر بانٹ دیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے سامنے جنرل یحییٰ بحران کے دنوں میں اپنی غیر حقیقت پسندانہ روش کو درست قرار دینے میں ناکام رہے۔

اب ہم ان مواقع کا جائزہ لیتے ہیں جو 10 دسمبر کے بعد پاکستان کو اپنی عزت بچانے کے لئے ملے تھے کہ وہ حملہ آور بھارتی فوج کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اقوام متحدہ کے حکم پر جنگ بند کر دیتا۔ ہم اس بات کا فرق واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری دنیا کی نامور فوج اب تاریخ میں ایسی فوج کے طور پر یاد رکھی جائے گی جسے جنگ میں شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے 90000 فوجی، ٹینکوں، توپوں، اسلحہ، پارٹی کے جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ساتھ قیدی بنا لئے گئے۔ دوسری صورت میں وہ ایسی فوج کے طور پر یاد کی جاتی جو جنگ میں اس وقت تک تمام مشکلات کے باوجود لڑتی رہی جب اقوام متحدہ نے غیر معمولی ووٹوں کے ذریعے ان کے صحیح مقصد کو تسلیم کرتے ہوئے دخل اندازی کی اور جنگ بندی کرا دی اس صورتحال میں سیاسی اور بین الاقوامی فائدے بھی حاصل ہو سکتے تھے۔ اس طرح پاکستان جمہوریت کے اصولوں کی تائید کرتے ہوئے سیاسی تصفیے کے لئے 70 ملین لوگوں کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرتا۔

اس طرح کا پہلا موقع 13 دسمبر کی دوپہر کو آیا جب ہم اقوام متحدہ کی جانب اپنا رویہ تبدیل کر کے اس وقت سیاسی تصفیے کے لئے راضی ہو جاتے جب روس نے تیسری بار ویٹو

استعمال کیا تھا۔ فرانس اور برطانیہ نے جنگ روکنے کے لئے ایک نئی قرارداد تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس میں فوجوں کی واپسی اور انصاف یعنی سیاسی تصفیے کی یقین دہانی شامل تھی۔ ان کے خیال میں یہ قرارداد تمام اراکین کے لیے قابل قبول ہوتی روس اور بھارت سمیت لیکن اقوام متحدہ میں ہمارے مندوب کو دی جانے والی ہدایات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جہاں تک ہمارے نمائندوں کا تعلق ہے انہیں سیاسی حل کی کسی تجویز کی بھی مخالفت کرنا تھی۔

اسی دوران اطالوی نمائندے نے ایک نئی قرارداد پیش کر کے حیرت میں ڈال دیا تھا جس میں جنگ کو فوری طور پر روکنے کو کہا گیا اور فوجوں کی واپسی اور سیاسی حل کی تجویز بھی تھی ہم نے اطالویوں سے درخواست کی کہ وہ اسے پیش نہ کریں کیونکہ ہمیں اپنے ملک سے ہدایات کا انتظار ہے مگر جب اطالویوں نے یہ قرارداد پیش کر دی تو ہم نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔

دوسرا بڑا موقع 15 دسمبر کو 7 بجے شام ملا تھا (پاکستان کے وقت صبح 4 بجے) جب کئی قراردادیں پیش کی گئی تھیں جن میں شام کی قرارداد (S/10456) برطانیہ اور فرانس کی قرارداد (S/10455) سوویت یونین کی (S/10457) اور پولینڈ کی (S/10457) شامل تھیں۔ ان تمام قراردادوں میں اور شام کی قرارداد میں بھی سیاسی تصفیے پر زور دیا گیا تھا۔ روس کے ڈرافٹ میں فوجوں کی واپسی کا ذکر نہیں تھا لیکن شام، فرانس اور برطانیہ کی قراردادوں میں جنگ بندی کے بعد فوجوں کی واپسی کا بھی ذکر تھا۔ برطانیہ نے اقوام متحدہ میں ہمارے نمائندوں کو مشورہ دیا کہ چونکہ مشرقی پاکستان میں ہم ہتھیار ڈالنے والے ہیں لہٰذا اس قرارداد میں فوجوں کی واپسی کا ذکر نہیں ہو سکتا البتہ جنگ بندی اور جنیوا کنونشن کی پابندی پر زور دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی تصفیے پر رضامند نہیں تھے مگر ہمارے ہتھیار ڈالنے سے ہمارا معاملہ خراب ہو رہا تھا۔

اس سوال کا دوسرا حصہ اب بھی جواب طلب ہے کہ کیا ہم 16 دسمبر کو ہتھیار ڈالنے کے بجائے کچھ اور انتظار کر سکتے تھے پہلے ہم "کچھ اور وقت" کی تشریح کریں گے۔ ہم فوجی صورتحال کا تو پہلے جائزہ لے چکے ہیں جو زیادہ امید افزا نہیں تھی لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ڈھاکہ گیریزن کے مقابلہ کرنے کا تو موقع ہی نہیں آیا، یہ سی او ایس آرمی کی اجازت کے ذریعے عمل میں آیا تھا جو 15 تاریخ کو رات گیارہ بج کر پچاس منٹ پر سگنل نمبر 15 کے ذریعے آئی تھی کہ مشرقی کمان جنگ بندی کے لئے بھارتی فوج کی شرائط قبول کر سکتی ہے جن کا مطلب ہتھیار

ڈالنا تھا۔ اس وقت صورتحال نہایت سنگین تھی مگر ڈھاکہ کے قریب بھارتی فوج کی نفری صرف دو بریگیڈ تھی۔

ایک بریگیڈ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے نرسنگھدی میں جو 25 میل کے فاصلے پر تھا 10 دسمبر کو اترا تھا دوسرا بریگیڈ پیراشوٹ کے ذریعے 11 دسمبر کو تنگائل میں اترا تھا جو ڈھاکہ سے 40,35 میل دور ہوگا۔ یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ ہیلی کاپٹر یا پیراشوٹ سے اترنے والے فوجی کمزور ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ہلکے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے فائرنگ کی جا سکتی ہے۔ ان کی آرٹلری بھی ہلکی توپوں پر مشتمل ہوتی ہے ان کے پاس ٹینک بھی نہیں ہوتے صرف جیپیں ہوتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ (15 cwt) ٹرک ہوتے ہیں۔ اس لئے ٹرانسپورٹ کے لیے وہ مقامی دوستوں پر انحصار کر رہے تھے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اترنے کے بعد فوری طور پر ان کی ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ثبوت بھی نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارتی کمانڈر نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارا حوصلہ ٹوٹ چکا ہے لہٰذا انہوں نے ڈھاکہ کی طرف بڑھنے کی کوئی جلدی نہیں کی کہ جانی نقصان کے بعد وہ وہی نتیجہ حاصل کرتے جو انہوں نے نفسیاتی دباؤ اور دوسری طرح کے دباؤ سے حاصل کر لیا۔

یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ اگر یہ دونوں بریگیڈ ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دیتے تو موٹر گاڑیوں اور ٹرکوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں توقع تھی کہ فیصلہ کن دفاع اور خونریز لڑائی کا سامنا کرنا ہوگا۔ لہٰذا وہ نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے جس کی بناء پر ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے میں مزید وقت درکار ہوتا' وہ اپنی پیش قدمی کو دوسرے پیش قدمی کرنے والے دستوں سے مربوط کرتے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے بھارتی فوج کا کوئی کالم بھی جیسور' کھلنا' بوگرا یا اور کسی مشرقی علاقے سے ان بڑے دریاؤں کی ڈھاکہ سمت میں نہیں تھا جنہیں اگر بلا مقابلہ بھی عبور کیا جاتا تو اس میں کافی وقت لگ جاتا۔

اب ہم بھارتی افواج کے ساتھ ڈھاکہ میں ہونے والے مقابلے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ دفاع کی ایک باقاعدہ اسکیم موجود تھی ایک بیرونی دفاعی حصار تھا اور ایک اندرونی حصار تھا۔ صرف 900 افراد جو دو نامکمل بٹالینوں کے تھے دشمن کے ایک پیرا بریگیڈ سے مقابلے کے بعد ڈھاکہ پہنچے تھے اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ باقی فوج مختلف انتظامی یونٹوں کا حصہ تھی جن میں ایک ہزار ائیر مین اور کچھ نیوی کا عملہ شامل تھا لیکن یہ

سب ہی فوجی تھے اور انہیں ذہنی طور پر لڑنے کے لئے تیار رہنا چاہئے تھا۔ ڈھاکہ میں موجود ہماری فوجوں کی صحیح تعداد کا تعین کرنا مشکل ہے لیکن ہمارا اندازہ مندرجہ ذیل ہے۔

ڈھاکہ میں اس وقت ریگولر فوجیوں کی تعداد 5000 تھی جن میں سے زیادہ تر کا تعلق مقامی ہیڈکوارٹرز' سگنلز' سروس یونٹس' اور ریزرو دستوں سے تھا پاکستان نیوی اور پاکستان ائیر فورس میں افسروں اور جوانوں سمیت کل 700 افراد تھے مقامی طور پر بھرتی کی ہوئی ایسٹ پاکستان کی سول آرمڈ فورسز' مجاہدوں اور رضاکاروں کی تعداد 13000 تھی اور ایسٹ پاکستان پولیس' انڈسٹریل اور وی پی سیکورٹی فورسز کے 4000 افراد تھے۔ اس کے علاوہ ایسٹرن کمانڈ کی رپورٹس کے مطابق 93 (ایڈ ہاک) بریگیڈ جس میں تقریباً 900 افراد تھے موجود تھا جن میں ریگولر یونٹس اور سول آرمڈ فورسز کے افراد شامل تھے یہ عملہ مومن شاہی سے 12 اور 13 دسمبر کو ڈھاکہ پہنچا۔ اس طرح عملے کے تمام افراد شامل کر کے کل تعداد 24000 تھی لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس تعداد کو ڈھاکہ کا دفاع کرنے کے لئے گروپوں اور ایڈہاک یونٹس میں کس طرح تقسیم کیا گیا تھا۔

اس عملے کے ساتھ ان کے ہتھیار بھی ہوں گے اور ان کے پاس چھوٹے ہتھیاروں اور ایمونیشن کی کمی بھی نہیں ہوگی کیونکہ ڈھاکہ ہی یہ سامان مہیا کرنے کا مرکز تھا لیکن بھاری اسلحہ کے بارے میں صورتحال واضح نہیں ہے اس بھاری اسلحہ میں 37 ایم ایم کی (سنگل بیرل) اینٹی ائیرکرافٹ گنیں تھیں جو مقامی اے اے رجمنٹ کے پاس تھیں اور انہوں نے بھارتی ائیر فورس کے خلاف ڈھاکہ کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ شروع میں 36 گنز تھیں جن میں سے کچھ خراب ہو گئیں یہ تیز فائر کرنے والی گنز تھیں جن کی رینج 4000 گز تک تھی۔ یہ دشمنوں کی گاڑیوں اور ٹینکوں کو براہ راست نشانہ بنانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں ایل اے اے رجمنٹ کا دوسرا ہتھیار 14.5 ایم ایم کی 12 گنز تھیں جو زمین پر بھاری مشین گن کے طور پر استعمال ہوتی تھیں ان دونوں قسم کے اسلحہ کے لئے ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔

اس موقع پر ڈھاکہ آرڈیننس ڈپو میں ریزرو میں کچھ ٹینک اور مارٹر موجود تھے اور اگر یہ قابل استعمال حالت میں ہوتے تو انہیں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ واقعی موجود تھے اور انہیں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

اسٹالن گراڈ' کی کہانی سننے کے بعد جسے فوجی حلقوں میں اکثر دہرایا جاتا ہے' ہم

سوچتے ہیں کہ بھارت کے دو بریگیڈ کی ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کا مقابلہ بیرونی حصار سے فائر کر کے کیا جاسکتا تھا اور بھارتیوں کو عارضی طور پر روکا جاسکتا تھا۔ شہروں کا فتح کرنا مشکل ہوتا ہے اگرچہ ہمارے ذہن میں یہ بات بھی ہے کہ ہماری فوج زد میں تھی اور اس پر پیچھے سے بھی حملہ ہوسکتا تھا ہم سمجھتے ہیں کہ بھارت کے یہ دو بریگیڈ ڈھاکہ کے بیرونی حصار میں دوسرے دن تک داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے اس پر کم از کم 24 گھنٹے کی تاخیر تو ہوسکتی تھی پھر جاکر وہ اس حصار میں داخل ہوتے اور اسی طرح اندرونی حصار میں معرکہ ہوتا تو مزید 24 گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی اس طرح کل 48 گھنٹے کی تاخیر ہوتی اور ارادہ مصمم ہوتا تو اس تاخیر کو دگنا یا تین گنا بھی کیا جا سکتا تھا۔

صرف 48 گھنٹے درکار تھے

اپنے سروے کے دوران ہمیں معلوم ہوا کہ اس وقت نیویارک میں ایک سے زیادہ قراردادیں تیار تھیں جن کے ذریعے ہم اپنی عزت بچاسکتے تھے جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے اور ڈھاکہ کے ہمارے بہادر فوجی یہ تاثر دے سکتے تھے جیسا کہ جنرل نیازی نے کہا تھا ''دشمن ہماری لاشوں سے گزر کر ہی ڈھاکہ میں داخل ہوسکتا ہے۔''

ہمیں یقین ہے کہ اگر 72 گھنٹوں کی نہ سہی صرف ہماری فوج کی طرف سے 48 گھنٹوں کی تاخیر بھی کردی جاتی تو ہمیں موقع مل جاتا کہ ہم اس ذلت ناک شکست سے اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے ذریعے بچ جاتے جیسے انگلستان اور فرانس کے منصوبے کی قرارداد جس کے منظور ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا کیونکہ روس تین بار ویٹو استعمال کر چکا تھا اور اب اس کی دخل اندازی کا امکان نہیں تھا بشرطیکہ سیاسی حل کے لئے رضامندی ظاہر کردی جاتی۔ اس کے علاوہ روس کے پاس ایک اور قرارداد تھی جو اس شکست سے تو بہتر ہوتی۔

افسوس یہ نہ ہوا اور یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا ''اگر'' بن کر رہ گیا ہے۔

نتائج

بڑی طاقتوں اور دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کا جائزہ لینے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب ہم اس لائق ہیں کہ ان دو سوالات کا جواب دے سکیں جو پاکستان کے لوگوں کے ذہن میں ہماری بیرونی پالیسی کے سلسلے میں پیدا ہوئے ہیں۔

(a) کیا پاکستان کے ٹکڑے کرنے کے لئے کوئی غیر ملکی سازش تیار کی گئی تھی اور کیا یحییٰ خاں کی حکومت بھی اس سازش کا حصہ تھی۔

(b) اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو پھر کیا دنیا کے ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اور معاہدے جنرل یحییٰ خان کے اس اعتماد کو حق بجانب قرار دے سکتے ہیں جس کی بنیاد پر انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کو اس بربادی کی جنگ میں جھونک دیا۔

ہمارے سامنے نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما خان عبدالولی خان' کونسل مسلم لیگ کے رہنما سردار شوکت حیات خان جیسے سیاسی رہنماؤں اور اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی جیسے صحافیوں نے بیان دیا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کا زوال' یحییٰ خان کے ہاتھ میں اقتدار کی منتقلی اور آخر میں ان کی پالیسی کی وجہ سے پاکستان کے ٹکڑے ہونا بعض سپر طاقتوں کی سازش کا حصہ تھا۔

صحافیانہ انداز سے کئے گئے تجزیے میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے لیکن ایک عدالتی ٹربیونل کی حیثیت سے ایسے نتیجے پر پہنچنے کے لئے ہم تیار نہیں ہوسکتے۔

ہمارے سامنے موجود بہت زیادہ شہادتوں کے جائزے کے بعد جو حقیقت ابھر کر

سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو رہنما 1947ء سے ہی پاکستان کے تصور کے خلاف تھے۔ بھارتی رہنما پاکستان قبول کرنے پر صرف اس وقت رضامند ہوئے جب یہ واضح ہو گیا کہ برطانیہ اہل ہند کو اقتدار منتقل کرے گا تو ایسی حالت میں تقسیم ناگزیر ہے جن مسائل کی وجہ سے برصغیر بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوا انہیں مساوات اور انصاف کے خوش گوار طریقے سے حل کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ بھارتی رہنما فیاضی وسیع النظری اور پاکستان کو تسلیم کرنے کا مظاہرہ کرتے۔ پاکستان کے قیام کو روکنے میں ناکام ہونے کے بعد بھارتی رہنماؤں نے ہر ممکن طریقے سے پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ ایشیا میں بلاشرکت غیرے برتری حاصل کرنے کے خواب کو حقیقت بنا سکیں۔ 1965ء میں بھارت نے پاکستان کو ایک فیصلہ کن شکست دینے کا منصوبہ بنایا تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنی برتری قائم کر سکے اور پاکستان کو اپنا طفیلی ملک بنا دے۔

بھارت نے صرف ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھایا

بھارت نے پاکستان کے دونوں بازوؤں کو جدا کرنے کو اپنی منزل بنا لیا تھا جسے ایسے ہی حالات میں حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے اندرونی اختلافات اور عوامی لیگ کی طرف سے خود مختاری اور بعد میں آزادی کے پرتشدد مطالبات نے بھارت کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا۔

اس پس منظر میں پاکستان نے اپنی سلامتی اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے کئی بین الاقوامی انتظامات کئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح اپنے تحفظ کی ضمانت کے لئے پہلے ہمیں اقوام متحدہ میں جانا پڑا پھر ہم امریکہ کی گود میں بیٹھ گئے اور ہم مختلف دفاعی معاہدوں میں شامل ہو گئے۔ ہماری ضروریات امریکہ کی کمیونسٹ چین کو حدود کے اندر رکھنے کی مغربی پالیسی سے مطابقت رکھنے لگیں۔ 1962 میں امریکی پالیسی میں تبدیلی آ گئی اور اس نے پاکستان کے احتجاج کے باوجود بھارت کو اسلحہ دینا شروع کر دیا۔ یہ عالمی ضروریات کا نتیجہ تھا اور اس کی وجہ ہماری طرف سے کسی کوتاہی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

چین اور روس ہمارے عظیم پڑوسی ہیں۔ ان کے ساتھ معمول کے تعلقات کی ہماری خواہش کا اس لئے مثبت جواب دیا گیا کہ ہماری ضروریات ان ممالک کی عالمی پالیسی سے مطابقت رکھتی تھیں لیکن یہ صورتحال زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکی کیونکہ چین اور روس کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور چین اور امریکہ کے درمیان مفاہمت کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ چین کے ساتھ ہماری

مستقل دوستی کو روس شک کی نظر سے دیکھنے لگا اور بھارت کی طرف اس کا جھکاؤ مزید بڑھ گیا تا کہ وہ ایشیا میں چین کے اثر کا تدارک کر سکے۔ بھارت کو روس کی امداد 9 اگست 1971ء کے معاہدے کے ذریعے عروج پر پہنچ گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روس نے ایشیا کے تحفظ کے لئے جو انتظام کیا ہے یہ اسی کا حصہ ہے اور اس کا مقصد پاکستان کو مٹانا نہیں ہے۔

بھارت کی دشمنی سے واقف ہونے اور ایک سپر طاقت کے ساتھ اس کا تعلق دیکھ لینے کے بعد پاکستان کو چاہئے تھا کہ وہ ایک ایسی صورت حال سے اجتناب کرے جس سے بھارت کو پاکستان کے خلاف ایک ایسی جنگ لڑنے کا موقع مل جائے جس میں وہ روس کا دیا ہوا اسلحہ استعمال کر سکے۔ جب ایک بار بھارت اور پاکستان اپنی باہمی دشمنی کی وجہ سے اور مشرقی پاکستان کے واقعات کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے خونریز جنگ میں الجھ گئے تو روس بھارت معاہدے کے تحت بھارت کو دی گئی امداد کو کس طرح بین الاقوامی سازش قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ روس ایک سپر پاور اور بھارت کا اتحادی ہونے کے تعلق سے اسے پاکستان کے اندرونی معاملے میں دخل اندازی سے باز رکھ سکتا تھا اور ایک چھوٹے پڑوسی پر حملہ کرنے سے روک سکتا تھا لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا یا وہ ایسا کرنے پر رضامند نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اسے یقین تھا کہ پاکستان کی فوجی حکومت مشرقی پاکستان کے بحران کو حل کرنے کے مشورے پر توجہ نہیں دے گی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ہمارے دوست ملک جیسے چین امریکہ ایران ترکی اور انگلستان بھی سب ہی یحییٰ خان کو مشورہ دے رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کے منتخبہ نمائندوں کے ساتھ مسئلہ طے کر لیں لیکن ایسا کرنے کے بجائے صدر ایک ایسے سیاسی حل کی طرف گامزن ہو گئے جسے اس صوبے کے عوام کی طرف سے قبول کئے جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ حالات یہ تھے اور مشرقی پاکستان میں بے چینی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس بے چینی کی وجہ سے ہجرت کرنے والے افراد کے مسئلے نے شدت اختیار کر لی اور تباہ کن حالات تیزی سے پیدا ہونے لگے۔ مشرقی پاکستان میں یحییٰ خان کی غلطیوں کو معاف نہیں کیا جا سکتا اور بین الاقوامی صورتحال کو یہ کہہ کر کہ یہ بین الاقوامی سازش تھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے بھارت اور پاکستان کے حالات برابر خراب ہوتے رہے اور بھارت نے روس کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کر لیا تھا۔ جنرل یحییٰ خان چین یا امریکہ سے بھارت کے حملے کی صورت میں فوجی مدد کا وعدہ حاصل نہ کر سکے۔

(رپورٹ کے پیرا 9 سے 11 تک کو شائع نہیں کیا گیا)۔

سیاسی حل کی دہشت

جہاں تک اقوام متحدہ کے کردار کا سوال ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں اگرچہ یہ ادارہ پاکستان کو روس کے ویٹو کی وجہ سے دو ٹکڑوں میں بٹنے سے نہیں روک سکا لیکن اگر یہ مسئلہ مغربی پاکستان سے مکمل جنگ چھیڑنے کے بجائے 21 نومبر 1971ء کو بھارت کے حملے کے بعد فوری طور پر سلامتی کونسل میں لے جایا جاتا تو نتیجہ مختلف ہوتا۔ سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ نہ لے جانے کی وجہ یہ تھی کہ یحییٰ خان کو خوف تھا اس مرحلے پر بڑی طاقتیں مشرقی پاکستان کے مسئلے کو سیاسی طور پر حل کرنے پر زور دیں گی اور مغربی پاکستان میں کامیابی حاصل کرنیکے بارے میں ان کی توقع بھی غلط تھی اس طرح حالات کی ابتری کی وجہ سے انہیں دونوں معاملات میں ناکامی ہوئی۔

13- اس مسئلے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اگر مشرقی پاکستان میں تعینات جنرل 10 دسمبر 1971ء ہی سے مایوسی اور شکست کے پیغام بھیجنا شروع نہ کر دیتے اور جنرل یحییٰ خان پاکستان کا صدر اور افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے زیادہ عزم اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشرقی کمانڈر کو حکم دیتے کہ وہ 16 دسمبر کے بعد بھی مقابلہ کرتے رہیں تو پاکستان کے دوست اس لائق ہو جاتے کہ وہ سلامتی کونسل میں ایک اطمینان بخش قرارداد منظور کرا لیتے جس میں جنگ بندی کا حکم دیا جاتا۔ 10 اور 15 دسمبر کے درمیان مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ فوجی صورتحال پاکستان کے حق میں نہ تھی لیکن اس وقت تک ڈھاکہ کے تحفظ کے لئے بھارت کی فوج کے ساتھ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی۔ اگر جی ایچ کیو سے مناسب ہدایات ملتیں اور مشرقی کمانڈ کچھ دانشمندی اور جرات کا مظاہرہ کرتی تو دو تین دن تک مزید مقابلہ کیا جا سکتا تھا اور اس طرح ایک ایسی قرارداد منظور کرائی جا سکتی تھی جو بھارت اور روس کے لئے قابل قبول ہوتی۔ آخری وقت تیار کئے جانے والی قراردادوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قراردادوں کے تحت جنگ بندی سے ہمیں ہتھیار ڈالنے اور اس کے لازمی نتائج سے نجات مل جاتی۔

فوجی پہلو

تعارف

1- پاک بھارت جنگ کا فوجی پہلو ہماری انکوائری کا سب سے اہم اور شاید سب سے زیادہ پیچیدہ پہلو ہے لیکن تینوں سروسز کے ہیڈ کوارٹرز کے تعاون کی وجہ سے اور مختلف رینکس کے کمانڈروں اور افسران کے تعاون سے بھی جو کسی نہ کسی صورت میں جنگ کی منصوبہ بندی سے تعلق رکھتے تھے ہمارا کام آسان ہو گیا۔ مسلح افواج کے بہت سے ریٹائرڈ افسران کی شہادتوں سے بھی ہمیں فائدہ پہنچا اس کے علاوہ تینوں سروسز سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے بھی ہمارے سامنے بیانات دیئے۔

2- اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شہادتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جس میں زبانی شہادتیں بھی تھیں اور تحریری بھی۔ زبانی شہادتوں کے انتخاب اور درست کرنے کے لئے تکنیکی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمیشن کے فوجی مشیر اور لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ الطاف قادر اور تینوں سروسز کے ان نمائندوں کو جو کمیشن کے ساتھ متعین تھے ان شہادتوں کو جانچنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں کافی محنت کرنی پڑی تا کہ انہیں فوجی معیار کے مطابق بنایا جا سکے۔ ہمیں خوش قسمتی سے نیوی اور ایئر فورس کے معاملات میں وائس ایڈمرل ریٹائرڈ ایچ۔ ایم۔ ایس۔ چوہدری اور ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خان کے مشورے بھی حاصل تھے فوجی مشیر اور سروسز کے نمائندوں کی تیار کی ہوئی ٹیکنیکل رپورٹس بہت اہم ہیں اور انہیں رپورٹ کی دوسری جلد میں اسٹاف اسٹڈیز کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ہم نے اس معلومات سے حسب منشاء استفادہ کیا۔ ہم نے جنگ کے بعد تینوں سروسز کے ہیڈ کوارٹرز میں کئے گئے تجزیوں کے مطالعے کے بعد اپنی رائے قائم کی جو اس رپورٹ میں دی گئی ہے۔

3- ہمارا خیال ہے کہ اس شکست کے فوجی پہلو کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل معاملات کا

جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

(I) قومی دفاع کے بارے میں فوجی تصور جو حکومت اور سپریم کمانڈر کی طرف مختلف اوقات میں دی جانے والی ہدایات کی روشنی میں قائم ہوتا ہے۔

(II) ان ہدایات اور تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دفاعی منصوبوں کا بنایا جانا۔

(III) مشرقی پاکستان میں 25 مارچ 1971ء سے فوجی آپریشن کے بعد سے رونما ہونے والے واقعات کے نتیجے میں بھارتی خطرے کا اندازہ لگانا۔

(IV) اس خطرے کے مقابلے کے لئے مسلح افواج کی تیاری کی کیفیت۔

(V) 21 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان میں بھارتی حملے سے پہلے کے واقعات اور فوجی صورتحال پر اس کے اثرات۔

(VI) 21 نومبر سے 3 دسمبر 1971ء کے درمیان مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل۔

(VII) 3 دسمبر سے 17 دسمبر 1971ء تک مکمل جنگ۔

(a) مشرقی پاکستان میں جنگ۔

(b) مغربی پاکستان میں آرمی آپریشن۔

(c) مغربی پاکستان میں فضائی جنگ۔

(d) بحری جنگ۔

(e) دشمن کے فضائی حملوں کے خلاف دفاع۔

(vii) مشرقی پاکستان میں پاکستان آرمی کے ہتھیار ڈالنے سے متعلقہ حالات و واقعات کا تنقیدی جائزہ

(ix) مغربی پاکستان میں جنگ بندی

(x) اعلیٰ سطح پر جنگ کے متعلق ہدایات

(4) ہم بلاشبہ اپنی اس بحث کو اپنی سفارشات، جو کچھ ہم نے حاصل کیا اور نتائج قلم بند کر کے سمیٹیں گے۔

(5) اگرچہ یہ معاملہ پہلے ہی سے اس رپورٹ کے باب اول میں بیان کیا جا چکا ہے

اس کے باوجود اس کا یہاں دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ ہماری کوششوں کے باوجود ہم لیفٹیننٹ جنرل اے۔اے۔کے۔نیازی اور مشرقی کمانڈ کے دوسرے سینیئر افسران کی شہادت حاصل نہ کر سکے۔ اس صورت حال کے مطابق ہم نے سروسز ہیڈ کوارٹر اور مشرقی کمانڈ کے افسران جو ہتھیار ڈالنے سے فوری قبل مشرقی پاکستان سے نکل آنے میں کامیاب ہو گئے تھے، کی طرف سے پیش کی جانے والی شہادتوں اور مواد کی مدد سے مشرقی پاکستان کی کہانی کو ازسرِنو تشکیل دینے کی کوشش کی۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ اس مرحلہ پر مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے اور اس سے متعلقہ دوسرے معاملات کے حوالے سے ہمارے مشاہدات اور نتائج عارضی نوعیت کے سمجھے جائیں اور ان میں مشرقی کمانڈ کے کمانڈر اور دوسرے سینیئر افسران کی شہادت اگر وہ ملی تو ترمیم کی جا سکتی ہے۔

قومی دفاع کا عسکری تصور

1-جنگ میں پاکستان کے دفاع سے متعلق حکمت عملی کے تصور کی بنیادی دستاویز کی مفصل ہدایات نمبر 4 فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے 9 اگست 1967 کو پاکستان کی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے دیں۔

2-اس ہدایت کے پیرا نمبر 2 میں یہ قومی مقصد ''قومی سلامتی، تحفظ اور پاکستان کی آزادی اور لوگوں کی خوش حالی بتایا گیا ہے تا کہ ہمارا ملک قوموں کی برادری میں باعزت مقام حاصل کر سکے۔ اسی مقصد کے تناظر میں اور بغیر کسی عذر کے کشمیر کے لوگوں کی حق خود ارادیت دلانے کی کوششیں جاری رکھی جائیں گی۔

3-اس دستاویز کا پیراگراف ''ای'' اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ پاکستان کی سلامتی کو سب سے زیادہ خطرہ بھارت سے ہے اور یہ کہ پاکستان کو بھارت کی طرف سے کلی طور پر ایک لامحدود اور مسلح جارحیت کا خطرہ ہے جس کا نتیجہ سرحدوں پر گولہ باری میں اضافہ یا پہلے سے تیار کردہ منصوبے کے مطابق حملے کی صورت میں نکلے گا۔

4-پیراگراف نمبر 4 اس انداز میں بھارتی صلاحیت کو نمایاں کرتا ہے کہ ''بھارت بیک وقت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے خلاف جارحانہ فوجی آپریشنز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح کی جارحیت کے حوالے سے بھارت خشکی اور بری دونوں محاذوں پر آپریشنز کی محدود صلاحیت رکھتا ہے۔

5-افغانستان اور چین کی صورت حال کا ذکر کرنے کے بعد اس ہدایت کے پیراگراف نمبر 7 میں کہا گیا ہے کہ مسلح افواج کا مشن درج ذیل ہوگا:

جنگ کے شروع ہونے پر یا جیسے ہی مناسب حالات پیدا ہوں یا موقع ملے تو مسلح افواج آپریشن کے ذریعے دشمن کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گی جبکہ مغربی بازو میں دشمن کی فوجوں کو روکنے اور ان کا خطرہ ختم کرنے کی کوشش کریں گی۔ مشرقی بازو میں دشمن کی فوجوں کو محدود کرنے اور ان کے حملوں کو بے اثر کرنے کے ساتھ ساتھ نقصان کا خطرہ

مول لئے بغیر دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گی۔

6-اس کے بعد پیرا نمبر 8 میں کچھ بنیادی مفروضات کا تذکرہ ہے جو دفاعی نقطہ نظر سے مدنظر رکھے جانے چاہئیں (اور وہ یہ ہیں)۔

(الف) ہمیں فوری طور پر مسلسل اور سب سے بڑا خطرہ بھارت سے ہے۔ افغانستان کی مسلح افواج کا حجم اور سائز افغانوں کا علاقائی دعویٰ بہرحال ایک مثبت خطرہ ہے۔ سفارتی اور دوسرے ذرائع سے اس خطرے کے اثر کو کم سے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے مغربی پاکستان میں دفاع کی پلاننگ دونوں محاذوں پر آپریشنز کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن اس پلاننگ میں بھارت کے خلاف محاذ پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔

(ب) ہمیں بھارت کی طرف سے جارحیت کے خطرے کی توقع رکھنی چاہئے۔ اغلباً بہتر یہ ہوگا کہ ہمیں اس کی سات دن قبل اطلاع ہونی چاہئے۔ جنگ کسی بھی وقت مغربی پاکستان پر حملے کے بعد شروع ہو سکتی ہے جیسا کہ گزشتہ مرتبہ ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا جائے لیکن بہرحال دونوں صورتوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کیونکہ بھرپور جنگ چھڑ سکتی ہے۔

(ج) جنگ کے دوران ہمیں باہر سے زیادہ امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہئے لیکن کچھ ممالک گزشتہ مرتبہ کے برعکس ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

(د) بھارت کے خلاف جنگ انتہائی شدید ہوگی اور یہ بڑی شدت کے ساتھ لڑی جائے گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ جنگ مختصر ہوگی کیونکہ ہمارے فوجی ذخائر محدود ہیں اس لئے ہماری کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ ہم اس جنگ کو محدود عرصے میں اختتام تک پہنچائیں۔

(ح) جنگ کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان عام ذرائع سے رابطے منقطع ہو جائیں گے۔

(خ) جنگ چاہے مشرقی پاکستان ہی میں کیوں نہ شروع ہو، تزویری عوامل اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ فیصلہ کن جنگ مغربی پاکستان میں لڑی جائے گی۔ (تزویری: (Strategic

7- اس ہدایت کے پیراگراف نمبر 9 میں مزید کہا گیا ہے کہ ''منصوبہ بندی میں ایسے عارضی آپریشن بھی شامل ہوں گے جیسے دشمن کے علاقے میں غیر فوجی علاقے پر بمباری کرنا

اور تجارتی جہازوں کو نشانہ بنانا تینوں افواج کے سروسز ہیڈ کوارٹرز اس طرح کے آپریشنز شروع کرنے سے قبل حکومت سے منظوری حاصل کریں گے کیونکہ اس طرح کے آپریشنز سے جوابی حملے کا خطرہ ہو سکتا ہے اور ان کے سیاسی اثرات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔

8-اس کے بعد اس ہدایت میں تینوں مسلح افواج کے فرائض کو بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے موجودہ مقصد کے حوالے سے جنگ میں ان فرائض کی تکمیل کی توقع رکھنی چاہئے جو بیرونی مدد کے بغیر تین ماہ تک لڑی جا سکے اور اس طرح پیراگراف نمبر **18** میں درج ذیل باتیں شامل ہیں:

''باہر سے ہتھیاروں کی مسلسل فراہمی کی عدم موجودگی کی صورت کو مدنظر رکھتے ہوئے لاجسٹک پلاننگ میں کم از کم تین ماہ کے لئے جنگ کا سامان جمع رکھنا شامل ہونا چاہئے۔''

9-یہ بات مدنظر رہے کہ اس ہدایت کا بنیادی تزویری مقصد یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کی ذمہ داری مغربی پاکستان پر عائد ہوتی ہے اور اگر جنگ مشرقی پاکستان سے شروع ہو تب بھی فیصلہ کن جنگ مغربی پاکستان میں لڑی جائے گی۔

اس ہدایت میں اس بارے میں کوئی ٹائم فریم نہیں دیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کی صورت میں مغربی پاکستان اس حملے کا جواب کب دے' اس لیے اس معاملے کی منصوبہ بندی کرنے کا فیصلہ تینوں سروسز پر چھوڑ دیا گیا جو سپریم کمانڈر کی ہدایت پر عمل کرتی ہیں اور سپریم کمانڈر کے ماتحت کام کرتی ہیں لیکن ہدایت میں اس حوالے سے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ چاہے جنگ مغربی پاکستان پر حملے کی صورت میں شروع ہو یا مشرقی پاکستان پر حملے کے بعد ہو۔ دونوں صورتوں میں پاکستان کے لیے مکمل جنگ ہوگی۔ اس لیے اس ہدایت میں پاکستان کو جغرافیائی یا علاقائی لحاظ سے نہیں دیکھا گیا بلکہ کہا گیا کہ بھارت کی جارحیت کے مقابلے کے لیے جامع اور مربوط آپریشن کو عمل میں لایا جائے۔

10-27 جولائی **1971**ء کو جوائنٹ سیکرٹریٹ کے سربراہ نے جنگ کے متعلق ہدایت کے نکتے نمبر **4** پر نظر ثانی سے متعلق تینوں سروسز کے ہیڈ کوارٹرز سے تجاویز مانگیں۔ تجاویز مانگنے کی وجہ یہ تھی کہ **1967**ء میں جب یہ ہدایت جاری ہوئی تھی تو اس کے بعد سے پاکستان کے عسکری اور جغرافیائی' سیاسی حالات میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں' جو اس ہدایت پر نظر ثانی کے متقاضی تھے۔ سروسز ہیڈ کوارٹرز کو مزید بتایا گیا تھا کہ نظر ثانی کا کام 13 جولائی **1971**ء کو منعقد ہونے والی

پری جوائنٹ چیفس کمیٹی کے اجلاس کے فیصلوں کے مطابق عمل میں لایا جائے گا۔

11- یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ **18** اگست **1971**ء کو جنرل ہیڈ کوارٹرز نے ہدایت کے پیرا نمبر **6** اور **7** پر نظر ثانی کی تجویز پیش کی۔

پیراگراف نمبر **6** کا تعلق چین کے کردار سے ہے۔ جی ایچ کیو محسوس کرتا تھا کہ چین کے دوستانہ کردار کی جھلک ہدایت میں نظر آنی چاہئے۔ پیراگراف نمبر **7** جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کا تعلق مسلح افواج کے مشن سے ہے۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز مشرقی پاکستان میں پاکستان آرمی کی صلاحیت کے پیش نظر یہ محسوس کرتا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی دستوں میں اضافے اور آپریشن کی کامیاب تکمیل کے بعد پاکستانی فوج کو مشرقی پاکستان میں جارحانہ آپریشن کا منصوبہ سونپا جانا چاہئے۔

(**12**) آخر میں جی ایچ کیو نے تجویز پیش کی کہ'' بھارت اور سوویت یونین کے درمیان ہونے والے باہمی سلامتی کے سمجھوتے کے اثرات کا دفتر خارجہ کی مشاورت سے جائزہ لیا جانا چاہئے اور اگر ضروری تصور کیا جائے تو اس جائزے کو ہدایت میں شامل کیا جانا چاہئے۔''

(**13**) فضائیہ کے ہیڈ کوارٹر نے پاکستان فضائیہ کے کمانڈر انچیف کے حوالے سے کہا کہ فضائیہ کے نقطہ نظر سے ہدایت کے متن میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن نیوی نے پیراگراف نمبر **9** اور **13** پر نظر ثانی کی سفارش کی ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ پیراگراف نمبر **9** کا تعلق دشمن کے علاقے میں غیر فوجی ٹھکانوں پر حملے اور دشمن کے تجارتی جہازوں کو نقصان پہنچانے سے متعلق ہنگامی منصوبوں کی تیاری سے ہے۔ نیول ہیڈ کوارٹر نے اپنے **26** اگست **1971**ء کے مراسلے میں کہا کہ'' پاکستان نیوی کا اس وقت سب سے موثر ہتھیار اس کا سب میرین ہیڈ کوارٹر ہے'' بنیادی طور پر آبدوزوں سے چلانے والے ہتھیار حملے میں پہل کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بغیر وقت ضائع کئے ان کی تنصیب سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ پاکستان نیوی کے لئے وقت کا عنصر بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ پاکستان نیوی کے پاس سمندری جاسوسی کا سامان نہیں ہے اس لئے حملے سے پہلے وارننگ ملنا ممکن نہیں ہے۔

اس لئے نیوی نے سفارش کی کہ ہدایت کے پیراگراف نمبر **9** میں آپریشن شروع کرنے سے قبل حکومت سے منظوری لینے کی جو شرط ہے اس میں ترمیم کی جانی چاہئے اور بھارت

کے تجارتی جہازوں کو ڈبونے (پاکستان نیوی کے منصوبوں کے حوالے سے یہ بات اہم ہے) کے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت کی منظوری ضروری نہیں ہونی چاہئے اور دشمن کے بحری جہازوں پر حملے کے حوالے سے حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان نیوی کے کمانڈر انچیف کو اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار دے۔

(14) ہدایت کے پیراگراف نمبر 13 کے حوالے سے نیول ہیڈکوارٹر نے یہ تجویز دی کہ پاکستان نیوی کے پرانے آلات اور بھارتی نیوی کے جدید ترین آلات کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ بڑھتا جارہا ہے اس لئے پیراگراف نمبر 13 کے حوالے سے یہ بات مدنظر رکھی جانی چاہئے کہ بھارت کی جغرافیائی صورتحال اور اس کی جاسوسی کے آلات اور فضائیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان نیوی اس قابل نہیں ہوگی کہ دونوں بازوؤں کے درمیان کسی قسم کی سپلائی بحال رکھ سکے۔ اس لئے انتہائی ضروری اشیاء کی ترسیل بھی ممکن نہ ہوگی۔

(15) لیکن ہماری جوائنٹ چیفس کمیٹی نے ان تجاویز پر کبھی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہدایت کا نکتہ نمبر 4 بغیر ترمیم کے ہدایت میں موجود رہا۔ یہاں تک کہ نومبر 1971ء میں جنگ چھڑ گئی۔ سوال یہ ہے آیا اس ہدایت پر نظر ثانی کی کافی ضرورت موجود تھی اور اس پر نظر ثانی کے مفروضے کی بنیاد کیا تھی اور اگر واقعی ایسا تھا تو اس میں ناکامی کی صورت میں مشرقی اور مغربی پاکستان پر جنگ کا کیا اثر پڑتا۔

(16) جی ایچ کیو نے 18 اگست 1971ء کو جن ترامیم کے لئے کہا جن کا اوپر حوالہ بھی دیا گیا ہے ان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فوج نے اس ہدایت کے اہم بنیادی مفروضات پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جی ایچ کیو نے متن میں جس تبدیلی کی ضرورت محسوس کی اور جو ہدایت کے پیراگراف نمبر 7 میں درج ہے وہ مشرقی پاکستان میں عسکری صورتحال کے حوالے سے محض خوش فہمی تھی۔ جہاں تک بھارت سوویت یونین معاہدے کا تعلق ہے اس حوالے سے یہ بات واقعی حیران کن ہے کہ اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف (لیفٹیننٹ جنرل گل حسن) نے بھارت اور سوویت یونین کے مابین اس معاہدے کے نتیجے میں طاقت کے عدم توازن کے عسکری مضمرات سمجھنے کی بجائے اس مسئلے کو دفتر خارجہ کے حوالے کر دیا۔ جی ایچ کیو پر یہ بات واضح ہونی چاہئے تھی کہ ہماری حکمت عملی کے انداز ے میں بڑھتی ہوئی کشیدگی کی بنا پر بھارت سوویت یونین معاہدہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

یہ "جنگی ہدایت نامہ" 1967ء میں جاری کیا گیا تھا جس کے بعد مارچ 1971ء میں مشرقی پاکستان کے سیاسی بحران اور وہاں کئے گئے فوجی اقدام کے نتیجے میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جن کے پیش نظر جنگی حکمت عملی پر نظر ثانی ضروری ہو چکی تھی۔

(i) جیسا کہ جنرل ہیڈکوارٹرز نے جوائنٹ چیفس سیکرٹریٹ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ بھارت، سوویت یونین کے ساتھ فوجی معاہدے میں شامل ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں بھارت کو اپنی مسلح افواج کے لئے جدید ترین اسلحے اور ہتھیاروں کی فراہمی شروع ہو جائے گی اور اس طرح دونوں ممالک کے درمیان طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔

(ii) مشرقی پاکستان میں کئے جانے والے طویل فوجی ایکشن کے نتیجے میں مقامی آبادی مکمل طور پر حکومت سے الگ تھلگ ہو چکی تھی جس کی بنا پر پاکستان آرمی کو نہ صرف بیرونی جارحیت کا خطرہ لاحق تھا بلکہ شہری آبادی کی جانب سے شورش انگیزی اور سبوتاژ کے ساتھ ساتھ مسلح افواج میں موجود مشرقی پاکستانی اہلکار اور عملے کے ارکان سے بھی مستقل خطرہ تھا۔

(iii) بھارت نے کھلم کھلا چالیس سے پچاس ہزار چھاپہ ماروں کو تربیت دینا شروع کر دی تھی تاکہ ان کے ذریعے مشرقی پاکستان میں مداخلت کی جا سکے۔

(iv) اکتوبر اور نومبر 1971ء تک، بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بارہ ڈویژن فوج تعینات کر دی تھی جس میں سات انفنٹری اور ماؤنٹین ڈویژن تین سے چار ٹینک رجمنٹس اور پینتیس بارڈر سیکورٹی فورس بٹالینوں کے علاوہ بھارتی بحریہ اور فضائیہ کی بھرپور طریقے سے تعیناتی بھی شامل تھی۔

(v) اس مرحلے پر بھارت کے ظاہری مقاصد یہ تھے کہ مشرقی پاکستان کے ایک حصے پر قبضہ کر کے اسے بنگلہ دیش کا نام دے دیا جائے اور

(vi) پاکستان آرمی مشرقی پاکستان کی بھارت سے ملنے والی سرحد پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات اور واقعات کی موجودگی میں اس نظریے پر کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جا سکتا ہے دفاعی پالیسیوں کی تشکیل کے ذمے دار افراد کی جانب سے سنجیدگی کے ساتھ از سر نو غور و فکر کی ضرورت تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگی تیاریوں اور مسلح افواج کی صلاحیتوں کے مابین بڑھتی ہوئی عدم مساوات کے پیش نظر یہ دیکھنا ضروری ہو چکا تھا کہ کیا 1971ء میں بھی پاکستان اس پوزیشن میں تھا کہ مغربی پاکستان سے

بروقت جارحانہ حملے کے ذریعے مشرقی پاکستان کی صورت حال کو فیصلہ کن طور پر متاثر کر سکے؟ ان عوامل کے فوجی مضمرات اور اثرات کے گہرے جائزے اور تعین میں ناکامی کے باعث آرمی کی ہائی کمانڈ نے اپنی کامیابی کے تمام مواقع گنوا دیئے اور وہ بھی ایک ایسے مرحلے پر جب یہ جنگ نوشتہ دیوار بن چکی تھی!

ہائی کمان کو یقین تھا کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل گیا

19- نئی سیاسی اور فوجی صورت حال میں یہ بات پوری طرح صاف اور واضح تھی کہ پہلا اہم ترین کام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک مشرقی پاکستان میں ہمارے قدم مضبوطی سے جمے رہیں تاکہ بین الاقوامی برادری کو بامقصد اور مؤثر مداخلت کا موقع مل سکے تاہم اس ضمن میں مناسب اور ضروری اقدامات نہیں کئے گئے جس کا بنیادی سبب یہ غلط مفروضہ تھا کہ مغربی پاکستان سے فوری طور پر فیصلہ کن جوابی حملہ کر دیا جائے گا! جیسا کہ بعد میں آنے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان سے ایسا کوئی جوابی حملہ نہیں کیا گیا۔ اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کمیشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ 1967ء کے جنگی ہدایت نامہ نمبر 4 میں بیان کی گئی فوجی حکمت عملی میں فوری طور پر اور وسیع انداز میں نظر ثانی اور تبدیلیوں کی اشد ضرورت تھی تاکہ مناسب تعداد میں مشرقی پاکستان میں دفاعی افواج کی تعیناتی سے طویل اور مؤثر زمینی فضائی اور بحری دفاع کو ممکن بنا کر بین الاقوامی بیرونی مداخلت اور مغربی پاکستان سے کئے جانے والے جوابی حملے کے لیے راہ ہموار ہو جاتی .... اگر دفاعی پالیسی میں بروقت ترمیم اور تبدیلی کر لی جاتی تو مشرقی پاکستان میں فوج کی تعداد اور جنگی تیاریوں کی صورت حال مختلف ہو سکتی تھی..........

ایسی صورت میں نہ صرف فوجی طاقت میں اضافہ ہوتا بلکہ ائیر فورس کو بھی ایک اور فضائی اڈے کے ساتھ ساتھ ایک اضافی اسکواڈرن بھی فراہم ہو جاتا جس کے نتیجے میں ڈھاکہ میں متعین واحد اسکواڈرن کو چوبیس گھنٹوں کی دی گئی مہلت بڑھ جاتی اور وہ زیادہ عرصے تک وہاں ٹھہر سکتا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ کرمی ٹولہ کا ڈھاکہ سے قریب ہوائی اڈہ بھی ضروری سازو سامان اور سہولتوں سے لیس نہیں تھا کیونکہ یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان اب ہاتھ سے نکل چکا ہے تاہم موقع ملنے پر ہم ان معاملات کے بارے میں آنے والے ابواب میں دوبارہ گفتگو کریں گے۔

20- یہ نکتہ جنرل یحییٰ خان اور ان کے سینئر آرمی کمانڈرز جنرل عبدالحمید خان اور جنرل گل حسن کی اختراع تھا جس کے مطابق مشرقی پاکستان میں مزید افواج کی تعیناتی سے کوئی

فائدہ نہیں تھا کیونکہ مشرقی پاکستان ہرصورت میں ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور ایسی حالت میں وہاں مزید کمک پہنچانے کا اس کے سوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلتا کہ مغربی پاکستان کا دفاع بھی کمزور ہو جاتا...... یہ دلیل قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ اگر جنرل یحییٰ خان اور ان کے سینئر آرمی کمانڈرز اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ فوجی نقطہ نظر سے مشرقی پاکستان پر مزید قبضہ رکھنا ناممکن ہے تو پھر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ فوجی حکومت نے مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کا سہارا کیوں لیا اور کس لیے سیاسی تصفیے کی تمام تر تجاویز اور مشورے مسترد کر دیے؟ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے خیال میں ایک مستحکم فوجی حکمت عملی اور اس کے عملی اطلاق کے ذرائع کے مابین نمایاں فرق موجود ہے! مناسب ذرائع کی عدم دستیابی 1947ء سے لے کر آج تک اس ملک کے لیے ایک خطرناک مسئلہ بنی ہوئی ہے: تاہم اسے کسی کمزور نظریے کو اختیار کرنے کا جواز ہرگز نہیں بنایا جا سکتا۔ لہٰذا ہمارے خیال میں تبدیل شدہ حالات کے پیش نظر نظر ثانی شدہ حکمت عملی کو اختیار کرتے ہوئے فوجوں کی تعداد اور تعیناتی کے سوال پر غور و خوض کیا جانا بے حد ضروری تھا' بدقسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا۔

21- آخر میں پاک بحریہ کی جانب سے پیش کی گئی' ترامیم بھی جو جنگی ہدایت نامے کے پیراگراف 9 میں بیان کی گئی ہیں اور جن کے مطابق حکومت کی پیشگی اجازت اور منظوری کے بغیر دشمن کے تجارتی بحری جہاز پر حملہ نہیں کیا جا سکتا منظوری کے بعد اس جنگی ہدایت نامے میں شامل کی جانی چاہیے تھیں! اس وقت کے پاکستان نیوی کے کمانڈر انچیف نے اس کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ بھارت کے تجارتی بحری جہازوں پر پاک بحریہ کی آبدوز کے حملوں کی سرکاری اجازت لینے پر خاصا قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں سرکاری منظوری دی ہی نہیں گئی جس کا بنیادی سبب وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے مابین ضروری رابطے کا فقدان تھا۔ اگر جنگی ہدایت نامے کے اس پیراگراف میں شامل نیوی ہیڈ کوارٹرز کی جانب سے پیش کی جانے والی ترمیم منظور کر لی جاتی تو ہمارے پاس یہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ پاک بحریہ کی آبدوزیں مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی جارحیت سے آغاز پر ایسی پوزیشن میں تھیں کہ بھارت کے تجارتی بحری جہازوں پر مؤثر حملے کیے جا سکتے تھے تاہم انہیں اس کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔

''دفاعی منصوبوں کی تشکیل''

1- 1967ء کے ''جنگی ہدایت نامے'' کے مطابق تینوں مسلح افواج کے تشکیل کردہ دفاعی منصوبوں کی جانچ پڑتال مشرقی اور مغربی پاکستان کے حوالے سے علیحدہ علیحدہ کی جائے گی تاہم موجودہ باب میں' ہم اپنی توجہ خصوصی طور پر پاکستان آرمی کے منصوبوں پر مرکوز رکھیں گے کیونکہ حالیہ تباہی میں اس کا کردار بنیادی نوعیت کا حامل رہا ہے' بحریہ اور فضائیہ کے دفاعی منصوبوں پر ہم اس وقت گفتگو کریں گے جب دونوں صوبوں میں' بحری اور فضائی معرکوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

2- مشرقی کمان کے دفاعی منصوبوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں معلوم ہوا کہ 11 نومبر 1969ء کو کمانڈر انچیف کی جانب سے جاری کیے جانے والے ہدایت نامے کی رو سے مشرقی کمان کو سونپا گیا مشن جو اس وقت ''3۔کور'' کی حیثیت سے تشکیل دی گئی تھی' بنیادی طور پر یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع کیا جائے اس میں مزید کہا گیا تھا کہ:۔

(الف) کسی بھی قسم کی بیرونی امداد یا اضافی معاونت پر ہرگز تکیہ نہیں کیا جائے گا۔

(ب) کوئی بھی ایسا بڑا جارحانہ حملہ نہیں کیا جائے گا جو جنگ کو دشمن کے علاقے تک پھیلا دے سوائے محدود نوعیت کی جھڑپوں اور چھوٹے پیمانے پر جنگی چالوں کے۔

(ج) افواج کی دست برداری کی صورت میں مضبوط دفاعی مقامات پر قبضہ برقرار رکھنے کی غرض سے ایسے گشتی دفاعی اقدامات اور تاخیری حربے اختیار کیے جائیں کہ دشمن علاقے پر کسی طور پر قبضہ نہ کر سکے۔

(د) ہر قسم کے حالات میں' کور کو ایک زندہ اور فعال قوت ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ سیاسی اور فوجی دونوں نقطہ ہائے نظر سے یہ بہت اہم ہے جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی وحدت اور حکومت کو ہر قسم کی صورت حال میں برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

(ہ) ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈ کوارٹرز کو یہ ذمے داری دی جاتی ہے کہ وہ صوبائی حکومت سے برابر رابطہ قائم رکھے گا' اس کے علاوہ پاکستانی بحریہ اور فضائیہ سے مسلسل رابطہ رکھنا بھی اسی کی ذمے داری ہوگی۔

3۔ مشرقی پاکستان کے دفاع کا اصل منصوبہ جس پر 7 مارچ 1971ء کو لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم یعقوب کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کے آنے تک عمل ہوتا رہا تھا' صرف ایک انفنٹری ڈویژن کے سہارے چل رہا تھا جسے چودھویں ڈویژن کا نام دیا گیا تھا جسے ایسٹ پاکستان رائفلز اور مجاہدین کی مدد حاصل تھی۔

ہمیں میجر جنرل (ریٹائرڈ) خادم حسین راجہ نے جو چودھویں ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ رہ چکے ہیں بتایا کہ یہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کا مقصد افواج پسپا ہونے کی صورت میں انہیں دریاؤں کے کنارے کے ساتھ ساتھ منتقل کرنا تھا تا کہ ڈھاکہ شہر کے گرد و نواح میں اور دفاع کے لیے خاصا وسیع علاقہ فراہم ہو سکے تاہم اس امکان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ فوجوں کے پسپا ہونے اور علاقہ چھوڑنے کی صورت میں سمندری راستے کے علاوہ برما کو جانے والا زمینی راستہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

4۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' لیفٹیننٹ جنرل ایس ایم یعقوب کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان نے کمانڈر ایسٹرن کمانڈ کا چارج سنبھالا تھا جو بعد میں گورنر اور زونل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے تھے' ان کے بعد لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی کمانڈر ایسٹرن کمانڈ مقرر ہوئے جن کے دور میں 15 جولائی 1971ء کو جنرل ہیڈ کوارٹر کی منظوری کے بعد ایسٹرن کمانڈ کے لیے نئی آپریشنل ہدایات جاری کی گئیں۔

5۔ ان ہدایات کے اہم نکات پر اس رپورٹ کی جلد دوم کے حصہ سوم اور چہارم کے باب اول میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے تاہم فی الحال ہمارے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ایسٹرن کمانڈ کو ہر قیمت پر اور ہر صورت میں ڈھاکہ کے دفاع کو یقینی بنانے کی اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی کیوں کہ ڈھاکہ شہر کو مشرقی پاکستان کے سیاسی اور فوجی مرکز کی حیثیت حاصل تھی' بیرونی جارحیت کے علاوہ' ایسٹرن کمانڈ کو شورش پسندوں اور باغیوں سے بھی نمٹنا تھا وہ بھی ایسے حالات میں جب کہ مواصلات کی صورت حال انتہائی خراب تھی' ذرائع ناکافی تھے اور ہماری فضائیہ کا حال بھی پتا تھا' ان تمام حالات کے باوجود ایسٹرن کمانڈ کو یہ جنگ اپنے آپ پر ہی انحصار کرتے ہوئے آزادانہ طور پر لڑنی تھی

6۔ جو ہدایات جاری کی گئیں ان میں دشمن کے عزائم کی تفصیل ممکنہ طور پر اس طرح بیان کی گئی تھی:۔

(i) علاقائی عزائم:۔ اس صورت میں دشمن ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا جو دریائے جمنا' پدما اور میگھنا کے مغربی حصے میں واقع ہیں۔ یعنی راجشاہی اور کھلنا کے سول ڈویژن یا ڈھاکہ ڈویژن کے کچھ حصے:۔

(ii) سیاسی عزائم: اس مقصد کے حصول کے لیے دشمن شمالی بنگال یا چٹاگانگ سول ڈویژن کے کچھ حصے پر قبضہ کرنے کے بعد بنگلہ دیش حکومت قائم کر کے اس کی توسیع میں مدد دے سکتا ہے۔

7۔ اس بات کا بھی پیشگی قیاس کر لیا گیا تھا کہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں بھارت صرف مغربی پاکستان پر حملے تک ہی محدود رہے گا اور مشرقی پاکستان میں اس کا کردار دفاعی نوعیت کا ہوگا دوسری صورت میں وہ یا تو صرف مشرقی پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے خواہ اس کے ساتھ ساتھ ہی اسے مغربی حصے پر محاذ ہی کیوں نہ کھولنا پڑے تاہم اس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ بات زیادہ قرین قیاس تھی کہ حملہ صرف مشرقی پاکستان پر ہی کیا جائے گا جب کہ مغربی پاکستان میں وہ صرف دفاعی پوزیشن ہی اختیار کرے گا۔

(8) دشمن کی ممکنہ قوت اور صلاحیتوں کا اندازہ اور تخمینہ اس طرح لگایا گیا تھا:۔

(1) پانچ مکمل ڈویژنوں کے ساتھ ایک آرمرڈ بریگیڈ گروپ' بارڈر سیکورٹی فورس یونٹس اور مواصلاتی فوجی دستے! اطلاعات کے مطابق جولائی 1971ء تک اس فوجی قوت کو مشرقی پاکستان کے خلاف تعینات کر دیا گیا تھا...... مجموعی فوجی قوت جو سات سے زیادہ ڈویژنوں پر مشتمل تھی اور جسے دراصل جنگ کے دوران تعینات کیا گیا تھا' اس کا پتہ ستمبر 1971ء کے بعد ہی چلا۔

(2) ہیلی کاپٹرز کے ذریعے پوری ایک بٹالین کو لے جانے کی صلاحیت:۔

(3) زمینی فوجی کارروائی کی مدد کے لیے پیرا بریگیڈ کی تعیناتی:۔

(4) گیارہ اسکواڈرن بھارتی فضائیہ کی جانب سے مشرقی محاذ پر استعمال کے لیے: (ان میں سے ہر اسکواڈرن دس لڑاکا طیاروں اور ایک بمبار پر مشتمل تھا)

9۔ دشمن کی جانب سے حملہ کئے جانے کے حوالے سے متعدد پہلوؤں پر غور و خوض کیا گیا جس کے نتیجے میں یہ رائے قائم کی گئی کہ دشمن کی جانب سے کئے جانے والے ممکنہ جارحانہ اور خطرناک حملے کی کوششیں اولاً بوگرہ سیکٹر میں کی جا سکتی ہیں' جس کے بعد بوگرہ نگر باڑی علاقے

پر قبضہ کرتے ہوئے ثانوی کوشش' جیسور اور میمن سنگھ پر قبضے کے لیے کی جائے گی! اس کے علاوہ بھیراب پل' داؤدکنڈی' چاند پور اور دیگر علاقوں پر بھی دشمن کے ممکنہ حملوں پر غور کیا گیا۔

10-اپنے مشن کی تکمیل کے لیے کمانڈر ایسٹرن کمانڈ نے اپنی آپریشنل حکمت عملی اس انداز سے مرتب کی تھی:۔

(الف) دریائے جمنا اور پدما کے مغربی علاقوں کے دفاع کی غرض سے بنیادی فوجی حکمت عملی اختیار کی جائے گی۔

(ب) اگلے محاذوں پر پیش قدمی کرتے ہوئے' دفاع کو یقینی بنایا جائے گا۔

(ج) جارحیت کا آغاز ہوتے ہی فوری طور پر دشمن کے خلاف جوابی حملہ شروع کر دیا جائے گا اس مقصد کے لئے دو ٹاسک فورسز کی تشکیل ضروری ہے' ایک میمن سنگھ جمال پور علاقے کے لیے اور دوسری مولوی بازار کے لیے تا کہ ان کے سامنے واقع بھارتی علاقے پر قبضہ کیا جاسکے۔

(د) اریچا کے مقام پر ایسے مضبوط اور طاقت ور گشتی فوجی دستوں کی تعیناتی جو ضرورت کے مطابق' جارحانہ اور دفاعی' دونوں قسم کے کردار ادا کرسکیں۔

(ہ) مواصلاتی رابطوں اور اہم تنصیبات کی حفاظت اور مجاہدوں (رضا کاروں) پولیس اور رضا کاروں کی جانب سے امن عامہ کی صورت حال کی کڑی نگرانی۔

(و) ہر سیکٹر کو خوراک' اسلحے اور ساز و سامان کے اعتبار سے ایک ماہ کی مدت کے لیے خود کفیل بنانا۔

11-اس آخری نکتے کے بارے میں فوجی ماہرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا تعلق فوجی قلعہ بندیوں کی تعمیر کے لیے بنیاد فراہم کرنا تھا تا کہ کسی مضبوط مورچے سے دست برداری کی صورت میں' خوراک اور اسلحے کے محفوظ ذخائر وافر مقدار میں موجود رہیں' ان فوجی قلعہ بندیوں کی حفاظت آخری آدمی اور آخری راؤنڈ تک کی جانی تھی۔

12-ایسٹرن کمانڈ کے اس جنگی منصوبے کو جنرل ہیڈ کوارٹرز کی منظوری حاصل تھی تاہم یہ دیکھ کر خاصا تعجب ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل نمایاں کمزوریاں اور نقائص پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف اور اس کے جنرل اسٹاف کی نظر سے کیوں پوشیدہ رہے:۔

(الف) مشرقی پاکستان میں اندرونی شورش اور بغاوت کو رفع کرنے کی غرض سے

افواج کے استعمال کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ وہ سرحدوں پر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں تتر بتر ہو کر رہ گئی لہٰذا یہ ضروری تھا کہ کسی ایسے مقام کا تعین کیا جاتا جس پر افواج کو پسپا ہونے کے بعد کے بعد پہلے سے طے شدہ دفاعی لائنوں پر واپس لایا جاسکے لیکن منصوبے میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی نہ ہی جنرل ہیڈ کوارٹرز نے اس کی کوئی نشان دہی کی' نومبر 1971ء کے اواخر تک یہ بخوبی واضح ہو چکا تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان میں ہمارے علاقے پر بری نظر رکھتا ہے اور اب اس کا بنیادی مقصد صوبے کے کسی ایک حصے میں بنگلہ دیش حکومت کا قیام نہیں بلکہ وہ پورے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے...... ایسے حالات میں یہ اشد ضروری تھا کہ ڈھاکہ شہر کے دفاع کی غرض سے دور دور تک افواج کو دوبارہ تعینات کیا جاتا؛ تاہم اسے بھی منصوبے میں شامل نہیں کیا گیا۔

(ب) فوجی قلعہ بندیوں کی تعمیر کے منصوبے کے ساتھ ساتھ ہی یہ بھی ضروری تھا کہ ان قلعہ بندیوں کے عقب میں' زبردست حملے کی صلاحیت رکھنے والے محفوظ فوجی دستوں کے قیام کو یقینی بنایا جاتا تا کہ اگر دشمن ان قلعہ بندیوں کو روند کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو اسے مزا چکھاتے ہوئے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا جائے' اس منصوبے کی تشکیل کرنے والوں کے ساتھ ساتھ اس کی منظوری دینے والوں نے بھی اس حقیقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا کہ علاقہ بندیوں کے عقب میں مناسب گشتی محفوظ دستوں کی عدم موجودگی میں ہمارے مضبوط مورچے دشمن کے قبضے میں آسکتے تھے اور حقیقت میں ہوا بھی یہی! اس ضرورت کا تقاضا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لیے مزید فوجی دستے روانہ کیے جاتے؛ تاہم اسکے لئے بھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی! بہر حال 26 اور 27 نومبر 1971ء کو تین اضافی بٹالینوں کی روانگی' کافی تاخیر سے عمل میں آئی تھی اور جو اس مقصد کے لیے قطعاً ناکافی تھی......اور

(ج) اس منصوبے میں' پاکستانی افواج پسپا ہونے کے امکان کے ساتھ مغربی پاکستانیوں کے انخلا پر بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی جو سمندری یا زمینی راستے کے ذریعے (مشرقی پاکستان پر دشمن کے قبضے کی صورت میں) برما تک پہنچ سکتے تھے!

یہ امکانی منصوبہ بندی اس لیے اور بھی ضروری تھی کہ تمام سینئر آرمی کمانڈرز اس مہلک نظریے پر کامل یقین رکھتے تھے کہ بھارتی حملے کی صورت میں مشرقی پاکستان کے بچنے کی قطعاً کوئی امید نہیں ہے لہٰذا ذلت آمیز طریقے سے ہتھیار ڈالنے سے تو کہیں بہتر تھا کہ پسپائی اور انخلا

کے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق' عقبی حفاظتی اقدامات کو یقینی بناتے ہوئے' مناسب سفارتی انتظامات کر لیے جاتے اور افواج کا محفوظ انخلا عمل میں آ جاتا۔

13- تحقیقات کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ سیاسی اور فوجی دونوں پہلوؤں سے ڈھاکہ شہر کا دفاع انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کا حامل تھا اور عالمی سطح پر اس بات کو محسوس بھی کیا جا رہا تھا کہ سقوط ڈھاکہ کا مطلب ہوگا' سقوط مشرقی پاکستان' اس کے باوجود جنرل ہیڈ کوارٹرز' ایسٹرن کمانڈ کی جانب سے اس سلسلے میں تیار کیا جانے والا کوئی مفصل دفاعی منصوبہ یا حکمت عملی اس کمیشن کے روبرو پیش نہیں کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ عام طور پر جنرل ہیڈ کوارٹرز کا کور لیول سے نیچے کی فارمیشن کے تیار کردہ دفاعی منصوبوں کی تفصیلات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تاہم واضح اسباب اور وجوہات کی بنا پر ڈھاکہ کے دفاع کو اولین ترجیح دیتے ہوئے جنرل ہیڈ کوارٹرز کا فرض بنتا تھا کہ وہ اس کے دفاع میں براہ راست دلچسپی لیتے ہوئے' پیشگی منصوبہ بندی کرتا کیونکہ اس منصوبے پر عملدرآمد کے وقت وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا تھا! چنانچہ جنرل ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ شہر کے دفاع کی جنگ کے حوالے سے ہدایت اور رہنمائی فراہم کرنے میں بری طرح ناکام ہوا۔

14- اب ہم اپنی توجہ مغربی پاکستان کے محاذ پر مرکوز کریں گے جیسا کہ ہم سابقہ باب میں پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ 1967ء کے ''جنگی ہدایت نامے'' میں درج کی گئی دفاعی حکمت عملی کے مطابق مشرقی پاکستان کا دفاع' مغربی پاکستان سے کیا جانا تھا' جس کا مطلب یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے جنگی محاذ پر کامیاب کارروائی کے ذریعے بھارت کے فوجی اور سیاسی اہمیت کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد' مشرقی پاکستان پر دباؤ کو کم کیا جائے تا کہ بھارت مذاکرات پر رضامند ہو سکے اس نظریے کی رو سے جنرل ہیڈ کوارٹرز نے تین مختلف اقسام کے منصوبے تیار کئے تھے یعنی (1) دفاعی (2) جوابی حملہ اور (3) بھرپور حملہ جن کے تحت دو قسم کی آرمی فارمیشن بنائی جاتی تھیں۔

(الف) ایک ہولڈنگ فارمیشن جن کے ذمے بنیادی کام یہ تھا کہ وہ اپنے مخصوص علاقوں کا دفاع کرتے ہوئے محدود نوعیت کے جوابی حملے اور اقدامات کرے۔

(ب) ایسے محفوظ فوجی دستے جو بھارتی علاقوں پر بھرپور حملہ کریں۔

ان فارمیشنوں اور ان سے متعلق منصوبوں کا تعلق ان حالات اور واقعات سے تھا جو

مارچ 1971ء سے مشرقی پاکستان میں رونما ہو رہے تھے جنہوں نے اس امر کو یقینی بنا دیا تھا کہ ابتدائی بھارتی حملے مشرقی پاکستان کے خلاف ہی کئے جائیں گے۔

15- فوجی منصوبوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر مغربی محاذ پر حملہ کرنے میں پہل پاکستان کی جانب سے ہوگی اور ائیر فورس کی مدد سے دشمن کے اگلے ہوائی اڈوں یعنی سری نگر' پٹھان کوٹ اور امرتسر کو حملوں کا نشانہ بنایا جائے گا جس کے بعد مغربی سرحدوں پر ابتدا میں دفاعی حکمت عملی کی حدود میں رہتے ہوئے' جارحانہ حملے کئے جائیں گے تا کہ دشمن کو دھوکہ میں رکھا جا سکے اور اس کے فوری بعد دشمن پر ایک بڑا جارحانہ حملہ کر دیا جائے گا' فوجی آپریشن کے ابتدائی مرحلوں میں ماسٹر پلان کے مطابق دشمن کو دھوکے میں رکھنے کی غرض سے ساتویں ڈویژن کو جو عام طور پر پشاور' کوہاٹ' بنوں میں تعینات رہتا ہے اسی علاقے میں رہنے دیا جائے اور بعد میں فوج کی جانب سے دشمن پر بڑے حملے کی غرض سے اس ڈویژن کو ملتان' بہاول نگر کے پانچ سو میل جنوب میں لے آیا جائے جس کے بعد اسے ایسے علاقے میں منتقل کر دیا جائے جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ اسے ایبٹ آباد' مظفر آباد کے راستے سے' کشمیر میں داخل ہونے کی غرض سے منتقل کیا جا رہا ہے' اس دفاعی چال سے کشمیر کے علاقے میں دو حملے کئے جائیں گے جن کا نشانہ پونچھ اور چھمب کے فوجی اعتبار سے حساس علاقے ہوں گے' پونچھ پر بارہویں ڈویژن اور چھمب پر تیسویں ڈویژن کی مدد سے حملہ کیا جائے گا۔

16- بقیہ محاذ پر ایک کور کو گوجرانوالہ' سیالکوٹ' شکر گڑھ کے علاقے' چار کور کو امرتسر' ایمن آباد سے بہاول نگر کے مشرق میں فورٹ عباس تک اور اٹھارویں انفنٹری ڈویژن کو باقی علاقے میں رن آف کچھ سے لے کر عمر کوٹ' حیدر آباد اور کراچی تک کا احاطہ کرتے ہوئے' تعینات کیا جانا تھا...... یہ فارمیشنیں اگرچہ دفاعی نوعیت کی تھیں تاہم ضرورت پڑنے پر' مقامی دفاع کو بہتر بنانے کی غرض سے' دشمن کے کمزور مقامات پر حملے کے لیے پہل بھی کر سکتی تھیں اس کے علاوہ انہیں چند خصوصی فرائض بھی سونپے گئے تھے جن میں نارووال' حسینی والا' سلیمانکی میں فوجی کارروائیاں بھی شامل تھیں...... اٹھارویں ڈویژن کو راجستھان کے تیس میل اندر واقع رام گڑھ پر حملے کا مشن سونپا گیا تھا جس کے نتیجے میں کراچی اور لاہور کے درمیان مواصلاتی رابطہ مزید مؤثر ہو جاتا کیونکہ یہ رحیم یار خان بھارت سے ملنے والی جنوب مشرقی سرحد سے کافی نزدیک ہے۔

17- ماسٹر پلان میں مزید کہا گیا تھا کہ فوجی حملے کے لیے حالات سازگار کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ چند مخصوص علاقوں میں دشمن کی افواج کو دھوکے میں رکھا جائے جس کا بنیادی مقصد دشمن کو اس کے چار آزاد آرمرڈ بریگیڈز سمیت الجھائے رکھنا تھا جو اگرچہ بالائی شمالی علاقوں میں موجود تھیں لیکن جنوب میں کئے جانے والے حملے کی شکل میں مؤثر مداخلت بھی کر سکتی تھیں اس مقصد کے لیے شکر گڑھ کے علاقے کا انتخاب کیا گیا کیونکہ دشمن کی فوجوں کا بھاری اجتماع اسی علاقے میں تھا اور اس بات کے اشارے بھی مل رہے تھے کہ اس پورے علاقے پر دشمن بری نظر رکھتا ہے۔

18- جارحیت کے منصوبے میں اہم ترین کردار دو کور کو ادا کرنا تھا اس حملے کے سلسلے میں جنرل ہیڈ کوارٹرز کے ہدایت نامے کا خاص نکتہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کی صورت میں پاکستانی افواج فوری طور پر پہل کرتے ہوئے مغربی پاکستان کا محاذ کھول دیں گی اور ایک بڑا اور جارحانہ حملہ کر کے جنگی اہمیت کے بھارتی علاقے پر قبضے کی کوشش کریں گی اس حملے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس علاقے پر قبضہ کر لیا جائے جو سری کرن پور' چٹالہ' بھٹنڈہ' لدھیانہ' روپڑ اور ہری کے ہیڈ ورکس پر مشتمل ہے پہلے مرحلے میں رابطہ نہر اور جن بھان کے علاقوں پر قبضہ کرنا مقصود تھا' دوسرے مرحلے میں لدھیانہ اور تیسرے میں ہری کے ہیڈ ورکس کے علاقے پر قبضہ کیا جانا تھا۔

19- اس منصوبے کی تیاری ستمبر 1971ء کے دوران شروع ہوئی اور نومبر 1971ء میں اسے مکمل کیا گیا' تمام آرمی کور کمانڈرز اور پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف کو اس پورے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا گیا' فضائیہ کی مدد کے لیے ایمرجنسی بنیادوں پر اضافی ضروریات کے تحت' اوکاڑہ میں ہوائی اڈے کی تعمیر کی گئی جو جنگ کے آغاز پر استعمال کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

20- اس منصوبے میں ایک اہم عنصر مغربی محاذ پر ایک مخصوص ٹائم فریم کے اندر فوجی آپریشن کی کارروائیوں کو باہم مربوط اور ہم آہنگ رکھنا تھا نہ صرف باہمی طور پر بلکہ مشرقی پاکستان میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں بھی ان کارروائیوں کو مربوط رکھا جانا ضروری تھا اس وقت کے صدر کی واضح پالیسی کے مطابق (جو تسلیم شدہ فوجی حکمت عملی کے عین مطابق تھی) اگر مشرقی پاکستان پر بھارت کا حملہ ہو تو ایسی صورت میں فوری طور پر مغربی پاکستان میں بھی جنگ کا آغاز کر دیا جائے تاہم تینوں مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹرز کو ایک واضح ہدایت نامے کے ذریعے مغربی پاکستان سے جنگ

شروع کرنے کے طریقوں اور انداز کے بارے میں پیشگی طور پر کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی جنرل ہیڈ کوارٹرز نے ایم ڈے بنیادوں پر آرمی ٹائم ٹیبل تشکیل دیا' ایم سے مراد وہ دن تھا جس دن حکومت مغربی محاذ کھولنے کا فیصلہ کرے گی! ٹائم ٹیبل کا خاکہ درج ذیل ہے......

(i) ایم ڈے...... فیصلے کا دن

(ii) ایم +3/ ایم +4...... محفوظ فوجی دستوں کا وہ باقیماندہ حصہ جو اپنے مقام اجتماع سے دور اور وہاں داخلے کا منتظر ہے۔

(iii) ایم+ 5/ایم + 6 ڈی یا ڈے...... مغربی محاذ کا کھلنا...... پاکستان ائیر فورس کی جانب سے ہوائی حملے اور فوج کا ابتدائی آپریشن شروع۔

(iv) ایم+ 8 /ایم+ 9...... محفوظ فوجی دستوں کی جانب سے بڑا حملہ۔

21- مندرجہ بالا اوقات کے درمیان وقفوں کی تفصیل یوں ہے!

(الف) ایم ڈے اور ایم+ 3 /ایم+ 4 کی درمیانی مدت کے دوران ریزرو فارمیشن اس مقام تک اپنی نقل و حرکت مکمل کر لیں گی جہاں انہیں جمع ہونا ہے؛ تاہم وقت کی بچت کے پیش نظر اگر مذکورہ فارمیشن اپنے مقام اجتماع تک' فیصلے کے دن سے پیشتر ہی داخل ہو جائیں تو کم از کم دو تین دنوں کی بچت ممکن تھی۔

(ب) ایم+ 3 /ایم+ 4 کی درمیانی مدت سے لے کر ایم+ 8 /ایم+ 9 تک کے عرصے کو محفوظ دستے درج ذیل مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔

(i) دو سے تین دن احکامات کے اجراء' فائنل چیکنگ اور آگے بڑھنے کی غرض سے ریلوے کے انتظامات پر لگیں گے۔

(ii) دو دن پیش رفت اور اگلے محاذ پر مضبوط مورچوں کے علاقوں تک جانے میں صرف ہوں گے۔

(iii) ایک دن کسی غیر متوقع تبدیلی یا واقعے کے لیے وقف کیا جائے گا۔

(ج) ایم+ 5/ایم+ 6 سے لے کر ایم+ 8 /ایم+ 9 کی درمیانی مدت کے دوران یعنی جنگ شروع ہونے کے تین دن بعد' ابتدائی فوجی آپریشن مکمل کر لیا جائے گا اس دوران امید کی جاتی تھی کہ دشمن کی توجہ اور ذرائع کو گمراہ کرتے ہوئے محفوظ فوجی دستے بڑی سرعت اور آسانی سے حملہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

مغربی محاذ کھولنے میں تاخیر

22- کمیشن یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس ٹائم ٹیبل کو فوجی حملے کے اصل منصوبے میں شامل نہیں کیا گیا تھا اگرچہ یہ ایک بنیادی ضرورت تھی جس کے اثرات مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات پر مرتب ہونا لازمی تھے' جنرل ہیڈ کوارٹرز کے منصوبہ سازوں نے نومبر 1971ء سے پہلے' اس ٹائم شیڈول کو تیار نہیں کیا تھا کیونکہ ہمیں معلوم ہوا کہ اس ٹائم ٹیبل کو اس وقت کے چیف آف اسٹاف کی منظوری کے لیے بڑی تاخیر سے یعنی دس اور بارہ نومبر 1971ء کے درمیان اس وقت پیش کیا گیا جب بھارت مشرقی پاکستان کے خلاف بھرپور جارحیت کا آغاز کر چکا تھا...... اس کے باوجود' اس ٹائم ٹیبل میں بڑے حملے کے بارے میں ہائی کمانڈ کے آخری فیصلے کو جنگ کے رخ اور دشمن کے رویئے سے مشروط کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جنرل ہیڈ کوارٹرز کی سوچ کے مطابق مغربی محاذ پر جنگ کو' اسی صورت میں بامقصد اور مؤثر بنایا جا سکتا تھا کہ دشمن پر بڑے حملے میں پہل کر دی جائے۔

23- مندرجہ بالا ٹائم فریم میں مشرقی پاکستان میں جنگ چھڑ جانے کی صورت میں مغربی محاذ کھولنے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے کیونکہ اس کا فیصلہ حکومت وقت پر چھوڑ دیا گیا تھا تاہم مشرقی پاکستان پر حملہ کئے جانے سے پیشتر ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا ہوتا (نئی دہلی سے 10 نومبر 1971ء کی موصول ہونے والی ایک انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان پر یہ حملہ 20 نومبر 1971ء کو عین عیدالفطر کے دن متوقع تھا) تو 20 نومبر کے بعد کسی بھی دن' مغربی محاذ کھولا جا سکتا تھا' جس کے بعد آئندہ دو تین دنوں کے اندر بڑا حملہ ممکن ہو سکتا تھا ایک بنیادی جنگی نظریئے کی حیثیت سے 1971ء کا ماسٹر پلان بڑا اختراعی اور ہمت افزا تھا تاہم اس کی نمایاں خامی یہ تھی کہ اس میں واضح اور صاف طور پر مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا نہ اس میں صاف طور پر ان حالات اور وجوہ کا کوئی ذکر تھا جن پر کمانڈر انچیف کو دشمن پر بڑے حملے کی صورت میں غور و خوض کرنا چاہئے تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایسا شاندار فوجی منصوبہ محض ایک فرد کے تذبذب کے سبب ناکام ہو گیا جسے ایک بڑی تباہی سے تعبیر کرنا غلط نہیں ہوگا حالانکہ تسلیم شدہ حکمت عملی اور صدر پاکستان کے اعلان کی رو سے ماسٹر پلان پر فوری

طور سے اسی دن سے عمل درآمد ہونا چاہئے تھا' جس دن دشمن نے مشرقی پاکستان پر کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کرتے ہوئے اس کا برملا اعتراف بھی کیا تھا! .... ایسی صورت میں' مغربی پاکستان کے محاذ سے بڑے پیمانے پر جوابی حملے کے ذریعے (منصوبہ بندی کی تشکیل کرنے والے' کمانڈرز کے اندازے کے مطابق) اس بات کا خاطر خواہ امکان موجود تھا کہ ہماری افواج کو زبردست کامیابی حاصل ہو جاتی ... لیکن بدقسمتی سے ان معاملات کو منصوبے میں شامل نہیں کیا گیا اور ان کا فیصلہ' جنرل یحییٰ خان پر چھوڑ دیا گیا! اس سلسلے میں انہوں نے اپنے فرائض کس طرح ادا کئے اور دشمن کو فریب دینے کا ان کے ذہن میں کیا مفہوم تھا' اس پر ہم آنے والے باب میں گفتگو کریں گے کیونکہ فی الوقت' ہم دفاعی منصوبہ بندی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے رہے ہیں۔

25- جنگی منصوبے کے ایک آخری پہلو پر غور کرتے ہوئے یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہئے کہ تینوں مسلح افواج کے درمیان مشترکہ منصوبہ بندی کا شدید فقدان تھا ماسوائے اس کے کہ فوجی حملے کی منصوبہ بندی کرتے وقت جنرل ہیڈ کوارٹرز نے پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف کو بھی شریک کر لیا تھا؛ تاہم نیول ہیڈ کوارٹرز سے جنگی منصوبوں کی تشکیل کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیوی کے کمانڈر انچیف بقیہ دونوں سروسز سے الگ تھلگ ہو کر' کراچی سے کارروائی جاری رکھنے پر مجبور تھے' کابینہ کی دفاعی کمیٹی اور جوائنٹ چیفس کمیٹی نے بھی باہمی طور پر ملاقات کو ضروری نہیں سمجھا تا کہ پاکستان کے دفاع کی غرض سے ایک مربوط منصوبہ تشکیل دیا جا سکے .... نہ ہی ان کو ایسے مواقع مل سکے کہ وہ مشرقی پاکستان میں کئے جانے والے آرمی ایکشن پاکستان اور بھارت کے درمیان فوجی صورت حال پر اس کے اثرات مابعد' مغربی محاذ کے کھلنے' مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے اور مغربی پاکستان میں جنگ بندی پر خاطر خواہ غور و خوض کر سکتے .... چنانچہ اس قسم کے مبہم فیصلے یا تو جنرل یحییٰ خان نے صدر اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے کئے تھے یا پھر جنرل ہیڈ کوارٹرز نے' پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف سے مشورے کے بعد کئے ہوں گے! یہاں تک کہ فضائیہ کے ہیڈ کوارٹر کے پلاننگ اسٹاف نے بھی' منصوبہ بندی کے مرحلے پر' آرمی کے جنرل اسٹاف سے کسی بھی قسم کے قریبی رابطے کو ضروری نہیں سمجھا' ان ناکامیوں کا ناگزیر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تینوں مسلح افواج' ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہو کر اپنی اپنی جنگ لڑنے میں مصروف تھیں' نوبت بالآخر یہاں

تک پہنچ گئی کہ پاکستان ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے کمیشن کے روبرو شکایت کی کہ انہیں راجھستان کے علاقے رام گڑھ پر کیے جانے والے حملے سے بھی بروقت آگاہ نہیں کیا گیا انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جنرل ہیڈکوارٹرز نے جنوب میں بڑے حملے کی منسوخی کے بارے میں بھی ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا جس کے لیے انہوں نے فضائیہ کے ایک بڑے حصے کو مکمل تیاری کی حالت میں رکھا ہوا تھا ان معاملات پر ہم اس وقت تفصیلی غور کریں گے جب جنگ کی بلند تر سطح اور منصوبوں پر عمل درآمد کا سوال زیر بحث آئے گا تاہم یہ موجودہ تناظر میں بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ فوجی منصوبہ بندی کی پوشیدہ خامیوں اور کمزوریوں سے قطع نظر ان سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہماری دفاعی تیاریاں اور فوجی طریقہ کار اس قدر ناقص اور کمزور تھا کہ مربوط اور مشترکہ منصوبہ بندی کے باوجود ہم دفاع پاکستان کے حوالے سے بہتر نتائج حاصل کر سکتے تھے.........

26-ہمارے اخذ کردہ نتائج کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

(الف) ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کے دفاعی منصوبوں کی تشکیل تینوں مسلح افواج نے ایک دوسرے سے مکمل طور پر الگ تھلگ ہو کر کی تھی؛ جنرل یحییٰ خان نے' کابینہ کی دفاعی کمیٹی اور جوائنٹ چیفس کمیٹی کا بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جن کے مشوروں سے ایک باہمی طور پر مربوط منصوبہ تشکیل دیا جا سکتا تھا تقریباً تمام ہی اہم فیصلے یا تو جنرل یحییٰ خان نے کیے یا پھر جنرل ہیڈکوارٹرز نے' اس سلسلے میں جنگ کی بلند تر سطح یا مقصد کا تعین کرنے والی مشینری سے بھی قطعاً کوئی مشورہ نہیں لیا جو اسی مقصد کے لیے تشکیل دی گئی تھی' بہرکیف اس معاملے میں واحد استثنائی مثال' ایئر مارشل رحیم خان کی دی جا سکتی ہے جو پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف تھے جن سے فوجی حملے کی منصوبہ بندی کرتے وقت جنرل ہیڈکوارٹرز نے ضروری مشاورت کی تھی اور جن سے اکثر اوقات' جنرل یحییٰ خان بھی صلاح مشورہ کرتے رہتے تھے۔

(ب) ایسٹرن کمانڈ کے تشکیل کردہ دفاعی منصوبے کو جنرل ہیڈکوارٹرز کی جانب سے منظوری دیتے وقت اس منصوبے کی درج ذیل خامیوں' کمزوریوں اور نقائص کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا......

(i) اس میں ایسے کسی مرحلے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا جس پر مشرقی پاکستان کی سرحدوں سے فوج کو واپس بلاتے ہوئے سابقہ دفاعی پوزیشنوں پر لانا اور اس مقصد کے لیے

دانستہ طور پر چند علاقوں سے دست بردار ہونا بھی شامل تھا تاکہ ان افواج کو ڈھاکہ شہر کے دفاع کی غرض سے طویل فاصلے تک دوبارہ تعینات کر دیا جاتا۔

(ii) فوجی قلعہ بندیوں کی تعمیر کے نظریئے کو اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ' اس بات کو یقینی بنایا جانا اشد ضروری تھا کہ ان قلعہ بندیوں کے عقب میں زبردست حملہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ایسے فوجی دستے تعینات کیے جاتے جو دشمن کی جانب سے قلعہ بندیوں پر قبضے کی کوشش ناکام بنا دیتے اور اس پر اچانک حملہ کر کے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیتے۔

(iii) اس منصوبے میں' پاکستانی افواج کی دست برداری اور مغربی پاکستانی اہلکاروں کے انخلا کا ایسا امکانی نقشہ نہیں پیش کیا گیا جس کی مدد سے مشرقی پاکستان پر بھارتی قبضے کے بعد انہیں زمینی یا سمندری راستے سے' برما کی طرف روانہ کیا جا سکتا تھا۔

(ج) جنرل ہیڈکوارٹرز' ڈھاکہ شہر کے تفصیلی دفاعی پلان کی جانچ پڑتال میں بھی ناکام ثابت ہوا' جس کی بنیاد اس غلط فہمی پر تھی کہ اس سارے معاملے کی تفصیلات' ایسٹرن کمانڈ' اپنی متعلقہ ٹیکٹیکل فارمیشن کے مشوروں سے طے کرے گی .... سیاسی اور فوجی اعتبار سے ڈھاکہ شہر کی تسلیم شدہ بنیادی اہمیت کے پیش نظر نیز اس حقیقت کے باوصف کہ سقوط ڈھاکہ کا نتیجہ مشرقی پاکستان کے خاتمے کی صورت میں برآمد ہوگا' جنرل ہیڈکوارٹرز پر لازم تھا کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع کی غرض سے ایسٹرن کمانڈ کو مناسب راہ نمائی کرتا' ہدایات اور احکامات دیتا تاہم وہ ایسا کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا.........

(د) مغربی پاکستان کے جنگی محاذ کے حوالے سے بنائے گئے ماسٹر پلان میں بھی ایک بہت بڑی خامی نمایاں طور پر موجود تھی کہ اس میں واضح طریقے سے مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے صحیح وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا نہ ہی اس میں وضاحت کے ساتھ' وہ حالات اور عوامل بیان کیے گئے تھے جو دشمن پر بڑے فوجی حملے کی غرض سے' کمانڈر انچیف کے علم میں لائے جانے ضروری تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرد کے انفرادی تذبذب اور ہچکچاہٹ کی وجہ سے یہ زبردست منصوبہ بالآخر بربادی سے ہمکنار ہو گیا! حالانکہ منظور شدہ جنگی حکمت عملی اور صدر پاکستان کے عوامی خطاب کی رو سے اس ماسٹر پلان پر فوری طور پر اسی دن سے عمل درآمد ہونا ضروری تھا جس دن دشمن نے مشرقی پاکستان پر کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کیا تھا۔

جب کبھی موقع ملا بھارت حملہ کرے گا

1:- برصغیر کی سیاسی تاریخ اور آزادی سے قبل کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے فوجی نقطہ نظر سے ہمیں بھارت کو مسلسل خطرہ تصور کیا جانا چاہئے تھا۔ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری خارجہ پالیسی اور فوجی طرز عمل کی بنیادیں صرف اس بات پر رکھی جاتیں کہ بھارت ہمارا دشمن ہے۔ بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سلامتی کو لاحق خطرات کی تشخیص کرتے ہوئے بھارت کا ہمارے ساتھ معاندانہ رویہ ذہن میں رکھا جانا چاہئے تھا کیونکہ اس نے کبھی بھی تقسیم برصغیر کو تسلیم نہیں کیا اور اسے جب بھی موقع ملا وہ اس بہانے ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔

2:- درحقیقت 1971ء کے تمام ریکارڈ کے مطابق حکومت (بھارت کے) اس خطرے سے آگاہ تھی۔ 19 مئی 1971ء کو قومی سلامتی کونسل نے ''پاکستان کو لاحق خطرات'' کے نام سے ایک دستاویز تیار کی اس میں مختصر انداز میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی اور بیرونی خطرات کا ذکر کیا گیا۔ اس میں نشاندہی کی گئی کہ پاکستان کن نظریاتی بنیادوں پر بنا اور ہم میں کس طرح نااتفاقی پیدا ہو گئی۔ اس نااتفاقی کی بنیادی وجہ بھارت کی طرف سے چھیڑ چھاڑ تھی جس کا مقصد ہم میں علاقائی اور مقامی سوچ پیدا کرنا تھی' بیرونی نظریات اور غیر ملکی پروپیگنڈہ کے نوجوان نسل کے ذہن پر اثر اور زبان کا ناحل شدہ مسئلہ کے باعث یہ رجحانات ابھرے۔ اس علاقائی سوچ نے انہیں انتشار کی طرف دھکیل دیا۔

اس نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے دستاویز میں پاکستان پر بھارتی حملے کا خدشہ ظاہر کیا گیا اور اس کی یہ بنیادی وجوہات بتائی گئیں:

1:- بھارت' بنگلہ دیش کی مدد کے بہانے ہم پر حملے کا جواز تلاش کرے گا اور عالمی رائے عامہ بھی ان کے مخالف نہیں ہوگی۔

2:- مشرقی پاکستان میں فوج کا ایک موقف ہوگا کہ وہ باغیوں کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں اور مارچ 1971ء تک مشرقی پاکستان رائفلز کی زیر نگرانی کرنے والی اہم سرحدی چوکیوں پر تعیناتی کا جواز بن جائے گا اس کے وجہ سے بھارتی جارحیت کی کامیابی کا خدشہ بڑھ

جائے گا۔

3:- مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی وجہ سے وہاں کی بڑی آبادی الگ تھلگ ہو چکی تھی اور درحقیقت بھارت باغیوں کی مدد کر رہا تھا۔

بھارتی جارحیت کے خطرے کو نظر انداز کر دیا گیا

4: آئی ایس آئی نے جون 1971ء میں ایک اور دستاویز میں واضح طور پر بھارت کے ساتھ جنگ کے امکان کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ بلکہ اس نے بھارتی حملے کا طریقہ اور بری بحری اور فضائی افواج کی تعداد اور اقسام کے متعلق بھی واضح اندازہ پیش کیا۔ تاہم حیرت کی بات ہے کہ اس رپورٹ کے بعض حصوں میں مصنفین نے کیوں بھارتی جارحیت کے خطرے کو نظر انداز کیا۔ مثال کے طور پر ایک پیراگراف میں وہ لکھتے ہیں۔

> دونوں ممالک کے درمیان اس سے پہلے کبھی جنگ کا اتنا زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن بھارتی حکومت پاکستان کے ساتھ جنگ کے مضمرات سے بھی آگاہ ہے اس لئے اس (بھارت) نے ابھی تک ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر کے مشرقی پاکستان پر جارحیت کو ٹالا ہوا ہے

دوبارہ ایک دوسرے پیراگراف میں کہا گیا:

> اس بات کا امکان نہیں کہ بھارتی حکومت عالمی توجہ یا سیاسی دباؤ کو نظر انداز کر کے پاکستان کے ساتھ جنگ میں ملوث ہو۔ تاہم دستاویز میں خبردار کیا گیا کہ دونوں ممالک کی افواج پہلے ہی فوجی لحاظ سے غیر متوازن ہیں پاکستان کے ساتھ حد سے زیادہ فوجی طاقت کا توازن بگڑنے پر بھارت جنگ پر اتر سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ توازن کو اس حد تک بگڑنے سے بچایا جائے اس پر صدر نے لکھا کہ تمام افواج کے ہیڈ کوارٹر اس دستاویز کا جائزہ لیں۔

5:۔ دستاویز میں مبہم نتائج اخذ کرنے کے باوجود یہ بات ظاہر تھی کہ کم از کم بھارتی مداخلت کے خطرے کی طرف حکومتی توجہ مبذول کروادی گئی تھی۔

6:۔ ستمبر 1971ء میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹریٹ نے بھارتی فوجی اقدام کے متعلق یوں کہا کہ ''پاکستان اور اس کی فوج کے بڑے حصے کو تباہ کرنے کے سیاسی عزائم کی خاطر

بھارت مشرقی پاکستان میں اپنی مرضی کے حل کی تیاری کر رہا ہے۔ مئی 1971ء میں ذمہ دار بھارتی رہنما اس طرح کے بیانات دینے لگے تھے کہ مشرقی پاکستان کی صورتحال نے بھارت کو مداخلت کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ سیکرٹری صحت اور بہبود ریاض الدین احمد نے بھی ایک عالمی سیمینار میں بھارتی مندوبین کے ساتھ گفتگو سے ان کے عزائم کا اندازہ لگا کر براہ راست معلومات حاصل کر لی تھیں جن کے مطابق بھارتی مداخلت سے متعلق پیشگوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ غیر ملکی اخبار نویسوں نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی فوجی اجتماع کی خبریں شائع کرنی شروع کر دیں۔ اس بھارتی فوجی اکٹھ کا مفہوم واضح تھا۔

7:۔ اس دوران مئی 1971ء سے بھارتی وزیراعظم اور وزیر خارجہ مشرقی پاکستان سے مہاجرین کے بڑے پیانے پر بھارتی انخلاء کے بارے میں بیانات اور مشرقی پاکستان (جسے انہوں نے بنگلہ دیش کہنا شروع کر دیا تھا) کے معاملے کے سیاسی حل پر زور دینے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کا طرز عمل ان کی سرحدوں پر مسائل پیدا کر رہا ہے۔ اس طرح بھارت واضح انداز میں مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت کے جواز کا بہانہ تراش رہا تھا وگرنہ یہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہوتا جس میں اقوام متحدہ کے علاوہ کسی اور کو مداخلت کی اجازت نہ ہوتی۔

8:۔ حیرانگی کی بات ہے کہ 10 جون 1971ء میں ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس نے تجزیہ پیش کیا کہ "بھارت جارحانہ انداز اور مسلسل اشتعال انگیز بیانات کے باوجود پاکستان سے مکمل جنگ نہیں چھیڑے گا بلکہ اس کی جگہ باغیوں کو مدد دینے اور محدود علاقے پر قبضے کے لیے سرحد کے قریب حملہ کر سکتا ہے"۔ باوجود اس کے یہ تسلیم کیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں مختصر نوٹس پر ایک محدود حملے کا یقینی خطرہ ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ خطرے والے علاقوں جیسور' شمالی بنگال' سلہٹ اور اخوارا سیکٹر کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد باغیوں کو بھارت کی مدد کا ذکر کر کے کچھ اور سفارشات پیش کی گئیں۔

9:۔ اس مفروضہ کے بعد حکومت کے ذہن میں بھارتی حملے کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس رپورٹ کا حکومت کے ذہن پر کیا اثر ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کا یہ نوٹ پڑھنے کے قابل ہے۔

10:۔ میں ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس کے خیالات سے عمومی طور پر اتفاق کرتا ہوں مکتی

باہنی کے 30 سے 40 ہزار جوانوں کو تربیت دینے کے بعد بھارت انہیں موجودہ کارروائی میں شدت پیدا کرنے کی خاطر مون سون کے بعد حرکت میں لائے گا۔ اس عرصہ میں بھارت اپنی سرحدوں سے تمام مہاجرین کو ہٹا لے گا۔ یہ کارروائی شروع بھی ہو چکی ہے۔ پس مون سون کے خاتمہ پر جب مکتی باہنی کے تربیت یافتہ باغیوں کے خلاف مشرقی پاکستان میں ہماری افواج مصروف ہوں گی تو بھارت ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کر کے آسان فتح حاصل کر سکتا ہے۔ اگر یہ ظاہر بھی ہو جائے کہ اس نے کھلی جارحیت کی ہے تو وہی بہانہ بنائے گا کہ مشرقی پاکستان میں متواتر شورش سے اس کے مشرقی صوبوں میں امن و امان خراب ہو رہا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے تسلسل کے ساتھ کہا ہے کیونکہ مارچ اور اکتوبر کے آخر تک 6 ماہ پڑے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہماری یقینی فوجی شکست سے مغربی بازو میں فوج کا وقار کمزور ہوگا تاوقتیکہ ہم نے جنگ شروع نہ کی۔ پس ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں کہ یہاں (مغربی پاکستان میں) بھارت کے ساتھ لڑیں یا صرف مشرقی پاکستان کے خلاف کارروائیوں کا مقابلہ کریں۔ یہ دونوں انتخاب بڑے مشکل ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی اور دفتر خارجہ مستقبل میں اس حد تک جانے پر تعریف کے قابل ہیں۔

11:۔ بھارتی دستوں کی نقل و حرکت اور مقامی جھڑپوں کی متواتر انٹیلی جنس رپورٹوں کے باوجود اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ جنرل یحییٰ اور جنرل حمید سمیت پاک فوج کی اعلیٰ قیادت کا کہنا تھا کہ کھلم کھلا بھارتی مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں پایا گیا۔ یہ جنرل یحییٰ کے خوابوں کی دنیا میں رہنے کی ایک اور مثال ہے جو حقیقت سے بہت دور تھی۔ انٹیلی جنس کے علاوہ اس وقت کے سیکرٹری خارجہ نے ہمیں بتایا کہ اگر صدر نے بھارتی مداخلت کو خارج از امکان قرار دیا تو یہ ان کی بھول تھی۔ دشمن کی فوج کی طرف سے اکتوبر 1971ء کے بعد سے مشترکہ حملے کے لئے کوارڈی نیشن لیفٹیننٹ جنرل اروڑہ (جی او سی ان سی) مشرقی کمانڈ کے ذمہ تھی جس کے پاس 8 ڈویژن پر مشتمل 3 کوروں کی نفری تھی۔ ان میں سے دو ڈویژنوں اور ایک بکتر بند رجمنٹ پر مشتمل نمبر 2 کور جیسور' کشتیا' کھلنا' دو ڈویژنوں ایک آزاد بریگیڈ اور دو بکتر بند رجمنٹوں پر مشتمل نمبر 3 کور دیناج پور' رنگپور' بوگرا اور تین انفنٹری ڈویژنوں اور دو اضافی بریگیڈز پر مشتمل نمبر 4 کور سلہٹ' کومیلا' فینی' چٹاگانگ کے علاقے میں لڑنے کے لئے تیار تھی۔ جبکہ دو اضافی بریگیڈز کو حوض شاہی' حجال پور میں لڑنا تھا کلکتہ میں ایک پیراشوٹ بریگیڈ کو کمانڈ ریزو کے طور پر

رکھا گیا۔ چین کے ساتھ سرحدوں پر تعینات کئی آرٹلری بریگیڈز کو بھی مشرقی پاکستان میں مدد کے لئے بلالیا گیا یہ تمام افواج ملا کر بی ایس ایف کی 35 بٹالینیں دشمن کے پاس تھیں۔

11:۔ بھارتی فضائیہ کے مشرقی پاکستان میں 11 سکواڈرنز تھے جن کی تفصیل یہ ہے۔

سب سونک ہنٹر فائیٹر سکواڈرن 4
سب سونک ناٹ (gnat) فائیٹر سکوارڈرن 3
سپر سونک (مگ 21) فائیٹر سکواڈرن 3
سپر سونک (su7) فائیٹر سکواڈرن 1
کل=11

12:۔ دریائی اور سمندری مدد کے لئے دشمن کے پاس وشاکا پٹنم کا بحری اڈہ تھا جہاں خاص طور پر آبدوزوں کا مرکز بنایا۔ خلیج بنگال میں تعینات بھارتی بحری بیڑے میں ایک آبدوز بٹالین گروپ میں زمین پر اترنے والی فورس جسے ٹینکوں کے سکواڈرن کی مدد مہیا تھی۔ ۵ پٹرول کرافٹ' بی ایس ایف کے 20 سے 25 پٹرول کرافٹ اور کچھ فریگیٹ اور تباہ کن جہاز بھی موجود تھے۔ (پٹرول کرافٹ سے مراد جنگی کشتیوں سے ہے جو دیکھ بھال کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں)۔

مزید برآں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تیز نقل وحرکت اور آسانی سے ایک سے دوسری جگہ تعینات ہونا بحری فوج کی خصوصیت ہوتی ہے۔ پس خلیج بنگال میں موجود افواج ضرورت کے تحت فوجی ساحل کے قریب موجود بھاری بحری بیڑے کی مدد بھی لے سکتی تھیں۔ یہ بیڑا ایک طیارہ بردار جہاز دو کروزر جہازوں' 3 آبدوزوں' 21 تباہ کن جہازوں فریگیٹ اور 8 میزائل بردار کشتیوں پر مشتمل تھا۔ بھارت نے نومبر 1971ء میں جنگ سے پہلے ہی طیارہ بردار جہاز اور آبدوز کو خلیج بنگال میں بھیج دیا تھا۔ پس بھارت کو مشرقی پاکستان کی مکمل ناکہ بندی کی صلاحیت حاصل تھی جس کی آئی ایس آئی اور این ایچ کیو نے اپنی انٹیلی جنس سمریوں میں واضح نشاندہی بھی کی تھی۔ دشمن کو بیک وقت پیراشوٹ کے ذریعے ایک بریگیڈ اور ہیلی کاپٹروں سے ایک بٹالین گروپ کو اتارنے کی بھی صلاحیت حاصل تھی۔

13:۔ دوسری طرف بھارت مغربی پاکستان میں کشمیر کے محاذ پر کنٹرول لائن پر 15

کور کے تین ڈویژن اور عام بریگیڈ گروپ کے ذریعے چھمب اور اکھنور سمیت دفاعی پوزیشن برقرار رکھ سکتا تھا۔ جموں' کٹھوا علاقے میں وہ ایک ڈویژن فوج رکھ کر شالی ون ڈویژن 54 آزاد بکتر بند بریگیڈ نمبر 16 مشرق سے امدادی فوج اور ڈویژن نمبر 39 کے ذریعے شکر گڑھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ جنگ سے پہلے اس کا ڈویژن نمبر 36 اور دو بکتر بند بریگیڈ اضافی موجود تھے۔ اس کے علاوہ امین آباد امرتسر میں بکتر بند بریگیڈ نمبر 17 اور دوسرا بریگیڈ نمبر 2 گورداسپور میں گشت کر رہا تھا۔

14:۔ لاہور کی طرف بھارت دو ڈویژن فوج رکھ کر دو بریگیڈ ریزرو رکھ سکتا تھا۔

15:۔ علاوہ ازیں جنوبی بھارت میں فاضلکا علاقہ کے فیروز پور سلیمانکی سیکٹر پر وہ ایک ڈویژن لاکر مقابلہ کر سکتا تھا جبکہ دو بکتر بند بریگیڈز ریزرو رکھے جا سکتے تھے۔ مزید جنوب میں وہ راجگوڑھ سے کچھ کے علاقہ میں 750 میل کی سرحد کا صحراؤں میں تربیت یافتہ دو ڈویژنوں سے دفاع کر سکتا تھا۔ یہ ڈویژن ہمارے دفاع میں کمزوری کو دیکھتے ہوئے موقع پاکر جارحیت پر بھی اتر سکتے تھے۔

مغربی محاذ پر دشمن کی فضائی قوت

16:۔ مغربی پاکستان کی سرحد پر کہیں بھی خلاء ملنے پر موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مکسیر فرنٹ پر دشمن کا پہلا بکتر بند بریگیڈ موجود تھا۔ جو راجستھان / کراچی یا شمال کے مرکز کی طرف حرکت میں آ سکتا تھا۔

17:۔ مغربی پاکستان کے محاذ پر بھارتی فضائیہ کی تعداد یہ تھی:

سب سونک بمبار (کینبرا) اسکواڈرن...... 3

سب سونک فائٹر (میسٹر) اسکواڈرن...... 3

سب سونک فائٹر (ہنٹر) اسکواڈرن............ 3

سب سونک فائٹر (ناٹ) اسکواڈرن...... 5

سپر سونک فائٹرز (HF24) اسکواڈرن...... 2

سپر سونک فائٹرز (SU7) اسکواڈرن...... 6

سپر سونک فائٹرز (مگ 21) اسکواڈرن...... 6

کل 28

18:۔ بحری فوج میں دشمن کے پاس مغربی بیڑے میں (8) OSSA میزائل بردار کشتیاں، دو آبدوزیں، دو کروزر اور 18 تباہ کن جہاز / فریگیٹ تھے۔ اسے میری ٹائم اینٹی سب میرین طیارہ بردار جہاز کی مدد بھی حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے بھارت کراچی کی ناکہ بندی اور موقع ملنے پر پاکستانی بحریہ کو تباہ کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔

19:۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ کیا صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہمیں مشرقی پاکستان میں اپنی دفاعی صلاحیت کو بڑھانا نہیں چاہیے تھا؟ ہم نے کسی اور جگہ یہ بیان کیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کی مغربی پاکستان پر ذمہ داری کے روایتی نقطہ نظر میں 1971ء کے حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ رد و بدل کیا جانا چاہیے تھا۔ خطرے کے باوجود مشرقی پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔

اس وقت کے متعلقہ افراد نے عام طور پر جو وضاحت پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں فوج کا اضافہ کر بھی دیا جاتا تو اس کے باوجود کوئی مادی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ نظریہ خالصتاً دفاع کے اس نقطہ نظر سے مطابقت رکھتا ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اگر یہ نقطہ نظر درست مانا جائے تو مشرقی پاکستان میں جنگ چھڑنے کے بعد فوری طور پر مغربی محاذ کھول دینا چاہیے تھا۔

مشرقی پاکستان کا دفاع مضبوط نہ بنانے کی وضاحت کی طرف واپس آتے ہوئے ہمیں علم ہے کہ اس کے باوجود 26 اور 27 نومبر 1971ء کو مشرقی پاکستان میں تین انفنٹری بٹالینیں بھیجی گئیں جو اس نظریہ کے برعکس تھا۔

جنرل یحییٰ نے حقائق کو نظر انداز کیا

20:۔ دوسری وضاحت یا دوسرے لفظوں میں پہلی وضاحت کو ایک اور طریقے سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں افواج کی تعیناتی سے مغربی پاکستان کمزور ہو سکتا تھا۔ ہم اس وضاحت سے بھی مطمئن نہیں ہو سکے۔ مشرقی پاکستان میں بھارتی خطرے کا دفاعی تجزیہ ہی نہیں کیا گیا جس کی بنیاد پر اضافی فوج بھیجی جاتی تھی۔ اگر یہ تجزیہ ہوتا تو حقیقت سامنے آتی کہ مشرقی پاکستان کو واضح طور پر چار حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ان حصوں میں کم سے کم ایک ڈویژن فوج تعینات کرنے کی ضرورت تھی۔ بعد میں اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اضافی دستے بھیجے بھی گئے اور عارضی طور پر ایک ڈویژن بنا کر تعینات کیا گیا۔ دوسرے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں سرحدوں کی طوالت بھی شامل ہے ایک ڈویژن میں موجود تین بریگیڈز کو اس علاقے میں استعمال کیا جاتا تو پیچھے ریزرو باقی نہیں رہتی تھی اس لئے ہر حصے کے لئے ایک اضافی بریگیڈ بھیجنا ضروری تھا۔

21:۔ یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے تھی کہ جونہی نومبر کے وسط میں سردیاں شروع ہوں گی بھارت کو چین کے ساتھ سرحد پر زیادہ دستے لگانے کی فکر نہیں ہوگی۔ روس پہلے ہی بھارت کی مدد کر رہا تھا۔ اس لئے اسے کسی طاقت کی مداخلت کا خدشہ نہیں تھا۔ اگر بھارت نومبر کے وسط کے بعد مشرقی پاکستان میں مداخلت کا وقت طے کرتا تو اسے مندرجہ بالا افواج کے ساتھ ساتھ شمالی مشرقی سرحد پر تعینات فوج کی بھی مدد حاصل ہوتی۔ مغربی اور مشرقی سرحد پر اس کی

طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے ہم نے ان افواج کا خیال ہی نہ کیا جو 5 ڈویژنوں کے برابر تھیں۔ ان میں سے ایک یا دو ڈویژن کو وہاں سے ہٹا کر بھارت مشرقی پاکستان میں تعینات کر سکتا تھا۔ اس لئے یہ پیش بینی مشکل نہ تھی کہ بھارت اپنی مداخلت کے لئے حالات و واقعات کا اس طرح وقوع پذیر ہونا پسند کرے گا جس میں نومبر کے دوران اس کی مداخلت کی فضا ساز گار ہو جائے۔ ان تمام حقائق کو دیکھتے ہوئے ہماری حکومت کو معلوم ہو جانا چاہئے تھا کہ بھارت 15 نومبر کے بعد مداخلت کرے گا جبکہ انٹیلی جنس اداروں نے اس تجزیئے کو اعلیٰ حکام کے سامنے پیش بھی کیا' اس طرح یہ خطرہ مکمل طور پر عیاں ہو گیا۔ لیکن جنرل یحییٰ اور جنرل حمید کے اس بات پر قائم رہنے پر کہ بھارت ہم سے جنگ نہیں کرے گا ہم صرف اس واحد نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ عوامی لیگ کے ساتھ مذاکرات نہ کرنے کی ضد پر اڑے رہنے والے جنرل یحییٰ نے حقائق کو نظر انداز کیا اور محض اپنی اس خواہش پر مبنی خیالات میں گم رہے کہ بھارتی مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

22:۔ صدر حقائق کا سامنا کرنے سے جی چرا رہے تھے اسی طرح دوسری طرف انتہا پسند عناصر بھی خوابوں کی دنیا میں رہ رہے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں دورہ چین کے انتہائی مراحل پر پاکستان کو جنگ سے گریز اور مسئلے کے حل کے دوسرے تمام طریقے استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا لیکن اس بات کے کافی ثبوت ہیں کہ فضائیہ کے سربراہ ائیر مارشل رحیم خان اور چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اس مشورے کو قبول کرنے کے یکسر مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں بھارت کے ساتھ حساب برابر کرنے کا اب موقع ملا ہے۔ گو وہ اس عمل میں مشرقی پاکستان گنوا بیٹھے۔ اس سنگدلانہ اور بالکل غیر حقیقت پسندانہ آرزو سے ہمیں بڑا صدمہ ہوا ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مغربی پاکستان میں دوسرا محاذ کھولنے کے عمل کو مشرقی پاکستان پر دباؤ کم کرنے یا اتنا علاقہ ہی حاصل کرنے کا جواز تھا جس کے بعد ہم بھارت کے ساتھ مذاکرات کی میز پر سودے بازی کی پوزیشن میں آ جاتے۔

اس موقع پر کسی پاکستانی کے لئے مشرقی پاکستان کو سیاسی حقوق میں سے جائز حصہ نہ دینے بلکہ علاقے کو ہی تباہ و برباد کرنے کی بات ایک ظلم اور قیام پاکستان کے تمام اصولوں اور نصب العین کے برعکس تھی۔ اگر مشرقی پاکستان کو تباہ و برباد کرنا ہی تھا تو مغرب میں جنگ شروع کرنے کا کیا جواز باقی رہ گیا تھا۔ اگر اس جواز کو بھی ایک طرف رکھ دیا جائے تو ہم کس طاقت کی بنا پر حساب برابر کرنے کی بات کر رہے تھے۔ گو بھارت کے کچھ دستے مشرقی پاکستان اور کچھ

چین کی سرحد پر لگے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود مغربی پاکستان کے محاذ پر ہمارا اس سے مقابلہ نہ تھا۔ (وہ تعداد میں بہت زیادہ تھا) ان حالات میں مشرقی پاکستان کو فارغ کرنے کی ہماری کوشش بھی بے کار تھی۔ مشرقی پاکستان کو ہاتھ سے جانے دینے کے خیال کے ساتھ ہم یہ بالکل نہ سمجھ سکے کہ ہم مغربی محاذ پر بھارت کو کس طرح شکست دے سکتے ہیں اور کس بنیاد پر ہم اس سے جنگ لڑیں گے۔

افرادی قوت کی منصوبہ بندی کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔

مسلح افواج کی تیاری کے کوائف

1...... مسلح افواج کی تیاری کا جائزہ لینے کا سوال سب سے پہلے افرادی قوت کی موزونیت اور دوسرے ان کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ 1971ء میں ہمارے حالات کے تناظر میں مارشل لاء کے فوج کی پیشہ ورانہ مہارت پر اثرات کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔

2...... یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ مسلح افواج یا قومی سطح پر افرادی قوت کی منصوبہ بندی کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مارچ 1971ء میں جنگ کے خطرے کے باوجود اس سوال کو جنرل اسٹاف نے قابل غور نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ چیف آف جنرل اسٹاف نے بھی اس اہم سوال میں دلچسپی ظاہر نہ کی۔

3...... یہ سچ ہے کہ ہم نے اوپر جنرل ہیڈ کوارٹر کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور وزارت دفاع اور وزارت خزانہ کو زیر غور لانے میں ناکام رہے۔ ان دونوں پر بھی اپنی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے صدر بننے کے بعد وزارت دفاع کا کردار محض انتظامی نوعیت کا رہ گیا۔ بہر حال کسی پر الزام لگانے کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ اس مسئلہ پر توجہ نہیں دی گئی۔

4...... مارچ 1971ء میں ہنگامی صورت حال پیدا ہونے کے وقت مشرقی پاکستان میں 53 ہزار ریزرو افرادی قوت تھی حالانکہ وہاں ایک لاکھ 10 ہزار کی ضرورت تھی۔ بہر حال مارچ 1971ء کے بعد 53 ہزار کی تعداد میں اضافہ نہ ہوا جب 3 دسمبر 1971ء میں جنگ شروع ہوئی تو وہاں پرانے فوجی ملازمین کے سوا کوئی تربیت یافتہ افرادی قوت موجود نہ تھی۔

5...... مطلوبہ تعداد میں افرادی قوت مہیا کرنے کے لئے لازمی سروس آرڈیننس کی

ائن پر قانون سازی کی جانی تھی گو اپریل میں اس کی طرف قدم اٹھایا گیا لیکن 4 دسمبر 1971ء تک یہ آرڈیننس نہ لایا گیا۔ ہم اس تباہ کن اور حد سے زیادہ تاخیر کی وجہ جاننے سے قاصر ہیں۔

6...... بحریہ کے معاملے میں اپریل 1971ء میں مرحلہ وار موبلائزیشن پلان یا لام بندی کا منصوبہ بنا جس کے تحت فلیٹ ریزروسٹس اور 40 سال کی عمر تک کے پنشنروں کو واپس بلایا گیا۔ تاہم مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت عمر کی حد کو پہلے 48 اور پھر 50 برس کر دیا گیا۔ بعد میں آئی ایس پی آر نے نیول ہیڈ کوارٹر کے ساتھ صلاح مشورے کے بغیر پریس ریلیز جاری کر کے عمر کی حد ایک بار پھر 55 برس کر دی۔

7...... پاک فضائیہ کی نفری اس وقت 18509 افراد پر مشتمل تھی حالانکہ 22,282 کی ضرورت تھی۔ مشرقی پاکستان کے 4720 افراد سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا تھا جس کے بعد افرادی قوت کی شرح گر کر 62% تک آ گئی۔ پہلے 1961ء میں فارغ کئے جانے والے ایئرمینوں کو بلایا گیا۔ بعد میں اس تاریخ کو 1958ء تک لا کر کل 1806 ایئرمینوں کی خدمات دوبارہ حاصل کر لی گئیں اس کے علاوہ ڈیپوٹیشن پر بیرونی ممالک میں قیام پذیر 189 ایئرمینوں کو واپس بلایا گیا لیکن یہ 6 دسمبر یا اس کے بعد پہنچے۔

8...... ایئرفورس میں سویلین افراد کی بھرتی کے لیے رپورٹ حکومت سندھ کو بھیجی گئی یہاں سے کسی نہ کسی طرح یہ مطلوبہ تعداد پوری ہو گئی۔ جبکہ پی آئی اے سے 83 ٹیکنیشنوں اور 110 موٹر ٹرانسپورٹ ڈرائیوروں کو بھی ایئرفورس بھیج دیا گیا۔

9...... لوگوں کی سب سے زیادہ ضرورت بری فوج میں تھی اور ایڈجوٹنٹ جنرل برانچ کو شکایت ہے کہ بھرتی کے لئے آرڈیننس کے نفاذ کا کیس اپریل 1971ء میں تیار ہونا شروع ہوا لیکن اسے آخر 4 دسمبر 1971ء میں نافذ کیا گیا یہ یقیناً بہت زیادہ تاخیر تھی۔ وزارت دفاع کے مطابق تاخیر خود جی ایچ کیو کی وجہ سے ہوئی۔ ہمیں جو کچھ ثبوت مل سکا ہے اس کے مطابق وزارت دفاع کو ایڈجوٹنٹ جنرل کی طرف سے 15 اپریل 1971ء کو جو ہدایت ملی تھی وہ صرف ڈاکٹروں کی کمی کے بارے میں تھی۔ اس میں محدود مقصد کے لئے آرڈیننس جاری کرنے کو کہا گیا تھا اس کے بعد سرکاری طریقہ کار شروع ہوا اور بالآخر یہ 16 جون کو منظور ہوا۔

جنگ کے باوجود تاخیر

اس موقع پر ایڈجوٹنٹ جنرل برانچ نے کہا کہ یہ آرڈیننس ڈاکٹروں کے ساتھ انجینئروں کے متعلق بھی ہونا چاہئے اسے مرتب کر کے 26 نومبر کو دوبارہ منظور کیا گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس وقت تک مشرقی پاکستان میں جنگ شروع ہو چکی تھی لیکن ایڈجوٹنٹ جنرل نے یہ حکم دے دیا کہ ان کی ہدایت تک آرڈیننس کا نفاذ روک لیا جائے۔ وزارت دفاع تاخیر کی ذمہ دار تھی یا نہ تھی لیکن یہ بات واضح ہے کہ ضرورت کے تحت تیز رفتاری کے بالکل برعکس کیس سست روی سے نمٹایا گیا۔

10...... قانون سازی میں تاخیر کے نتائج اس طرح سامنے آئے کہ جب آخر کار ریزروفورس اور دوسروں کو بلایا گیا تو مکمل تربیت دینے کا وقت نہیں تھا اور کمتر درجے کی تربیت دی گئی۔ تربیت کا معیار تو برا تھا ہی' لیکن ان نئے فوجیوں کو دوسروں کی طرح کی تربیت دی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس تاخیر کی وجہ سے ان کی تعیناتی والے مراکز میں بھی نظام درہم برہم ہو گیا۔ مثال کے طور پر جب یہ نئے فوجی آنے شروع ہوئے تو ان کے کھانے تک کے انتظامات نہیں تھے۔ ایک مرکز پر مخیر شہری نے ایک دن تو کھانا فراہم کیا لیکن اگلے روز ہی ان نئے فوجیوں کو واپس جانے کا حکم دے دیا گیا۔

11...... (الف) اس سے پہلے کہ ہم تربیت کے موضوع کی طرف واپس جائیں فوج کی پیشہ ورانہ لیاقت پر مارشل لاء کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سیاسی پہلو کو ایک طرف رکھتے ہوئے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد مارچ 1969ء سے فوجیوں کی مسلسل ڈیوٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ درست ہے کہ یہ صرف بری فوج کے لوگوں کی تھیں لیکن حتمی نتائج میں سب سے زیادہ اہمیت بھی وہی رکھتی ہے۔ فوج پر کسی چیز کا اثر تمام دوسرے شعبوں میں محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے حساب لگایا ہے کہ مارشل لاء میں کل 1555 فوجی افسروں کو مختلف ذمہ داریاں دی گئی تھیں لیکن اس کے علاوہ بلاتخصیص جنرل آفیسر کمانڈنگ ڈویژنوں اور بریگیڈز کے تمام افسر ہی اس میں شامل تھے حالانکہ جی او سی' جی ایچ کیو کے بعد منصوبہ بندی کا اعلیٰ ادارہ ہوتا ہے' اس لئے ان حالات میں فوجی افسروں کی پیشہ ورانہ صلاحیت متاثر ہونے اور ان کی اصل ذمہ داری سے توجہ ہٹنے کا بہت زیادہ خدشہ موجود تھا۔

اختیارات کا اندھا دھند استعمال

12...... بلکہ فوجی افسروں کے ذہنی طرز عمل پر عمومی طور پر بہت برے نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے۔ جونیئر افسر جن کے ہاتھ میں طاقت تھی وہ اپنے رویہ سے نہ صرف عام آدمی کی ہمدردی کھو بیٹھے بلکہ سخت گیر فوجی سوچ اور تربیت سے ان کے لگاؤ کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ بھی واضح ہے کہ بلا روک ٹوک اختیار ملنے پر اکثر افسر اسے اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے بھی باز نہ رہ سکے۔

13...... فوج میں تربیت کے طریق کار پر ہمیں خاصی تنقید سننے کو ملی' اگر یہ صرف عام فوجیوں کی طرف سے کی جا رہی ہوتی تو شاید اسے ہم اتنی اہمیت نہ دیتے لیکن اعلیٰ افسروں سمیت فوجی گواہوں نے بھی سسٹم اور ضابطہ کار پر سخت مخالفانہ تبصرے کئے جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

14...... فوجی تربیت کو انفرادی اور اجتماعی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا مقصد ہتھیاروں کے استعمال میں سپاہی کی پیشہ ورانہ کارکردگی اپنے خصوصی شعبے میں مہارت (اگر کوئی ہے تو) اور جسمانی فٹنس کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ دوسرا اجتماعی تربیت ہے جس کا مطلب ہے کہ پلاٹون' کمپنیوں' بٹالین اور فارمیشن میں لڑاکا یونٹ کی حیثیت سے مشترکہ کارروائی کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

15...... انفرادی تربیت کے حوالے سے ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ ہر سال فوجی جوانوں کو وہ اسباق شروع سے پڑھائے جاتے جو انہوں نے پہلے سے پڑھ رکھے ہوتے۔ پہلے سے تربیت یافتہ فوجیوں کو پھر سے بنیادی تربیت دینا وقت کا ضیاع تھا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ بنیادی تربیت نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کو دی جانی چاہئے اور دوسروں کو مزید پڑھایا جائے۔

16...... ہو یہ رہا تھا کہ انفرادی تربیت کا پیریڈ مکمل ہونے کے بعد اجتماعی تربیت شروع ہو سکتی تھی یہاں تک کہ 1971ء میں بھی جبکہ جنگ کے شدید خطرات سر پر منڈلا رہے

تھے' تیاری کی حالت اور مستعدی پیدا کرنے کے لئے عمومی طریق کار سے انحراف کیا جا سکتا تھا لیکن اس سال بھی پہلے سے طے شدہ طریق کار ہی اختیار کیا گیا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ انفرادی تربیت ختم ہوتا کہ اجتماعی تربیت شروع کی جا سکے۔ یہ صاف طور پر ضروری تھا کہ ہر کمانڈر یہ دیکھے کہ کیا اس کے فوجی انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے مستعدی اور پیشہ ورانہ تربیت کے اس معیار کو حاصل کر چکے ہیں جس کی انہیں زمانہ امن میں تربیت دی گئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ مختلف فارمیشنوں کے پریکٹس کرنے کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے تربیت کے اپنے پلان بنائے اور پھر انہیں جی ایچ کیو بھیجا۔ جنرل آفیسر نے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہ کی اور ہم نے دیکھا کہ شاذ و نادر ہی جی ایچ کیو نے تربیت کے ان منصوبوں کو مسترد کرنے یا ان میں رد و بدل کی ضرورت محسوس کی۔ جی ایچ کیو جانے والے ان منصوبوں کی اس طرح توثیق کی وجہ یہ تھی کہ بصورت دیگر چیف آف اسٹاف ڈائریکٹر جنرل ملٹری ٹریننگ اور جی ایچ کیو سے دوسرے نگرانی کرنے والے افسران تربیتی منصوبوں کی چیکنگ کے لئے دورے کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس بات کی کوئی منطقی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی کہ سب کچھ سسٹم کے مطابق تھا اس لئے جنرل آفیسرز کو چیکنگ کی ضرورت نہ تھی۔ مزید یہ کہ ایک جنرل آفیسر کے لئے ضروری تھا کہ وہ حالات کے تقاضوں کے مطابق ٹریننگ پروگرام اور اس کی میعاد میں رد و بدل کے لئے ضروری فیصلے کرے تاکہ اپنے فوجیوں کو مکمل تیاری کی حالت میں رکھ سکے۔

17...... 1966-71ء کے عرصے میں حقیقی تربیت کا معیاری اندازہ ان برسوں کے ان احکامات سے لگایا جا سکتا ہے جو کمانڈر انچیف کے سالانہ تربیتی احکامات کے طور پر جاری ہوئے۔

''سال 1966ء...... کوئی حکم تربیت کے بارے میں جاری نہیں ہوا''

''سال 1967ء...... سال 1966ء اجتماعی تربیت اور تمام سطحوں پر جنگ (ستمبر) سے حاصل ہونے والے اسباق کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لئے مختص رہا' میں فارمیشنز کی ان تمام کوششوں سے آگاہ ہوں جو خصوصاً 1963ء کے جنرل ٹریننگ کے احکام اور 1966ء میں جاری ہونے والے بنیادی' اعلیٰ اور اسٹاف ٹریننگ کے بارے میں پالیسی کے مراسلے سمیت تمام میدانوں میں کی گئیں' میں ٹریننگ کے ان تمام مسائل اور مشکلات سے بھی آگاہ ہوں جن کا فوج کو سامنا ہے اور فارمیشنز یونٹس کے ان اقدامات سے بھی جو انہوں نے ان مسائل و

مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اٹھائے ہیں۔ یہ تمام کوششیں فوج کی آپریشنل تیاری کی حالت اور استعداد کار میں معاون ثابت ہوتی ہیں' تاہم جنگ کے بعد فوج کی تعداد میں اضافے کے تناظر میں ابھی بہت سی باتیں بیان نہیں ہوئیں۔

میں اس ہدایت میں سال 1967ء کی ٹریننگ پالیسی کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں' اس سال تربیت کا مقصد اپنے آپ کو ایک ایسے دشمن سے لڑنے کے لئے تیار کرنا تھا جو نہ صرف تعداد اور وسائل کے اعتبار سے ہم سے برتر ہے بلکہ ناقابل اعتبار بھی ہے۔ یہ صورتحال مسلسل چوکسی اور تکنیکی و حربی مہارت اور جسمانی مستعدی اور بھرتی کے انتہائی اعلیٰ معیار کا تقاضا کرتی ہے۔ فوجیوں کے ساتھ اجتماعی تربیت بٹالین اور رجمنٹل کی سطح تک ہوگی تاہم نئی ترتیب دی گئی فارمیشنز ڈویژن کی سطح تک کی مشقیں کریں گی۔

فارمیشن ہیڈ کوارٹرز' سینئر کمانڈرز اور ان کے اسٹاف کی ٹریننگ' سگنل میپ کی مشقوں' ٹیلی فون پر جنگوں اور جنگی مشقوں وغیرہ کے ذریعے کی جائے گی۔ ڈویژن اور کورز کے الا جسٹک یونٹ بھی اس طرح مشقیں کریں گے۔

سال 1968ء ..... سال 1967 کی تربیت زیادہ تر رجمنٹ، بٹالین سطح تک کی انفرادی اور اجتماعی تربیت کے لئے مخصوص رہی۔ کچھ نئی ترتیب دی گئی فارمیشن نے بھی فوجیوں کے ہمراہ فارمیشنز مشقیں کیں۔ ٹریننگ کی کوششوں کے دوران فارمیشنز اور یونٹوں کی تنظیم نو، نوعمر فوجیوں کی بڑی تعداد میں بھرتی، تربیت یافتہ انسٹرکٹرز اور تربیتی سہولتوں کی کمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ امکان یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مشکلات ہمیں آنے والے سال میں بھی درپیش رہیں گی: تاہم ان کے خاتمہ کے لئے مختلف اقدامات کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں کمی آتی جائے گی۔ جنگ کے لئے ضروری تربیتی معیار کے حصول کے لئے بہت سی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اعلیٰ ترین معیار حاصل کرنے کے لئے کوششیں جاری اور فارمیشن ہیڈ کوارٹر کی تکنیکی و حربی تربیت اور انفرادی مہارت کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے فارمیشنز اور یونٹوں کو ضروری کوششیں جاری رکھنا چاہئیں۔ بنیادی مقصد فوج کو ایک ایسے دشمن سے لڑنے کی تربیت دینا ہے جو ہم سے نہ صرف تعداد اور وسائل کے اعتبار سے برتر ہے بلکہ ناقابل اعتبار بھی ہے۔ اس صورتحال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مسلسل چوکس رہیں اور تکنیکی و حربی مہارت اور جسمانی مستعدی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھیں۔ اس مقصد کے

حصول کے لئے میں اس ہدایت میں 1968ء کے لئے اپنی ٹریننگ پالیسی کی وضاحت کرتا ہوں' اجتماعی تربیت اس سال بریگیڈ کی سطح تک ہوگی۔

سال 1969ء ..... سال 1968ء زیادہ تر بریگیڈ سطح تک کی انفرادی و اجتماعی تربیت کے لئے مختص رہا۔ ماضی میں زیادہ تر مشکلات بھرتی اور تنظیم نو (1966ء سے) کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان پر قابو پا لیا گیا اور فارمیشنز آہستہ آہستہ ہم آہنگ ٹیموں کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ اجتماعی تربیت اس سال بریگیڈ اور ڈویژن کی سطح تک ہوگی (نوٹ: جولائی 1969ء میں بٹالین سطح تک لائی گئی تھی) اور یہ تربیت میرے خط نمبر 6860/623/MT-C-in-C بتاریخ 8 فروری 1968ء کے ذریعے جاری کئے گئے مجموعی پلان کے دائرے میں فارمیشن کمانڈرز کی صوابدید پر ہوگی۔ 1969ء کے لئے خصوصی تعلیم (اسٹڈی) کا موضوع عسکری مداخلت کاری (گھس بیٹھ) اور اینٹی عسکری مداخلت کاری (روک تھام) کے ذریعے حملے کے اقدامات ہوگا۔ فارمیشنز رات کی تاریکی میں اپنے آپریشنل کردار' میدان جنگ اور دشمن کی ممکنہ فوجی ترتیب کے خصوصی تناظر میں اس موضوع کا جائزہ لیں گے۔ !

سال 1970 ..... سال 1969ء ملک میں بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی سیاسی و سماجی بے چینی' امن و امان برقرار رکھنے کے لئے فوج کی مسلسل مداخلت اور مارشل لاء کے نفاذ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ فرائض 1969ء کے لئے مقرر کئے گئے ہمارے تربیتی اہداف کے حصول میں حائل ہوئے۔ 1969ء میں جن شعبوں میں کمزوریاں سامنے آئیں ان میں تربیت کی منصوبہ بندی اور جوانوں کی دستیابی کے معاملے پر ضروری توجہ اور رات کے وقت لڑائی کی تربیت میں بے دلی کا مظاہرہ شامل تھا۔ حالانکہ اس بارے میں جی ایچ کیو کی طرف سے وقتاً فوقتاً تفصیلی رہنمائی کی جاتی رہی۔ مزید یہ کہ یونٹوں کو داخلی سیکورٹی کی ڈیوٹی سے ہٹانے کے بعد ہی ہم میں سے بہت سوں کے لئے خود کو ذہنی طور پر مارشل لاء اور ملک کی عمومی صورتحال سے الگ کرنا بڑا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ غیر یقینی سیاسی اور آئینی حالت 1970ء میں جاری رہ سکتی ہے اور درپیش صورتحال کے مطابق ملک کے مختلف حصوں میں فوجیوں کی عملی مداخلت کی نوعیت بدلتے رہنے کا امکان ہے۔ ان حالات میں فوج ایک بھرپور تربیتی سال نہیں گزار سکتی تھی۔ اس لئے اس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ جو فارمیشنز اور یونٹ براہ راست مارشل لاء ڈیوٹی

سے وابستہ نہیں وہ تربیت کے لئے دستیاب وقت کا بہترین استعمال یقینی بنائیں۔

ٹریننگ مشن: 1970ء کے لئے پاکستان آرمی کا ٹریننگ مشن یہ ہے کہ وہ کمانڈر انچیف کی ہدایت برائے 1968ء کے مطابق انفرادی اور اجتماعی تربیت کے اعلیٰ معیار کے حصول کے لئے دستیاب ٹریننگ ٹائم کا زیادہ سے زیادہ اور انتہائی مؤثر استعمال کریں۔

سال 1971ء...... 1970ء کے دوران فوجی جوانوں کو مارشل لاء ڈیوٹی سے الگ رکھنے کی عمومی پالیسی کے باوجود فارمیشنز کی اکثریت کسی ایک یا دوسری شکل میں انہی فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھی' ان حالات میں فوجیوں کو تکنیکی اور حربی طور پر نئے ہتھیاروں اور آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کمانڈر انچیف کے 1970ء کی ہدایات برائے تربیت پر عمل درآمد کا عرصہ جنگ 1971ء تک بڑھایا جاتا ہے۔ جی ایچ کیو لیٹر نمبر 6859/2237/MT-1 بتاریخ 15 مئی 1971ء کے تحت بھی اجتماعی تربیت کی بٹالین کی سطح تک برقرار رہے گی۔ کمانڈر انچیف کی سالانہ ہدایت برائے تربیت 1971ء نے موجودہ سال کے لئے تربیت بٹالین رجمنٹ کی سطح تک کمی کر دی۔ ٹریننگ کی سطح 1970ء کے دوران فارمیشنز کی مارشل لاء اور دوسری سیکورٹی ڈیوٹیوں کی وجہ سے پہنچنے والے نقصان کے ازالے کے لئے محد... کی گئی۔ نئی بھرتی کی تعلیم و تربیت کے لئے (17 ڈویژن اور 33 ڈویژن) یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں ڈویژن موجودہ سال کے لئے بریگیڈ گروپ کی سطح تک اجتماعی تربیتی مشقیں جاری رکھیں گے۔

ہیڈ کوارٹر کور ون (I)...... آپ کے خط نمبر 0202/8/GS(T) بتاریخ 14 اپریل 1971ء آٹھویں آرمرڈ بریگیڈ کو بریگیڈ سطح کی مشقیں جاری رکھنے کی اجازت دی جاتی ہے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔

''انفرادی اور اجتماعی تربیت کے دوران دشمن کی مضبوط پوزیشنوں پر حملے اور حملے کے آخری مراحل میں باڑ' بارودی سرنگوں اور پختہ مورچہ بندی وغیرہ کی رکاوٹوں سے نمٹنے کی تکنیک کے خصوصی تناظر میں تفصیلی مطالعہ اور پریکٹس کی جائے (براہ کرم جی ایچ کیو لیٹر نمبر 6859/2237/MT-1 بتاریخ 29 اپریل 1971ء بھی ملاحظہ فرمائیں)۔

''ہیڈ کوارٹرز مشرقی کمانڈ...... دو ایڈیشنل فارمیشنز حال ہی میں ہیڈ کوارٹرز مشرقی کمانڈ کی کمان میں تعینات کی گئی ہیں۔ ماضی میں ان دو فارمیشنز نے جس قسم کی ٹریننگ کی ہے وہ ان کی موجودہ ذمہ داریوں اور (اس) میدان جنگ سے (جہاں انہیں تعینات کیا گیا ہے) مطابقت

نہیں رکھتی' اس لئے انہیں اپنے نئے آپریشنل کردار کے مطابق فٹ بنانے کے لئے فوری طور پر تربیت دی جائے۔ اوپر بیان کئے گئے نکات کی روشنی میں ہیڈ کوارٹرز ایسٹرن کمانڈ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ 1971ء کے دوران دریائی و ساحلی علاقوں میں تربیت اور اینٹی گوریلا آپریشن کی مشقوں پر خصوصی توجہ دے۔ جی ایچ کیو ٹریننگ انسٹرکشن 85/60 دریائی و ساحلی جنگ کے بارے میں گائیڈ لائن مہیا کرتی ہے۔ دریائی و ساحلی علاقوں میں جنگ اور اینٹی گوریلا آپریشنز کے بارے میں جی ایچ کیو کی تربیتی ہدایات کے بارے میں ایک پمفلٹ کو جی ایچ کیو میں حتمی شکل دی گئی ہے اور مستقبل قریب میں یہ انہیں (متعلقہ لوگوں کو) جاری کر دیا جائے گا۔

برائے نام فوجی اجتماعی تربیت بھی نہیں دی گئی

18...... یہ واضح ہو گیا ہے کہ فوجیوں کو نام کی بھی کوئی اجتماعی تربیت نہیں دی گئی تھی اور اس پہلو نے ان کی حربی صلاحیت پر منفی اثر ڈالا۔ 1971ء کے لئے جاری ہدایت جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے میں خود اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مارشل لاء ڈیوٹی بھی مؤثر تربیت کی راہ میں حائل ہونے والی ایک اہم وجہ تھی' صرف نئی بھرتی کے باعث مثلاً 13 ڈویژن اور 3... ڈویژن کو بریگیڈ گروپ کی سطح تک اجتماعی تربیت جاری رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ 1965ء کے موقع پر خواہ کسی منصوبے اور دور اندیشی یا محض کسی وقتی پروگرام کی وجہ سے فوج کو اجتماعی نوعیت کی مؤثر تربیت دی گئی تھی جس کی وجہ سے 1971ء کے مقابلے میں فوج کی تیاری و مستعدی بہت بہتر تھی جیسا کہ جنرل یحییٰ نے ہمیں خود بتایا کہ اس فوج کی تعداد جس کی اس نے کمان کی جنرل ایوب خان اور بعد میں جنرل محمد موسیٰ کی زیر کمان افواج سے دوگنی تھی۔ لیکن آلات (حرب) کے معاملے میں جنرل (یحییٰ) نے بتایا کہ وہ کسی بھی حوالے سے آپ نے پیش رو جیسے وسائل نہیں رکھتا تھا۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ٹریننگ کے معاملے میں بھی بڑھی ہوئی فوج 1965ء سے تھوڑا پہلے کی فوج جیسی اچھی حالت میں نہیں تھی۔

19...... نیوی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ان کی تربیت کی حالت کا اس تفصیلی انداز میں تجزیہ نہیں کر سکتے نہ ہی ہمارے پاس کوئی ایسا مواد ہے کہ جس کے تحت ہم تربیت کی عام حالت کا خلاصہ پیش کر سکیں۔

فضائیہ درست حالت میں تھی

20...... بحری جہاز انفرادی اور اجتماعی مشقیں کرتے رہتے تھے لیکن ان کی تیاری کی حالت بھی اطمینان بخش نہ تھی' نیوی اور ائیرفورس میں تعاون پر بھی بہت کم توجہ دی گئی تھی خصوصاً ائیرفورس کی طرف سے اپنے بحری جہازوں کی شناخت کے معاملے میں بھی صورتحال بہتر نہ تھی۔ اس ناکامی کا نتیجہ پاکستانی ائیرفورس کی طرف سے ہمارے اپنے بحری جہاز پر بمباری کی صورت میں نکلا جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے پائلٹ اپنے بحری جہازوں کو شناخت کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ ہمارے بحری ہیڈکوارٹرز میں ایک حد تک پایا جانے والا کنفیوژن بھی اس کی ایک وجہ تھا۔ یہاں تک کہ ہماری آبدوزیں بارودی سرنگیں بچھانے کے خصوصی آپریشنز کے لئے مناسب تربیت سے محروم تھیں۔

21...... ائیرفورس کا ٹریننگ اور مختلف قسم کی پرواز کی ڈیوٹیوں کے ریفریشر کورسز کا اعلیٰ درجے کا قابل اعتماد نظام ہے اور صرف ایسے پائلٹ جوان تربیتی مشقوں سے گزرتے رہتے ہیں جو جنگ میں حصہ لینے کے لئے ناگزیر ہیں ''آپریشنل'' رہتے ہیں' ہمارے سامنے جو شواہد پیش کئے گئے ...... اور ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا ہمارے پاس کوئی جواز بھی نہیں ...... جنگ کے موقع پر تمام پاکستانی پائلٹ حقیقی معنوں میں آپریشنل اور چاق وچوبند تھے' مزید یہ کہ ایڈوانس ٹریننگ اور جدید لڑاکا حربوں میں بہتری کے لئے فائٹر لیڈر اسکول 1969ء سے پہلے از سرنو استوار کیا جاچکا تھا۔ بہت سے پائلٹوں کو تربیت کے لئے مشرق وسطیٰ کے دوست ممالک میں بھیجا گیا تاکہ وہاں بھارتی ائیرفورس کے زیر استعمال طیاروں مثلاً مگ 21' ایس یو 7 اور ہنٹر کے استعمال کی تربیت بھی حاصل کرسکیں۔ جنگ کی تیاری کے سلسلے میں فائٹر لیڈر اسکول سے کہا گیا کہ وہ بمباری اور جدید لڑاکا حربوں پر لیکچرز کا اہتمام کرے اور ٹریننگ یونٹس میں موجود تمام پائلٹوں کو آپریشنل طیاروں کے مختصر تربیتی کورس کرائے گئے' اس لئے ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ 1971ء کی جنگ کے دوران فضائیہ کے جوانوں کی ٹریننگ اور فنس پر عدم اطمینان کا اظہار کرسکیں۔

22 ...... اب ہم ہتھیاروں کے حوالے سے فوج کی تیاری کی حالت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ جہاں تک ٹینک رجمنٹوں (آرمر) کا معاملہ ہے پاکستانی فوج نئے چینی ٹینکوں اور پرانے امریکی ٹینکوں سے لیس تھی۔ عام طور پر دفاعی فارمیشنز کے پاس امریکی ٹینک تھے مثلاً ایم 36 (شرمن) اور ایم 47/48 (پیٹن) ٹینک جبکہ آرمرڈ ڈویژنوں کے پاس نئے ٹی 59 چینی ٹینک تھے۔

23 ...... پاکستانی توپ خانہ میں متعدد ممالک کی بنی ہوئی ہلکی اور بھاری توپیں تھیں جن میں امریکہ' برطانیہ' فرانس' روس' اٹلی اور چین شامل ہیں۔ اتنی مختلف قسم کی توپیں تربیت' مرمت اور گولہ بارود کے معاملے میں مسائل پیدا کردیتی ہیں جس کی وجہ سے ان تمام حوالوں سے ہماری تیاری کی حالت کمزور تھی۔

24 ...... طیارہ شکن توپوں کی بھی شدید کمی تھی جو نہ صرف ہمارے حساس مقامات اور علاقوں میں اہم صنعتوں اور مواصلاتی نظام کی حفاظت کیلئے ناکافی تھیں بلکہ حقیقت میں خود فوج کی اپنی ضروریات پورا کرنے کے قابل بھی نہ تھیں۔ جنگ سے تقریباً صرف ایک ماہ قبل دوسری کور کے 33 ویں ڈویژن کا توپ خانہ تبدیل کرنے سے بھی مسئلہ سنگین ہوا' اس کی توپوں کے تار طویل فاصلوں کے لئے نامناسب تھے اور اس فارمیشن کو دیئے گئے کردار سے میل نہ کھاتے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ مسئلہ عین وقت پر حل کرلیا گیا۔

25 انجینئرز کے شعبے میں انتہائی اہم کمی تھی۔

انجینئرز!

انتہائی کلیدی کمی یہ تھی (الف) کشتیوں اور لوہے کے ہنگامی پل بنانے والے آلات ''بالوپلینس'' اور ایم 2 پل بنانے والے آلات ضرورت سے انتہائی کم تھے جس نے ہماری حملہ کرنے کی بنیادی صلاحیت کو کمزور کردیا تھا۔

(ب) بم ضائع کرنے والے آلات کی سپلائی میں بھی سخت قلت کا سامنا تھا جس کے نتیجے میں جنگ کے دوران منظم کی گئی بم ڈسپوزل ٹیموں کی کارکردگی بھی غیر اطمینان بخش رہی۔

(ج) بارودی سرنگیں 20-25 لاکھ کے ہدف کے مقابلہ میں جنگ سے قبل اینٹی ٹینک اور دوسری بارودی سرنگیں بالترتیب صرف پانچ اور گیارہ لاکھ تھیں اس کا نتیجہ ہماری دفاعی

فارمیشنز کی دفاعی صلاحیت میں بڑی کمزوری کی صورت میں سامنے آیا۔

(25) فارمیشنز کو انجینئرز کی مدد کے سلسلے میں بھی انتہائی عدم توازن کا سامنا تھا اس کا اندازہ دوران جنگ شاہراہ قراقرم پر کام کرنے والی انجینئرز بٹالینز کو محاذ پر طلب کرنے سے لگایا جا سکتا ہے۔ 1971ء کے وسط میں 2 انجینئرز بٹالین نئے ڈویژنوں سے واپس بلائی گئیں جبکہ 4 کو جنگ سے صرف ایک ماہ قبل طلب کیا گیا۔ طویل عرصے سے سول ڈیوٹی پر تعینات رہنے کی وجہ سے یہ یونٹ جنگ کے دوران ضروری آپریشنل کام کے لئے مکمل تربیت یافتہ نہ تھے۔ مزید یہ کہ ان یونٹوں کو نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانے کے لئے ضروری آلات بھی دستیاب نہ تھے کہ انہیں لیس کیا جا سکتا۔

(26) سگنلز کے ضروری آلات خصوصاً الیکٹرونکس کا سامان اور فیڈ کیبل کی سپلائی ضرورت کے مطابق نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جنگ کے لئے ضروری تمام وسائل شاید کوئی بھی مہیا نہیں کر سکتا لیکن ہماری جو صورت حال تھی اسے قابل اطمینان حالت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

27 پیدل فوج کے ہتھیاروں کی صورتحال یہ تھی کہ 106 ایم ایم ریکوائل لس رائفل کی شدید قلت تھی جو اینٹی ٹینک ڈیفنس کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ ہر بٹالین کو ایسی 8 رائفلیں فراہم کرنے کی منظوری دی گئی تھی لیکن کسی کے پاس 6 سے زیادہ نہ تھیں اور بعض اوقات متعدد شارٹ رینج 75 ایم ایم چینی ریکوائل لس رائفلوں سمیت ہر بٹالین کے پاس ایسی صرف چار رائفلیں ہوتی تھیں

(28)...... 3 انچ یا (81) ایم ایم مارٹرز کی بھی خاصی قلت تھی۔ ہر بٹالین کو ایسی 6 مارٹرز فراہم کرنے کی منظوری دی گئی تھی لیکن بعض نئی قائم کی گئی بٹالینز کو صرف 3 ایسی مارٹرز مہیا کی جا سکیں۔

29...... چونکہ جی تھری رائفل پاکستان آرڈننس فیکٹریز واہ میں تیار ہونے لگی تھی اس لئے امریکی ایم ون رائفلوں کی بڑی تعداد کا استعمال متروک قرار دے دیا گیا لیکن جنگ کے دنوں تک یہ رائفلیں مشرقی پاکستان میں تعینات 3 ڈویژنوں کے استعمال میں تھیں۔ پرانے زمانے کی پوائنٹ تھری ناٹ تھری رائفل بھی سول آرمڈ فورسز کے زیر استعمال تھی اگرچہ فوج کا بڑا حصہ جی تھری رائفل کو معیاری ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا لیکن دوسری رائفلیں جن کی ہم نے اوپر نشاندہی کی ہے بھی زیر استعمال تھیں۔ مختلف قسم کی رائفلوں کے استعمال کی وجہ سے

ایمونیشن سپلائی میں مسائل پیدا ہونے یقینی تھے۔

30...... ہتھیاروں کی ان کمزوریوں کے نتیجے میں حملے اور اس طرح دفاعی مقاصد کے لئے یونٹوں کی کارکردگی عمومی طور پر متاثر ہوئی۔ بری فوج کے پاس گاڑیوں خصوصاً خاص علاقوں میں آپریشن کے لئے فور ویل ڈرائیو قسم کی گاڑیوں کی بھی سخت کمی تھی جس کی وجہ سے ہنگامی حالت کا اعلان کر کے سول گڈز ٹرانسپورٹ گاڑیوں کو فوجی خدمات کے لئے منگوایا گیا گیا جس سے تجارت پر مضر اثرات پڑے اور فوج بھی ان سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکی۔

31...... ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ دیگر آلات کی کمی بھی خاصا مسئلہ بنی رہی۔ 1971ء کے دوران ایک لاکھ مزید فوج بھرتی کی گئی تھی۔ کمبلوں فوجی وردیوں اور کپڑوں کی سپلائی بھی ضرورت کے مطابق نہ تھی اس سے فوجیوں کے لئے کئی مشکلات پیدا ہوئیں جن سے ان کے حوصلے اور لڑنے کی صلاحیت پر اثر پڑا۔

32...... جنرل اسٹاف ریزروز 13- ہم نے 80 دن کی لڑائی کے لئے ایک جنرل اسٹاف ریزرو تیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا: تاہم مالی مشکلات اور سمندر پار سے سپلائی کے ذرائع بند ہونے کی وجہ سے متعدد اہم ہتھیاروں اور گولہ بارود کی مخصوص سپلائی میں کمی آ گئی مثلاً جی ایس ریزرو۔ اس سلسلے میں قابل ذکر امور یہ ہیں۔

(الف) ٹینک۔ عملاً ریزرو (محفوظ دستے) نہیں تھے یہاں تک کہ پرانے شرمن ٹینک بھی فوج میں شامل رکھے گئے تاکہ میدانی فوج میں عدم توازن دور کرنے کے لئے نئے یونٹ تشکیل دیئے جا سکیں۔

(ب) توپیں' یہی بات توپ خانے کے بارے میں کہی جا سکتی ہے' آرڈننس ڈپو میں عملی طور پر کوئی ریزرو (محفوظ توپخانہ) نہیں تھا۔

(ج) ٹینکوں کا گولہ بارود 30 دن

(د) میدان جنگ کی توپوں کا گولہ بارود 30 دن

(ر) اینٹی ایئر کرافٹ توپوں کا گولہ بارود (25) دن

(س) مارٹر کا گولہ بارود (30) دن

(ش) اینٹی ٹینک ری کوائیل لس رائفلز کا ایمونیشن 25-30 دن

(ص) چھوٹے ہتھیار اور ایمونیشن 60 دن

(ض) پٹرول اور لبریکینٹس پی او ایل (90) دن

نوٹ: مندرجہ بالا اعداد و شمار گولہ بارود کی انتہائی مقدار خرچ ہونے کا اندازہ لگا کر تیار کئے گئے ہیں جن میں تھوڑی سی کمی بیشی کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

ہر فورس دوسری فورس کی ضروریات سے بے خبر تھی

33...... تیاری کی حالت میں رہنے سے متعلق ائیر فورس بہت سے معاملوں میں بری فوج کی محتاج تھی۔ اس حوالے سے بعض پہلو تشویشناک تھے جن کا ذکر ضروری ہے۔ ائیر فورس کے نقطہ نظر سے فارورڈ ائیر فیلڈ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے اوکاڑہ اور جیکب آباد کی ائیر فیلڈز کو تیاری کی حالت میں رکھا گیا۔ ائیر فورس کا خیال تھا کہ جنگی طیاروں کو زمینی تحفظ' پٹرول اور لبریکینٹس کی فراہمی اور چند دیگر معاملات آرمی کی ذمہ داری ہے یہ پریشان کن صورتحال تھی کہ ہر فورس اپنی انتہائی صلاحیتوں سے کام کرنے کی خواہش کے باوجود دوسری فورس کی ضروریات سے بے خبر تھی' اوکاڑہ ائیر فیلڈ کے بارے میں سوال پر جنرل عبدالحمید نے کہا کہ اگر ائیر فیلڈ اس سے زیادہ انتظامات یا تعاون چاہتا تھا جو ہم کر رہے تھے تو اسے جنرل ہیڈ کوارٹرز کو کہنا چاہئے تھا۔

34...... اس طرح آرمی کا یہ خیال تھا کہ ائیر ہیڈ کوارٹر جیکب آباد ائیر فیلڈ کو حرکت میں لانے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے راجستھان میں 18 ویں ڈویژن کے آپریشنوں کو مدد مل سکتی ہے۔ آرمی والے اس وقت حیران ہوئے جب ائیر فورس نے ان آپریشنوں میں مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ائیر فورس کا اپنے طور پر یہ خیال تھا کہ انہوں نے آرمی پر یہ واضح کر دیا تھا کہ جیکب آباد ائیر فیلڈ کو تیاری کی حالت میں لانے کے لئے اسے (ائیر فورس کو) کم از کم ایک ہفتے کا نوٹس درکار ہوگا۔ یہ کہنا بڑا عجیب لگتا ہے کہ آرمی نے یہ خود ہی سوچ لیا تھا کہ جیکب آباد ائیر فیلڈ خود اپنی ضروریات کے تحت تیاری کی حالت میں ہوگا۔ ان دونوں ائیر فیلڈز کے معاملے میں آرمی اور ائیر فورس میں جو اپنے اپنے آپریشن کامیابی سے انجام دے رہی تھیں ایک دوسرے سے مشورہ اور ایک دوسرے کے منصوبوں سے آگاہی نہ ہونے کے برابر تھی۔

35...... ان دو ائیر فیلڈز کے علاوہ یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان ائیر فورس نے مکمل تیاری کی حالت میں رہنے کے لئے ضروری تمام اقدامات کئے' تمام جنگی ہوائی اڈوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ اپنے طیاروں کو پھیلا دیں اور پاکستان کے مشرقی و مغربی دونوں حصوں میں موبائل

آبزرویشن یونٹ تعینات کر دیں۔ جنگی طیاروں کے آلات اور سپلائی کے معاملے میں بھی تمام ضروری اقدامات کئے گئے تھے۔ ریزرو ڈپوؤں میں طیاروں کی انسپکشن اور جہاں ضروری ہو مرمت کا کام تیز کر دیا گیا۔ طیاروں کی انسپکشن زمانہ امن میں تیرہ دن ہوتی تھی۔ خصوصی انتظامات کے ذریعے اسے کم کر کے 3 دن کر دیا گیا' کام کرنے کے قابل سپیئر انجن دوران جنگ کی پوزیشنوں میں رکھنے کے لئے جنگی ہوائی اڈوں میں پہنچا دیئے گئے۔ طیاروں کی ہنگامی مرمت اور دشمن کے حملے سے آگ لگنے پر ائیر پورٹ یا طیارے میں ریسکیو آپریشن کرنے والی ٹیمیں مرمت کرنے والے ائیر ڈپوؤں سے تشکیل دے کر آپریشنل یونٹوں (جنگی ہوائی اڈوں) مثلاً سرگودھا' پشاور اور مسرور پر تعینات کر دی گئیں۔

36...... سپلائیز کے معاملے کی بھی مناسب دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ فضائی ایندھن کے ٹینکر تمام جنگی ہوائی اڈوں پر پہنچا دیئے گئے تھے اور انہیں 90 فیصد محفوظ ذخیرے کی سطح پر برقرار رکھنے کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ بموں اور راکٹوں سمیت تمام گولہ بارود مناسب طور پر اپنی پوزیشنوں پر پہنچا دیا گیا تھا۔ نقل و حرکت کے دوران ضروری روزمرہ استعمال کی اشیاء مثلاً خیمے' برتن وغیرہ بھی تمام جنگی ہوائی اڈوں کو بھیج دی گئی تھیں۔

37...... جولائی کے بعد سے فضائیہ کے تمام اڈوں پر دوران جنگ کے عمومی انتظامات رہے مثلاً تمام اڈوں پر آپریشن روم بنا دیئے گئے' جنگی طیارے تعینات کر دیئے گئے اور انہیں حکم دے دیا گیا کہ وہ لوڈ ڈگنوں کے ساتھ پرواز کریں۔

38...... جیسا کہ پہلے ہی ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریزرو ائیر مین بروقت واپس ڈیوٹی پر طلب کر لئے گئے اور غیر ممالک میں ڈیپوٹیشن پر گئے پائلٹوں کو بھی واپس بلا لیا گیا صرف ایک اقدام جو ہمارے خیال میں کیا جانا چاہئے تھا لیکن نہیں کیا گیا وہ یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر فضائی جنگی مشقیں نہیں کی گئیں جن میں تمام ائیر ڈیفنس عناصر مثلاً ریڈارز' موبائل آبزرویشن یونٹس اور ایس او سیز بھی شامل ہوتے۔ بلاشبہ ان تمام عناصر نے انفرادی طور پر اپنی اپنی مشقیں کر رکھی تھیں اور ضروری خدمات انجام دینے کے لئے تیار تھے لیکن اجتماعی تربیت نہیں کی گئی۔ ان معاملوں کے علاوہ جن کی ہم نے خصوصی طور پر نشاندہی کی ہے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاک فضائیہ جنگ کے موقع پر ضروری تیاری کی حالت میں تھی۔

مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کی روداد

1..... 25 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں مذاکرات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اگرچہ ان کے خاتمے کا باضابطہ اعلان نہیں کیا گیا؛ تاہم عملاً تعطل تھا۔ عوامی لیگ نے اپنے مطالبات کا مسودہ پیش کر دیا۔ اس کے جنرل سیکرٹری مسٹر تاج الدین نے پریس کو بتایا کہ انہوں نے حتمی تجاویز پیش کر دی ہیں۔ اب یہ جنرل یحییٰ پر ہے کہ انہیں قبول یا مسترد کر دیں۔ پیپلز پارٹی کے قابل ذکر رہنماؤں کے علاوہ تمام لیڈر ڈھاکہ سے واپس چلے گئے خود جنرل یحییٰ نے بھی 25 مارچ کی شام کو خاموشی سے ڈھاکہ چھوڑ دیا۔

2..... (25) اور 26 مارچ کی درمیانی رات ایک بجے ملٹری ایکشن کیا گیا اور انتظامی کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا گیا جو یکم سے 25 مارچ کے دوران عملاً عوامی لیگ نے حاصل کر رکھا تھا۔ یہ قدم اٹھانا صحیح تھا یا وہ نقطہ نظر صحیح تھا جس کی بنا پر اس ایکشن میں اتنی تاخیر کی گئی اس پر ہم کسی اور جگہ بحث کریں گے ہمارا موجودہ مقصد یہ ہے کہ صرف ان واقعات کا جائزہ لیا جائے جو 20 نومبر 1971ء کو بھارتی حملے کا باعث بنے۔ بظاہر یہ دکھائی دے رہا تھا کہ 25 مارچ کی رات عوامی لیگ 3 بجے کوئی اہم اقدام کرنے والی ہے اس لئے یہ ہو سکتا ہے آرمی کی طرف سے اپنے ایکشن کے لئے وقت کے انتخاب میں اس اطلاع کا بھی اہم کردار ہو۔ دوسری طرف عوامی لیگ نے بھی اپنے پاس اچھا انٹیلی جنس سسٹم ہونے کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے عوامی لیگ کے رہنماؤں کی گرفتاری کے لئے کیا گیا پہلا اقدام مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے علاوہ کوئی لیڈر پکڑا نہ جا سکا وہ اپنی رہائش گاہ پر موجود رہے اور گرفتاری سے بچنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دوسرے تمام لیڈر روپوش ہو گئے اور پھر سرحد پار کر کے بھارت جانے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف ڈاکٹر کمال حسین اس مقصد میں ناکام رہے اور چند روز بعد گرفتار ہو گئے۔

ڈھاکہ اور دوسرے قصبوں میں کرفیو لگا دیا گیا

(3) رات کے وقت ڈھاکہ میں اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ ڈھاکہ میں صورتحال کنٹرول میں آ گئی' پہلا اقدام یہ کیا گیا کہ رات دو بجے تمام سول ٹیلیفون ایکسچینج بند کر دیے گئے اسی دوران ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس کا محاصرہ بھی کر لیا گیا جو نہ صرف سیاسی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا بلکہ وہاں بڑی تعداد میں ہتھیار اور ایمونیشن بھی جمع تھا۔ فوج پر رائفلوں اور شاٹ گنوں سے فائرنگ کی گئی اور سخت مزاحمت ہوئی لیکن 3 گھنٹے کی کوشش کے بعد بالآخر صبح سویرے 5 بجے کے قریب امن وامان بحال کر دیا گیا۔

(4) رات ڈھائی بجے فیل خانہ میں مشرقی پاکستان رائفلز کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ یہاں بھی جیسا کہ توقع تھی سخت مزاحمت ہوئی جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان رائفلز کا میجر رب اور 5 فوجی ہلاک ہو گئے۔ کچھ فوجی ہتھیاروں سمیت فرار ہو گئے۔

(5) ڈھاکہ میں موجود ریزرو پولیس کو بھی رات 3 بجے غیر مسلح کر دیا گیا۔ مزاحمت کی وجہ سے اس فورس کے بھی کئی ارکان ہلاک ہوئے۔

(6) ڈھاکہ اور دوسرے قصبوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ اسلحہ برآمد کرنے اور لیڈروں کو دیکھتے ہی گرفتار کر لینے کی پالیسی کے تحت گھر گھر تلاشی شروع کر دی گئی۔ اس آپریشن کے دوران ایک واقعہ میں اگرتلہ سازش کیس کا ایک ملزم سابق لیفٹیننٹ کمانڈر معظم ہلاک ہو گیا۔

(7) ڈھاکہ میں صورتحال تیزی سے معمول پر آ گئی اور حکومت نے ایک بار پھر سول انتظامیہ پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔

(8) چٹاگانگ میں 20 بلوچ بٹالین کو ہدایت کی گئی کہ وہ بنیادی اہمیت کے حامل مقامات مثلاً ریڈیو اسٹیشن' ٹیلی فون ایکسچینج اور مرکزی اسلحہ خانہ جہاں اس وقت 18 ہزار رائفلیں موجود تھیں کو حفاظت میں لے لے۔ اس مشن کی تکمیل کے دوران اس بٹالین کو 8 مشرقی بنگال اور مشرقی بنگال رجمنٹل سینٹر کی کچھ چوکیوں کی طرف سے مسلح مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور جھڑپوں کے باعث دونوں اطراف کچھ جانی نقصان ہوا اس معرکے میں مشرقی بنگال رجمنٹل

سینٹر کے لیفٹیننٹ کرنل ایم آر چوہدری بھی ہلاک ہو گئے۔ 26 مارچ کی دوپہر 12 بجے سینٹر کے عملے کو نہتا کر دیا گیا اس دوران کمانڈر لاجسٹک ایریا بریگیڈیئر ایم ایچ انصاری نے جو ایک بحری جہاز میں گولہ بارود چٹاگانگ لائے تھے فائرنگ کی آواز سنی تو انہوں نے ایک پلاٹون فوجیوں اور بحری دستوں کے ہمراہ کارروائی کی اور چٹاگانگ ایئر فیلڈ کو حفاظت میں لینے میں کامیاب ہو گئے۔

(9) شفیع فورس کو کومیلا (Comilla) سے کوچ کا حکم دیا گیا اور نیوی کو اس کی مدد کے لئے کمربستہ رہنے کی ہدایت کی گئی 28 مارچ کو چٹاگانگ سے 13 میل دور باغیوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ انصاری فورس کو حرکت میں آنے کا حکم دیا گیا۔ اس کو بھی 8 مشرقی بنگال کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فائرنگ جاری رہی نیوی اور ایئر فورس کے اہم کردار کی وجہ سے بالآخر 4 اپریل کو چٹاگانگ بھی مؤثر کنٹرول میں آ گیا۔ تاہم قصبے کے مضافات میں باغیوں کے کئی ٹھکانے اور پوزیشنیں موجود تھیں۔

بنگالی فوجیوں کی اکثریت بغاوت کر چکی تھی

(10) اپریل کے پہلے ہفتے کے اختتام پر صورتحال کا خلاصہ یہ تھا: (1) ڈھاکہ سیکٹر میں میمن سنگھ اور نرسنگھ دی باغیوں کے زیر اثر تھے۔ (2) جیسور سیکٹر میں صرف جیسور کے شہری علاقے اور کھلنا حکومت کے کنٹرول میں تھے (3) رنگ پور سیکٹر میں صرف رنگ پور، سید پور اور راجشاہی کے قصبے کنٹرول میں تھے (4) تنگائل 3 اپریل تک باغیوں کے کنٹرول میں رہا اور کچھ عرصے بعد حکومتی کنٹرول میں آیا۔

11 ..... اس وقت تک بنگالی مسلح افواج اور نیم فوجی دستوں میں شامل افراد کی اکثریت بغاوت کر چکی تھی۔ ہم اس سلسلے میں اہم واقعات کا اوپر ذکر کر چکے ہیں لیکن وہاں موجود 17 ہزار افسروں اور جوانوں میں سے 4 ہزار کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا جبکہ باقی ہتھیاروں سمیت باغیوں کے ساتھ جا ملے تھے جبکہ پولیس فورس کی اکثریت بھی باغیوں سے مل گئی تھی۔

12 ..... حالانکہ فوج نے بڑی تعداد میں ایسے علاقوں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا تھا جو باغیوں کے قبضے میں تھے یا وہاں باغیوں کا غیر معمولی اثر و رسوخ تھا؛ تاہم ایسے بہت سے علاقوں میں فوجی آپریشنز کی ضرورت تھی اور اس کام میں جانی نقصان ناگزیر تھا۔ اس بات کو سمجھنا

ضروری ہے کہ یہ آپریشن محض غیر مسلح شہریوں کے خلاف فوجی کارروائی نہیں تھا۔

اس پورے عمل کے دوران انتہائی منظم مسلح مزاحمت کی گئی ہمیں اس بات کا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ بنگالی فوجی بغاوت کر رہے تھے جس کا نتیجہ افرادی قوت اور اسلحہ و گولہ بارود کے نقصان کی صورت میں سامنے آنا تھا اور یہی اسلحہ بعد میں پاک فوج کے خلاف استعمال ہونا تھا۔ اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ گولہ بارود بہت پہلے اس وقت اکٹھا کیا گیا تھا جب حکومت نے اس سلسلے میں کسی خاص پابندی کا اہتمام نہیں کر رکھا تھا اور اس دوران بھارت خفیہ طریقوں سے اسلحہ سپلائی کرتا رہا تھا۔ تاہم مئی کے آغاز میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا تھا کہ پاک فوج نے کم از کم تمام ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز اور بڑے قصبوں کو باغیوں سے پاک کر دیا تھا۔ صوبے کی تمام سڑکوں ریلوے لائنوں اور آبی راستوں سمیت ذرائع رسل و رسائل کو بحال کر دیا گیا تھا۔ بھارت کی طرف سے دراندازی کے واقعات اگرچہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے تاہم انہیں بڑی حد تک کنٹرول کر لیا گیا تھا۔ اس وقت تک بھارت سے آنے والے اہم راستوں کو بند کرنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی جس کا مقصد دراندازی کو کم سے کم سطح پر لانا تھا۔ لیکن اسے مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ مئی کے اختتام تک یہ کہا جا سکتا تھا کہ صوبے پر بڑی حد تک کنٹرول حاصل کر لیا گیا ہے؛ تاہم ایسا نہیں تھا کہ زمانہ امن جیسی صورتحال پیدا ہو گئی تھی جس میں حکومت کو مکمل کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ سخت گیر اقدامات کی بدولت فوج بڑی حد تک اپنا حکم منوانے کے قابل ہو گئی تھی۔

مکتی باہنی میدان میں آ گئی

13 ..... 25 مارچ 1971ء کے فوجی ایکشن سے پہلے بھارتی مداخلت باغیوں کو سرحد پار سے اسلحہ اور گولہ بارود کی صورت میں مدد فراہم کرنے تک محدود تھی۔ یقیناً اس کی بدولت باغی سڑکوں، ریلوے لائن اور پلوں کو تباہ کر کے ذرائع رسل و رسائل میں خلل ڈالنے میں کامیاب رہے تھے۔ پھر مکتی باہنی وجود میں آئی اور انہیں بھارت کی مکمل حمایت اور مدد حاصل رہی۔ انہوں نے نہ صرف مکتی باہنی کے گوریلوں کو اپنی سرزمین پر تربیت دی بلکہ انہیں مسلح کر کے سرحد پار بھیجنے کا بھی بندوبست کیا جنہوں نے یہاں آ کر معمول کی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ

دیا۔ جولائی کے مہینے میں مشرقی پاکستان کی سرحد کے پاس کم وبیش 33 ایسے کیمپوں کا سراغ لگایا گیا۔ ہر کیمپ میں 6 سو سے ایک ہزار تک سپاہیوں کو تربیت دی جارہی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ بنگالی جن میں غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی 1971ء کی جنگ کے دوران تربیت حاصل کرکے مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے۔

باغیوں کے تربیتی مراکز ہماری سرحدوں کے اندر قائم کر دیئے گئے

14..... فوجی ایکشن کے بعد بھارت نے باغیوں کی مدد میں اضافہ کر دیا اور اس معاملے میں اس کی مداخلت نے نئی جہتیں اختیار کرنا شروع کر دیں۔ باغیوں کے تربیتی مراکز ہماری سرحد کے اندر قائم کر دیئے گئے۔ مثال کے طور پر 157 گوریلوں نے تیلیاں پاڑہ (بی ایم 5273) میں قائم اسکول سے تربیت حاصل کی ایسے اسکولوں کے انسٹرکٹر (تربیت دینے والے) صبح سرحد پار کر کے آتے تھے اور شام کو واپس چلے جاتے تھے۔ اسکول کے لئے رسل و رسائل کا بندوبست بھارت کرتا تھا۔ اسلحہ اور گولہ بارود ذخیرہ کرنے کے لئے بانس کے جھونپڑوں کے نیچے وسیع بنکر بنائے جاتے تھے۔ اتفاق سے تیلیاپاڑہ کرنل عثمانی کا آبائی گاؤں بھی تھا۔

لوٹ مار کے 30 کروڑ بھارت پہنچا دیئے

15..... اپریل سے بھارت نے چھوٹے پیمانے پر سرحدی حملوں کا آغاز کر دیا مثال کے طور پر 10 اپریل 1971ء کو بھارتی بارڈر سیکورٹی پولیس کے دو سپاہی پکڑے گئے۔ پوچھ گچھ کے دوران انہوں نے بتایا کہ بھارت کی دو پلاٹونوں نے پاکستانی سرحد سے 4 میل اندر شمال کی طرف دفاعی پوزیشنیں لے رکھی ہیں۔ اپریل کے آخر تک بعض مقامات پر بھارتی مدد کے باعث باغی اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ انہوں نے بڑھ کر پاکستانی چوکیوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ مثال کے طور پر 22 اپریل 1971ء کو انہوں نے نابھارم میں ہماری پوزیشن پر حملہ کیا 24 اور 25 اپریل کو انہوں نے دو جوابی حملے کئے جنہیں پسپا کر دیا گیا۔

16..... باغیوں کو اس رقم نے بھی کافی سہارا دیا جو انہوں نے مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں سے اس وقت لوٹی تھی جب انہیں وہاں کنٹرول حاصل تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس لوٹ مار میں ملنے والا تقریباً 30 کروڑ روپیہ بھارت پہنچایا گیا تھا۔ آپریشن کے نتیجے

میں باغیوں کے جانی نقصان کا اندازہ تقریباً 25 فیصد تھا جبکہ اکثریت سرحد پار کر کے بھارت پہنچی جہاں انہیں بھارتی افواج نے دوبارہ منظم کیا اور تربیت دی۔ مشرقی پاکستان کی سرحد کے ساتھ باغیوں کے مراکز قائم کئے گئے جہاں پر منظم اور مربوط تربیتی نظام قائم تھا اور مسلسل باغیوں کو "مکتی باہنی" میں بھرتی کیا جا رہا تھا۔

17۔ بھارت نے فروری 1971ء کے آخر میں ہی مغربی بنگال میں بڑی فوج جمع کر لی تھی جس کے لئے اس نے یہ بہانہ پیش کیا تھا کہ یہ فوج اس وقت ہونے والے انتخابات کے پیش نظر داخلی امن و امان کے لئے لائی گئی ہے۔ انتخابات مکمل ہو جانے کے بعد بجائے اس کے کہ یہ فوج واپس بھیج دی جاتی بھارت نے مزید فوج مشرقی پاکستان کی سرحد کی طرف بھیجنا شروع کر دی جسے پہاڑی اور پیراشوٹ بریگیڈ لڑاکا اور بمبار طیاروں اور فضائی ٹرانسپورٹ یونٹوں کی مدد حاصل تھی۔ سرحد کے قریبی ہوائی اڈوں پر مزید لڑاکا جہاز تعینات کر دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بارڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) کی مزید بٹالینیں لا کر یہاں ان کی تعداد 25 کر دی گئی تھی۔

علیحدگی پسندوں کو بھارتی حمایت حاصل تھی

18۔ مارچ 1971ء کے دوران بھارت کی اہم حکومتی شخصیات کی طرف سے ایسے سیاسی بیانات سامنے آ رہے تھے جن میں "بنگلہ دیش" نام کے ملک اور باغی بنگالیوں کی مکمل مدد اور حمایت کا کھلم کھلا اظہار کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر مغربی بنگال کے نائب وزیر اعلیٰ نے کہا۔ "ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرتے ہیں حالانکہ ابھی مرکزی حکومت نے ایسا نہیں کیا" بھارت کی پارلیمنٹ کے ایوانوں نے 30 مارچ 1971ء کو ایک قرارداد منظور کی جس میں بنگلہ دیش کو تو تسلیم نہیں کیا گیا تاہم علیحدگی پسندوں کو یقین دلایا گیا کہ انہیں جدوجہد میں بھارتی عوام کی مکمل تائید و حمایت حاصل رہے گی۔ اس طرح کے بہت سے بیان بطور حوالہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کہنا کافی ہے کہ بھارت نے بنگلہ دیش کی کھلم کھلا حمایت فوجی ایکشن کے فوراً بعد شروع کر دی تھی جبکہ کھلی فوج مداخلت کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ جون اور اس کے بعد بھارت نے سرحد پر نسبتاً چھوٹے حملے کئے۔ ایسے حملوں سے بھارت کا مقصد ایک تو پاکستانی فوج کو ہراساں کرنا تھا جبکہ دوسرا زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ پاک فوج کو مکمل طور پر سرحد پر مصروف رکھا جائے تاکہ باغیوں کو

اندرونی علاقوں میں کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا موقع میسر آ سکے۔ مثال کے طور پر 16 جون کو بھارتی فوج نے بیناپول کے پاکستانی علاقے پر مشین گنوں سے فائرنگ کی اور گولے برسائے۔ 17 جون کو بھی فائرنگ کے بہت سے واقعات ہوئے جس میں کمال پور کی اگلی چوکی پر دو مرتبہ فائرنگ کا واقعہ بھی شامل ہے جس میں ہمارے دو جوان شہید اور متعدد زخمی ہو گئے تھے۔ 21 جون کو بھی بھارت نے مختلف سرحدی علاقوں پر فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ 3 جولائی کو بھارتی طیاروں نے تیتولیا میں امیر خانہ کے علاقے میں گولیاں برسائیں۔ 2 سے 5 اگست تک بھارتی دستوں نے باغیوں کے ساتھ مل کر ضلع رنگ پور کے علاقے بھورنگا باڑی پر حملہ کیا۔

اس طرح کے واقعات جاری رہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے تسلسل اور شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ستمبر 1971ء تک بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحد کے ساتھ اپنی باقاعدہ فوج کی صف بندی مکمل کر لی تھی۔

20۔ اکتوبر کے دوران اور نومبر کے وسط میں بھارت نے اپنی کارروائیوں کو مزید وسعت دی۔ اب تک بھارتی کارروائیاں پاکستانی علاقوں پر گولہ باری اور نسبتاً چھوٹی نوعیت کی سرحدی جھڑپوں تک محدود تھیں یا پھر بھارتی ہماری اگلی چوکیوں پر "مارو اور بھاگ جاؤ" طرز کے حملے کرتے تھے لیکن اوپر بیان کئے گئے عرصے کے دوران بھارت نے باقاعدہ حملہ کر کے ان پاکستانی علاقوں پر قبضہ کر لیا جن پر وہ کھلی جنگ کے بغیر قبضہ کر سکتا تھا۔ ان علاقوں میں (ضلع دیناج پور) کا تیتولیا (ضلع فینی) میں بیلونیا نصف شمالی حصہ اور رنگامتی ضلع کا سولا ٹنگ کمل شامل ہیں۔ 31 اکتوبر کو انہوں نے سلہٹ میں دھالاج کے علاقے پر بھی حملہ کیا۔ ان ابتدائی حملوں کے بعد بھارت باقاعدہ فوج کے ساتھ متعدد علاقوں میں بڑے حملوں کے لئے تیار تھا جو اس نے 20/21 نومبر 1971ء کو کئے۔

مشرقی پاکستان کے حالات 21 نومبر سے 3 دسمبر تک

1-20 اور 21 نومبر کی درمیانی رات بھارت نے جیسور سیکٹر میں ایک بریگیڈ سے حملہ کر دیا جسے فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ بھارت نے اس بڑے حملے کے ساتھ دوسرے سیکٹروں میں نسبتاً کم نفری سے حملے بھی کئے۔ حالانکہ بھارتی حکومت نے یہی دعویٰ کیا کہ حملہ مکتی باہنی نے کیا ہے لیکن فوج کی صف بندی اور لڑائی کی شدت سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بھارت نے پوری قوت سے پاکستان پر جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ بعد ازاں 26 نومبر 1971ء کو پارلیمنٹ میں بھارتی وزیراعظم نے اپنے بیان میں اس بات کو تسلیم کیا کہ 20 نومبر اتوار کے روز بھارتی افواج کو کلکتہ کے شمال میں بویرا کے علاقے میں "اپنے دفاع میں" پاکستانی علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی ہے جس کا مقصد ان پاکستانی افواج کو پیچھے دھکیلنا ہے جن سے مذکورہ علاقوں کو خطرہ لاحق تھا۔ اس حملے میں بھارتی ٹینکوں نے بھی پاکستانی علاقے میں پیش قدمی کی تھی۔

2-اس موقع پر مشرقی پاکستان میں جنگ کی صحیح صورتحال کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں کیونکہ اس مرحلے پر نہ تو جنگ سے متعلق اہم افراد موجود ہیں اور نہ ہی اس سے متعلق ضروری دستاویزات جن میں جنگی ڈائریاں (وار ڈائریز) حتمی احکامات، ہدایات اور کانفرنسوں کے اہم نکات شامل ہیں؛ تاہم وہ معلومات جو مشرقی کمان کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے جنرل ہیڈ کوارٹرز، ہیڈ کوارٹرز چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا ہیڈ کوارٹرز نیشنل سیکورٹی کونسل اور خود صدر پاکستان کو روزانہ دو دفعہ ارسال کی جاتی تھیں ان سے مختلف سیکٹروں میں جنگ کی یہ تصویر سامنے آتی ہے۔

(اے) جیسور سیکٹر

3- یہ سیکٹر سول ڈویژن کھلنا اور ضلع فرید پور پر مشتمل تھا (اس میں دریائے پدما اور میگھنا کے جنوبی اور مغربی علاقے شامل تھے۔

اس علاقے کا دفاع 9 ڈویژن کی ذمہ داری تھی جس کی کمان میجر جنرل محمد حسین انصاری کر رہے تھے۔ 20 نومبر 1971ء کو میجر جنرل انصاری کے زیر کمان مندرجہ ذیل فوجی نفری تھی۔

(ا) 57 بریگیڈ: ذمہ داری کا علاقہ میر پور، درسنا، جنیدا، فرید پور۔

(ب) 107 بریگیڈ، ذمہ داری کا علاقہ جیسور، ست کھیرا۔

(ج) 314 (اے) بریگیڈ ایڈہاک ہیڈکوارٹرز جس میں ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (سی اے ایف) کا ایک ونگ شامل تھا اس کی ذمہ داری کھلنا اور اس کے جنوبی علاقے کا دفاع تھا۔

(د) ہیڈکوارٹرز سی اے ایف باریسال کی ذمہ داری اور پٹواکھلی کا داخلی امن و امان۔

(ر) انڈیپنڈنٹ آرمرڈ اسکواڈرن (ایم 124 قسم کے ٹینک)

(ح) سی اے ایف 3 ونگ

آغاز میں اس ڈویژن کا ہیڈکوارٹر جیسور میں تھا جسے 20 نومبر سے کچھ ہی پہلے ماگھورا منتقل کر دیا گیا تھا۔

4- بھارت نے اس سیکٹر میں جس نفری سے حملہ کیا اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) ہیڈکوارٹرز 2 کور کرشن نگر

(ب) 4 ماؤنٹین ڈویژن (3 بریگیڈز) پلاسی برہم پور کا علاقہ۔

(ج) 9 انفنٹری ڈویژن (3 بریگیڈز) راناگھاٹ، بونگن کا علاقہ۔

(د) 50 پیرا بریگیڈ گروپ بیرک پور کا علاقہ۔

(ر) 45 کیولری (پی ٹی۔76 قسم کے ٹینک) 9 ڈویژن کے زیر کمان۔

(ح) بارڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) کی 5 بٹالینیں۔

اس سیکٹر میں بھارتی حملے کا بنیادی مقصد جیسور پر قبضہ کرنا تھا۔ حملہ شمالی سمت سے چوگاچا کی جانب سے کیا گیا۔ یہ حملہ بھارت کے 9 ڈویژن کے 350 بریگیڈ نے کیا جسے ٹینکوں

کے ایک اسکواڈرن اور بھارتی فضائیہ کے ایک اسکواڈرن کی مدد حاصل تھی۔ حملے سے پہلے ہی ہماری سرحدی پوزیشنوں پر شدید گولہ باری کی گئی جس کی آڑ میں دشمن شہزاد پور، ماشیا اور چارہ باری میں ہماری چوکیوں کو روندتا ہوا آگے نکل گیا۔

دشمن فتح پور پر قبضہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا لیکن چوگاچا اور غریب پور کے بالکل سامنے دریائے کوباڈک کے کنارے پر پہنچ کر اس کی پیش قدمی رک گئی تاہم دشمن نے دوبارہ منظم ہو کر چوگاچا پر حملہ کیا اور 21 نومبر کو پاک فوج کی طرف سے چوگاچا خالی کر دینے کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔ دشمن کی پیش قدمی کو بالآخر ارفا لائن پر روک دیا گیا۔ اس لڑائی میں دونوں طرف سے خاصے ٹینک تباہ ہوئے لیکن یہ بات مشاہدے میں آئی کہ پاکستانی ایم 124 ٹینک بھارت کے پی ٹی 7 کے مقابلے میں بہت کمتر ہیں۔ بھارتی ٹینکوں میں نصب توپ اور ان کی پینترا بدلنے اور حرکت کرنے کی صلاحیت ہمارے ٹینکوں سے بدرجہا بہتر تھی۔ ہمارے تین انڈیپنڈنٹ اسکواڈرن اس لڑائی میں بری طرح سے پٹ گئے اور اگلی ایک دو لڑائیوں میں اس قدر نقصان ہوا کہ یہ ایک مکمل لڑاکا یونٹ کی حیثیت میں لڑنے کے قابل نہ رہے۔ فضائی لڑائی میں بھی 22 نومبر 1971ء کو ہمارے دو F-86 طیارے تباہ ہوئے جبکہ بھارت کو ایک طیارے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

ہمارے 9 ڈویژن کے ہیڈکوارٹر ماگھورا پر بھی 21 نومبر کو بھارتی فضائیہ نے حملہ کیا۔

6۔ اگلے دن یعنی 22 نومبر کو سارا دن بھارتی توپ خانہ جیسور چھاؤنی اور ائیر فیلڈ پر گولہ باری کرتا رہا جس کے نتیجے میں فضائی ٹریفک روکنا پڑی۔ 23 نومبر کو بھارت نے بیناپول پوسٹ پر ایک اور حملہ کیا لیکن اسے پسپا کر دیا گیا تاہم دشمن 26 نومبر کو جیبن نگر پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا اور 2 دسمبر کو مکتی باہنی کے ساتھ درسنا میں گھس آیا 4 دسمبر کو دشمن درسنا پر قابض ہو گیا۔ مہر پور جو 22 نومبر سے دشمن کے حملوں کی زد پر تھا 8 دسمبر کو سرنگوں ہوا۔

7۔ 23 نومبر کو کرسو۔ وہ لیڈو نامی ایک یونانی بحری جہاز دریائے پسر میں بھارتی غوطہ خوروں کی بچھائی ہوئی بارودی سرنگ سے ٹکرا کر غرق ہو گیا۔

(بی) بوگرا۔ رنگ پور سیکٹر

8- اس سیکٹر میں دریائے جمنا کے مغرب اور دریائے پدما کے شمال میں واقع سول

ڈویژن راجشاہی شامل تھا۔ اس سیکٹر کے دفاع کی ذمہ داری 16 ڈویژن پر تھی جسے میجر جنرل نذر حسین شاہ کمان کر رہے تھے اور اس کا ہیڈکوارٹر نیٹور میں تھا۔

اس ڈویژن کی فوجی قوت کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) 23 بریگیڈ:۔ ذمہ داری کا علاقہ دیناج پور رنگ پور لال منیر ہاٹ ٹھاکر گاؤں۔

(ب) 205 بریگیڈ:۔ ذمہ داری کا علاقہ ہلی بوگرا سیدپور۔

(ج) 34 بریگیڈ:۔ ذمہ داری کا علاقہ راجشاہی پبنہ سراج گنج

(د) 29 کیولری (ایم۔124 قسم کے ٹینک) رنگ پور میں تعینات۔

(ر) سول آرمڈ فورس کا 5 واں ونگ (ای پی سی اے ایف)

9-اس ڈویژن کے مقابلہ دشمن کی قوت کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) ہیڈکوارٹر 33 کور (سلی گری)

(ب) 20 ماؤنٹین ڈویژن (3 بریگیڈ) علاقہ بلورگھاٹ رائے گنج اسلام پور۔

(ج) 6 ماؤنٹین ڈویژن (3 بریگیڈ) علاقہ جل پائی گوری۔

(د) 304 انڈیپنڈنٹ ماؤنٹین بریگیڈ علاقہ بلورگھاٹ۔

(ر) 71 بریگیڈ (سابقہ 8 ماؤنٹین بریگیڈ) علاقہ کوچ بہار

(ح) 63 کیولری (پی ٹی۔76 قسم کے ٹینک) علاقہ جل پائی گوری۔

(خ) 691۔ کیولری (پی ٹی۔76 قسم کے ٹینک) علاقہ رائے گنج

(ص) بارڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) کی 9 ویں بٹالین۔

10-اس سیکٹر میں بھارت نے اپنے دو طرفہ حملے کا آغاز 20 نومبر کو کیا۔ اس حملے کو بھی توپ خانے کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ دشمن رنگ پور ڈسٹرکٹ میں دریائے تیستہ کے مشرق میں واقع بھورنگاماری کے دفاعی حصار کے اندر تک گھس آیا۔ دشمن نے آگے بڑھ کر ناگا شوری تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا جہاں پاک فوج نے اس کی پیش قدمی روک دی؛ تاہم دشمن نے ناگا شوری پر اپنا دباؤ جاری رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دشمن لال منیر ہاٹ پر قابض ہونا چاہتا ہے جہاں ایک ائیر فیلڈ موجود تھا۔ دشمن کی ایک اور بٹالین تیتو لے کی طرف سے گڑھ میں ہماری پوزیشن پر حملہ آور ہوئی۔ دراصل یہ دونوں حملے اصل حملے سے ہماری توجہ ہٹانے کے لئے کئے گئے جو 24 نومبر کو ایک پورے بریگیڈ گروپ کی قوت کے ساتھ ہلی کے علاقے میں کیا گیا اس

حملہ آور بریگیڈ کو ایک اسکواڈرن ٹینکوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ اس حملے سے پہلے بھی ہماری پوزیشنوں پر توپ خانے اور فضائیہ کی مدد سے شدید گولہ باری کی گئی۔ آغاز میں دشمن کچھ علاقہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن آخرکار پاک فوج کے 205 بریگیڈ کی زبردست مزاحمت کے باعث پیش قدمی رک گئی۔ بڑا حملہ رک جانے کے بعد دشمن نے چپی گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ (27 نومبر کو اس علاقے میں ہونے والی لڑائی میں 7 مرہٹہ بٹالین کے 300 افسر اور جوان مارے گئے تھے) اس کے بعد دشمن نے ٹھاکر گاؤں کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور 4 دسمبر 1971ء کو اس پر قبضہ کر لیا۔

(س) مومن شاہی ...ڈھاکہ سیکٹر

11-یہ سیکٹر جمنا اور میگھنا کے درمیان واقع مومن شاہی ٹنگائل اور ڈھاکہ کے اضلاع پر مشتمل تھا۔ اس کے دفاع کی ذمہ داری 36 (اے) ایڈہاک ڈویژن پر عائد ہوتی تھی اس ڈویژن میں زیادہ تر ای پی سی اے ایف کے یونٹ تھے جبکہ ریگولر فوج کی قلیل تعداد بھی اس ڈویژن میں شامل تھی ڈویژن کی کمان ڈائریکٹر جنرل ای پی سی ای ایف میجر جنرل محمد جمشید کے پاس تھی۔ ڈویژن میں شامل یونٹوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) ہیڈکوارٹرز 36 (اے) ڈویژن۔ مقام (ہیڈکوارٹرز ای پی سی اے ایف) ڈھاکہ۔

(ب) 53 بریگیڈ (3 بٹالینیں) 20 نومبر تک ڈھاکہ میں رہا (بعد ازاں اسے فینی بھیج دیا گیا)

(ج) 93 (اے) بریگیڈ (2 بٹالینیں) علاقہ مومن شاہی جمال پور۔

(د) سی اے ایف کے 6 ونگ (ان میں ای پی سی اے آر کے 3 اور ویسٹ پاکستان رینجرز کے 3 ونگ شامل تھے۔

12-اس کے مقابل اس علاقہ میں بھارتی دستوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) 95 بریگیڈ سابقہ 8 ڈویژن۔

(ب) 63 بریگیڈ (سابقہ 7 ڈویژن)

(ج) بی ایس ایف کی 2 بٹالینیں مومن شاہی ڈسٹرکٹ کے مقابل گارو کی پہاڑیوں میں تعینات۔

13- ضلع ڈھاکہ میں تنگائل مدھو پور کے جنگل اور منشی گنج سب ڈویژن مکتی باہنی کے مضبوط ٹھکانے تھے اور ان علاقوں میں مکتی باہنی کے دہشت گردوں کی تعداد 20 نومبر کے بعد تیزی سے بڑھی تھی انہوں نے سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے بہت سے پل اڑا دیئے تھے اور کئی پولیس اسٹیشنوں پر حملے کئے تھے۔

14-21 نومبر کو دشمن کے ایک بریگیڈ نے بڑی تعداد میں مکتی باہنی کے گوریلوں کی ... کے ذریعہ میں ہماری سرحدی چوکی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ پسپا کر دیا گیا بھارت نے 22 نومبر کو پھر حملہ کیا لیکن اس کا بھی وہی انجام ہوا اس کے بعد دشمن نے 29 نومبر کو کمال پور کی پوسٹ پر حملہ کیا اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ ڈھاکہ سے اس پوسٹ پر کمک پہنچی اور اس نے دشمن کا گھیرا توڑ کر پوسٹ پر موجود نفری کو نکالا تاہم دشمن نے یہاں دباؤ برقرار رکھا اور 4 دسمبر کو اس پر قبضہ کر لیا۔ اس علاقے میں ای پی سی ایف میں شامل بڑی تعداد میں بنگالی سپاہی اور افسر بھاگ کر دشمن کے ساتھ مل گئے۔

(ڈی) سلہٹ ... کومیلا سیکٹر

16- اس سیکٹر کے دفاع کی ذمہ داری 14 ڈویژن پر تھی جس کی کمان میجر جنرل قاضی عبدالمجید کر رہے تھے۔ ڈویژن میں درج ذیل فوجی یونٹ شامل تھے۔

(ا) ہیڈ کوارٹرز 14 ڈویژن (اس ڈویژن کا مین ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں جبکہ ٹیکنیکل ہیڈ کوارٹرز بھیراب بازار میں تھا۔

(ب) 27 بریگیڈ' علاقہ' کاھورا' برہمن باڑیا

(ج) 117 بریگیڈ ... علاقہ کومیلا

(د) 313 بریگیڈ' علاقہ مولوی بازار شمشیر نگر (سلہٹ کے جنوب میں)

(ر) 202 (اے) بریگیڈ (یہ ایڈہاک فارمیشن تھیں) علاقہ ذکی گنج۔ طاہر پور (سلہٹ کے شمال میں)

(ح) سی اے ایف کے 7 ونگ (ای پی سی ایف کے 3 ونگ' فرنٹیئر کور کے 3 ونگ اور ویسٹ پاکستان رینجرز کا ایک ونگ شامل تھا۔)

17- اس کے مقابل دشمن کے دستوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) ہیڈ کوارٹرز 4 کور اگرتلہ۔

(ب) 8 ڈویژن (3 بریگیڈ) علاقہ کریم گنج دھرم نگر۔

(ج) 56 ڈویژن (3 بریگیڈ ایک آرمرز اسکواڈرن) علاقہ اگرتلہ خودائی رادھاپور

(د) بی ایس ایف کی 18 بٹالینیں (ان میں سے کچھ 23 ڈویژن کو بھیج دی گئی تھیں)

(ر) 2 اور 5 ماؤنٹین ڈویژنوں سے توپ خانے کی اضافی یونٹیں منگوا کر انہیں بھارت چین سرحد پر تعینات کیا گیا تھا۔

(18) بھارت نے دکی گنج اور اٹھ گرام پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔

اگلے روز دشمن نے برہمن باڑیا اور کومیلا کی سرحدی چوکیوں پر ہماری پوزیشنوں اور قوت کا اندازہ لگانے کے لئے چھوٹے چھوٹے حملے کیے ان حملوں کو نہ صرف پسپا کر دیا گیا بلکہ چندر پور کی چوکی کو بھارتی قبضے سے چھڑا لیا گیا۔ شمال کی طرف سے دشمن نے رادھانگر طاہر پور کی طرف پیش قدمی کی اور 28 نومبر کو ان علاقوں پر قابض ہو گیا اس کے بعد دشمن نے 30 نومبر کو سلہٹ کے جنوب کی طرف سے شمشیر نگر پر حملہ کیا اور یکم دسمبر کو اس پر قبضہ کر لیا۔ دشمن نے سلہٹ پر شمالی اور جنوب کی جانب سے دوطرفہ حملہ جاری رکھا بھارت کے 56 ڈویژن نے یکم اور 2 دسمبر 1971ء کی درمیانی رات برہمن باڑیا پر بھی دوطرفہ حملہ کیا اور سلہٹ کومیلا کو ملانے والی ریلوے لائن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

(ای) فینی ...... چٹاگانگ سیکٹر

19- وسیع پہاڑی علاقے پر مشتمل اس سیکٹر کے دفاع کی ذمہ داری 35 بریگیڈ اور 19 (اے) بریگیڈ پر تھی لیکن 20 نومبر کے بعد ان دو سب سیکٹروں کو ملا کر ایک ہی ایڈہاک کوارٹرز کے تحت کر دیا گیا جسے 39 (اے) ڈویژن کا نام دیا گیا اس کی کمان میجر جنرل ایم رحیم خان کر رہے تھے اور ان کے زیر کمان درج ذیل فوجی قوت تھی۔

1- ریگولر بریگیڈز دو تھے۔

(ا) 53 بریگیڈ' علاقہ فینی' بلکشم سیکٹر

(ب) 117 بریگیڈ مع ایک پرانے ایم 124 ٹینک' علاقہ کومیلا سیکٹر۔

2- ایڈہاک بریگیڈز

(ا) 97 ایڈہاک بریگیڈ' علاقہ' چٹاگانگ اور اس کے پہاڑی علاقے

(ب) 91 ایڈہاک بریگیڈ علاقہ' دھم گھاٹ' فینی چٹاگانگ رام گڑھ چٹاگانگ'

(دریائے فینی کے ساتھ ساتھ) کے علاقے اس میں شامل تھے۔

3-توپ خانہ

دو فیلڈ بیٹریاں ایک مارٹر بیٹری جسے کئی ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

20-اس علاقے میں بھارت کا 23 ڈویژن (3 بریگیڈ) پاک فوج کے مقابل تھا جو 4 کور کے زیر کمان تھا اسے کور ریزرو سے اضافی توپ خانے کی مدد بھی حاصل تھی اس کے علاوہ بی ایس ایف کی بہت سی بٹالینیں بھی اس کے زیر کمان تھیں۔

مکتی باہنی کی مدد سے حملے

21-بھارتی 23 ڈویژن کے زیر کمان افواج نے نومبر کے آغاز میں نوا کھلی میں بلونیا کے دفاعی حصار کے شمالی حصے پر قبضہ کر لیا تھا جس کے باعث چٹا گانگ اور صوبے کے دیگر علاقوں کے درمیان مواصلات خطرے میں تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر ڈھاکہ سے 53 بریگیڈ یہاں بھیجا گیا لیکن دشمن نے فینی اور رام گڑھ پر اپنا دباؤ برقرار رکھا اور 20 نومبر 1971ء کو ایک بریگیڈ کی نفری چٹا گانگ کے پہاڑی علاقے میں کیسالونگ کھل کے ساتھ ساتھ رنگامتی کی طرف حملہ کیا حالانکہ بھارتی پیش قدمی کے راستے میں ہماری جانب سے کوئی خاص مزاحمت موجود نہ تھی؛ تاہم کپتائی جھیل کے قریب پہنچ کر بھارتی پیش قدمی اچانک رک گئی۔

22-اس عرصے کے دوران بھارت کا بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی علاقے کے ایک حصے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تا کہ وہاں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دی جائے جو اس وقت کلکتہ میں قائم تھی۔ بھارت نے اپنی فوجی مہم میں جیسور رنگ پور کو خاص اہمیت دی جہاں ٹینک اور فضائیہ کو بھی استعمال کیا گیا۔ پچا گڑھ اور ٹھاکر گاؤں کے علاقے میں دشمن انتہائی کامیابی سے دس میل سے بھی زیادہ اندر گھس آیا۔ اس وقت تک پاک فوج کے دفاع میں یہ سب سے گہرا گھاؤ تھا زیادہ تر حملے بھارت کی ریگولر فوج نے مکتی باہنی کی مدد سے کئے۔ دشمن کی نقل و حرکت تمام سرحد پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ تمام سیکٹروں میں پیش قدمی کرنے پر تلا ہوا تھا۔

23-بھارت کی اس نقل و حرکت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے پاس موجود تمام عسکری قوت کو اس کی ریزرو فورس سمیت سرحد پر مصروف کر دیا جائے تا کہ وہ کہیں غیر معمولی مزاحمت کے قابل نہ رہے ایسٹرن کمان کے زیر کمان تمام افواج مشرقی پاکستان کی سرحد پر پھیلی

ہوئی تھیں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی یہ فوج سرحد پر اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ ان کے پاس یہ موقع بھی نہ تھا کہ پسپا ہو کر مشرقی پاکستان کے دریاؤں کو قدرتی رکاوٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے دشمن کے خلاف نسبتاً چھوٹی لائن آف ڈیفنس (دفاعی لائن) ترتیب دے لیتے۔

24-بھارت کی طرف سے اکیلے مشرقی پاکستان یا مغربی اور مشرقی دونوں حصوں پر ایک ساتھ حملے کے قوی امکان کو جی ایچ کیو محسوس کر چکا تھا اور ایسٹرن کمان کو اس سلسلے میں آپریشنل ہدایات دی جا چکی تھیں۔ ہدایات کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ دشمن کی طرف سے امکانی اور خطرناک ترین عسکری حکمت عملی یہ ہوگی کہ وہ بڑا حملہ بوگرا ایکٹر میں ہلی گیبدا کے تنگ راستے پر کرے گا جس کا مقصد بوگرا پر قبضہ ہوگا۔ یہ بات بھی سوچی گئی کہ دشمن اس کے بجائے بھیراب پل، داؤدکنڈی، چاند پور کے علاقے میں متبادل حملہ بھی کر سکتا ہے۔ ان امکانی صورتوں سے نمٹنے کے لئے مشرقی کمان نے جو عسکری حکمت عملی وضع کی اس کے نکات درج ذیل ہیں۔

(ا) کلیدی دفاع۔ نقل و حرکت جمنا اور پدما کے مغربی علاقے میں کی جائے گی۔

(ب) جارحانہ دفاعی حکمت عملی اختیار کی جائے گی۔

(ج) بھارت کی طرف سے حملوں کے آغاز پر فوری جوابی حملے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ دشمن کی پہل کاری کا توڑ کیا جا سکے اس مقصد کے لئے درکار خصوصی ٹاسک فورسز بنائی جانی تھیں جن میں سے ایک میمن سنگھ، جمال پور کے علاقے میں جبکہ دوسری مولوی بازار میں رکھی جانی تھی اور جنگ کی صورت میں ان ٹاسک فورسز کا کام دشمن پر جوابی وار کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کرنا تھا۔

(د) دفاعی اور جارحانہ کارروائیوں کے لئے انتہائی مضبوط سریع الحرکت (موبائل) ریزرو کا قیام۔

(ر) مجاہدین پولیس اور رضا کاروں کے ذریعے تمام ذرائع رسل و رسائل اور اہم تنصیبات کی حفاظت اور اندرونی علاقوں میں امن و امان کا قیام۔

(ح) ہر سیکٹر کو اس قابل بنانا کہ وہ کم از کم 30 دن تک مقابلہ کر سکے۔

25-یہ بات انتہائی اہم ہے کہ مشرقی کمان کی اس منصوبہ بندی میں 15 جولائی 1971ء کو جی ایچ کیو کی طرف سے جاری کردہ آپریشنل ہدایات کی روشنی میں کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنایا گیا جس میں پسپائی اختیار کر کے "ہر قیمت پر ڈھاکہ کا دفاع" کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

ہماری فوجی حکمت عملی میں ایک بڑا خلا

26۔ جی ایچ کیو راولپنڈی نے بھی کوئی ایسا منصوبہ بنا کر نہیں دیا جس میں ڈھاکہ کے دفاع کے لئے پسپائی اختیار کرنے کی چال بیان کی گئی ہو۔ پوری جنگ کے دوران پاکستان کی جانب سے یہی عسکری نظریہ ابھر کر سامنے آتا ہے کہ پاک فوج بھارت کو مشرقی پاکستان کے کسی علاقے پر قبضہ کرنے وہاں نام نہاد بنگلہ دیش کی حکومت قائم کرنے سے روکنے کی جدوجہد میں مصروف رہی۔ جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری فوجی حکمت عملی میں ایک بڑا خلا تھا جس کا خمیازہ ہمیں ہتھیار ڈال کر بھگتنا پڑا حالانکہ مشرقی پاکستان میں ہماری افواج ابھی لڑنے کے قابل تھیں۔ 3 سے 8 دسمبر کے دوران جب منصوبے میں تبدیلی لائی گئی اور مشرقی کمان کو مسلسل سگنلز کے ذریعے بتایا گیا کہ ہر قیمت پر ڈھاکہ کا دفاع کیا جائے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور یہ ممکن نہ رہا تھا کہ فوج پیچھے ہٹ کر اپنے آپ کو دوبارہ منظم کر کے ڈھاکہ کا دفاع کر سکے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ

بنگالیوں کا احساسِ محرومی • سقوط ڈھاکا کی دستاویزات • مجیب الرحمٰن کے چھ نکات • حمود الرحمٰن کمیشن کا قیام • حکمرانوں اور سیاستدانوں کے حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے بیانات • ڈھاکہ میں آخری کمشنر کا انٹرویو • حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پر جرنیلوں کا ردعمل • بھٹو کا موقف • اسلامی تاریخ کا بدترین المیہ • یحییٰ خان کا خفیہ سیاسی مشیر • شکست کے ذمہ دار کون؟ • چھ نکات کا تخلیق کنندہ کون تھا؟ • ایوان صدر چکلہ بن گیا تھا • کمیشن کا پہلا اجلاس • برطانوی سامراج کی شازشیں • ملکی دولت 22 خاندانوں میں • ہوس ناکی کی داستانیں • شراب اور عورتیں شکست کا فوجی پہلو ہماری فوجی حکمت میں ایک بڑا خلا • مشرقی پاکستان کا جنگی احوال • ہتھیار ڈالنے کا مشورہ • جنرل نیازی نے سنہری موقع کھو دیا • ناقص قیادت، غلط معلومات • پاکستان ایئر فورس کے حملہ مشن کی تفصیلات • جنرل کا قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح تینوں فوجوں کے درمیان منصوبہ بندی کا فقدان • فوج کی اعلیٰ کمان کی غلط فہمی • شکست کے اخلاقی پہلو • امریکی حکومت کا رویہ • جرنیلوں کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے • یحییٰ خاں کی ہٹ دھرمی • مشرقی پاکستان کے خلاف دشمن کی استعداد کا اندازہ۔

Rs:1600

37۔مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور، پاکستان
فون: 042-7239138-8460196
Email: m_d7868@yahoo.com